دیوانِ ذوق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیوانِ ذوق

یعنی

ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمہ کا کلام

جسقدر بہم پہنچ سکا اور دیباچہ میں سوانح عمری

مؤلفہ

شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

حسب فرمایش

بنتِ آغا محمد ابراہیم صاحب مرحوم منصف لاہور

علیمی پرنٹنگ ورکس دہلی میں زیور طبع سے مزین ہوا

سنہ ۱۹۳۳ع

۱۳۵۱ھ

لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلہ کے شوقین نوجوان دلوں کے اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہلوا لے جاتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرتا تھا دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے ایک دن

پہلے دو شعر

خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں ایک نعت میں اُس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھکر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اُس کا مزا اب تک نہیں بھولتا۔ اُنھیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا غرض اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے۔ اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

ابتدائی

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن۔ ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں وکیل سلطانی کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے ان کا ذہن بھی تیزی اور براقی میں لاجواب تھا اُنھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لئے اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔

بقیہ لکھا ہوا تھا یہ اس مہ جبیں کے پردہ پر — نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردہ پر
کرنہ لکِ مژگاں چشم ستمگر آکے جگر میں گھوپ چلی — آہ کی ہمدم ساتھ ادھر سے جنگ کو اپنے دھوپ چلی
وعدہ کیا تھا شام کا مجھ سے شوق جنھوں نے کل دن کو — آج وہ آئے پاس ہمارے جب ڈیڑھ پہر کی توپ چلی
فاقے مست عدو سے بد ایسا ہی جھپٹی کا رچا ہے — نانی جس کی آنی چھٹی میں حوم سے لے کر گئی کھچڑی
شیخ بگھارے شیخی اپنی مفت کے لقمے کھاتا ہے — دو وہ ملیدا کھاتے ہیں یا مست قلندر گھی کھچڑی

شاہ نصیر مرحوم کی شاگردی

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی شیخ مرحوم نے پوچھا۔ یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ اُنہیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے +

اسے عطائے الٰہی کہنا چاہیے کہ جوں جوں عمر بڑھتی گئی علم کا شوق بڑھتا گیا یہاں عبدالرزاق ایک فاضل اُسی محلہ میں صاحب تدریس تھے۔ ان کے درس میں جاکر شامل ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک اُستاد کے دامن شفقت میں پلتی رہی۔ نیکی کی بنیاد ہمیشہ استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کا رابطہ اخیر دم تک قایم رہا۔ یہ بات اب سگے بھائیوں کو نصیب نہیں ہوتی +

سلسلۂ اصلاح جاری تھے۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازی کے پر لگاتی تھی کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھکر بے اصلاح پھیر دیا۔ اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہدیا کہ یہ کچھ نہیں پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ اِدھر اِنہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ کبھی بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے جو براتی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں تو اردے سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے انھیں زیادہ رنج ہوا +

منیر مرحوم کو جس قدر دعوے تھے اُس سے زیادہ طبیعت میں نوجوانی کے زور بھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اُس زمین میں کون قدم رکھ سکتا ہے۔ مشکل مشکل طرحیں کرتے تھے اور کہتے تھے کون پہلوان ہے جو اِس نال کو اُٹھا سکے۔ غرض کہ اُن سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی

اور مباحثے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل پر جو معرکہ ہوا ردیف ی میں درج ہے دیکھو ع

یہاں سے کے آنے کا مقرر قاصد اوہ دن کرے

اگرچہ لوازماتِ شاعری جو ایک ہونہار سخنور کے لئے چاہئیں سب ان کی طبیعت میں جمع تھے لیکن ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا۔ نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل و قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوشِ نقشِ پا۔ آغوشِ نقشِ پا۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینکدی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے؟ اب تو مرزا رفیع سے بھی اُونچا اُڑنے لگا۔ یہ وہاں سے چپکے چلے آئے۔ اُن دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے نکالا مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے۔ احتیاط شرط ہے۔ قریب شام کے افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک جا پہنچے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی حوض پر آئے۔ وہاں میر کلّو حقیر بیٹھے تھے۔ چونکہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے میر صاحب نے انھیں پاس بٹھایا اور کہا کیوں میاں ابراہیم آج مکدر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا اُنھوں نے بیان کیا۔ میر صاحب نے کہا بھلا وہ غزلیں ہمیں تو سناؤ! انھوں نے وہی غزل سنائی۔ میر صاحب کو اُن کے معاملے پر درد آیا۔ کہا جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارے ذمّہ ہے۔ اور ہاتھ اُٹھا کر دیر تک ان کے لئے دُعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب موصوف کا قد بیمانہ انداز تھا۔ مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی دیکھو ردیف الف میں ع

رکھتا بہر قدم ہے یہ وہ ہوش نقشِ پا

اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ طبیعت

اب گاڑنہ ہوتا ہے

کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑی اور کلام کا چرچا بڑھا۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کرکے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھواکر سنتے غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں

اکبر شاہ بادشاہ تھے اُنھیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابوظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا اس لئے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق میر غالب علی خاں سید۔ عبدالرحمٰن خانِ احسان۔ برھان الدین خانِ زار حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم۔ مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا۔ میر قمر الدین منت اور ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہاں آ کر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سُناتے تھے۔ مطلع اور مصرع طرح میں ڈالتے تھے ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا مصرعہ پر مصرع لگاکر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے۔

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے اُنھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ اُنھیں ایک

میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدے پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شقہ چاہا مرزا مغل بیگ ان دنوں میں ان کے مختار کل تھے۔ اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظر عنایت ہو اُسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقہ سفارش آسان حاصل ہو گیا اور وہ چلے گئے۔

ولیعہد شاگرد ہوتے ہیں

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولی عہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ بھئی میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو! یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آ کر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم اور کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لئے کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا اور ولیعہد کو بجائے ۵ ہزار روپے کے فقط پانچ سو روپے مہینہ ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے للعہ رمہینا بھی ہو گیا۔ اُس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رعب و داب کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولیعہدی کے مقدمہ پر خیال کر کے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔ لیکن ادھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ نہ سمجھنا۔ یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قایم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چنانچہ شیخ مرحوم ولی عہد کے اُستاد ہو گئے۔

نواب الٰہی بخش کا اصلاح دینا

دلی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف ایک عالی خاندان امیر۔ علوم ضروری سے

باخبر اور شاعری کے کہنہ مشاق۔ اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ جہاں متاعِ نیک دیکھتے تھے۔ نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے اُن کا کلام گذرانا تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ اُستادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو اُنھیں اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے دولت فقر کی برکت سے ترک دُنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹۔۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن ایک چوبدار آیا اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفہ سے فارغ ہو کر میں نے دیکھا تو اس میں ایک خوشہ انگور کا تھا۔ چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ سے سُننے کو جی چاہتا ہے۔ اُستاد نے کہا کہ کل تو کام ہے۔ کہدینا کہ پرسوں حاضر ہونگا۔ تیسرے دن تشریف لے گئے وہ بزرگانہ اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوئے معمولی کے شعر کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک غزل شروع کی تھی اس کا مطلع پڑھا ؎

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمھاری زبان سے سُن کر اور لطف حاصل ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنی اُستاد مرحوم کے قدیمی اُستاد اُسی وقت آنکلے۔

نواب اُنھیں دیکھ کر مسکرائے۔ اور شیخ مرحوم نے اُسی طرح اُٹھ کر سلام کیا جو سعادتمند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ ان سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا۔ اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض اُنہوں نے اپنے شعر پڑھنے

شروع کر دئے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی، چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا۔ کان بدمزہ ہوگئے کوئی شعر اپنا سُناتے جاؤ۔ اُستاد مرحوم نے اُنہی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلع اُس کے پڑھے:-

جیتا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا	گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اُس دن سے معمول ہو گیا کہ ہفتہ میں دو دن جاتے۔ اُن سے غزل لے آتے اور اصلاح کی ہوئی دے آتے۔ چنانچہ جو دیوان معروف اب رائج ہے وہ تمام و کمال نہیں کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نواب مرحوم اگرچہ ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے، مگر اس کے حقائق و دقائق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے اُس عالم میں استادِ مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اُن کی فرمایش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی، کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔

فرماتے تھے کہ اپنی مدت شوق میں وہ بھی جرأت کبھی سودا کبھی میر کے انداز میں غزلیں لکھتے رہے مگر اخیر میں کچھ بمقتضائے سن۔ کچھ اس سبب سے کہ صاحبدل اور صاحبِ نسبت تھے۔ خواجہ میر درد کی طرز میں آ گئے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ اُن دنوں میں ہمارا عالم ہی اور تھا۔ جوانی دوانی۔ جرأت کے رنگ میں۔ کبھی سودا کے انداز میں۔ اور وہ رد کرتے۔ آج الٰہی بخش خاں مرحوم ہوتے تو ہم کہہ کر دکھاتے۔ اب اُن کا دیوان ویسا بنا دیتے جیسا اُن کا جی چاہتا تھا۔ اُن کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے۔ اور کہتے۔ ہائے۔ الٰہی بخش خاں۔ اُن کا نام ادب سے لیتے تھے، اور اس طرح ذکر کرتے تھے۔ جیسے کوئی با اعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ اُن کی سیکڑوں باتیں بیان کیا کرتے تھے جو دین دنیا

نواب الٰہی بخش
معروف فن
کامل ماہر

کے کاموں کا دستور العمل ہیں ۔

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا۔ امیر۔ فقیر۔ بچہ۔ بوڑھا اُسے بغیر دیئے نہ رہتے تھے۔ اور دینا بھی وہی کہ جو اُس کے مناسب حال ہو کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔ اِس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھ کر بناتے جاؤ سُناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا مگر اُن کی خوشی اُسی میں دیکھی تو مجبور ہوا اور یہی خوب ہوا ۔

ایک دِن میں اُن کا دو غزلہ بنا رہا تھا۔ اُس کا مقطع تھا ۔

اک غزل پر درد سی معروف لکھ اس طرح میں — ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے — جانور گرنے لگے جائے ثمر اشجار سے

سوداگر آیا اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ اُن میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ وہ پسند آئی خم دَم۔ آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ ع

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

مَیں نے اُسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا۔ بہت خوش ہوئے ۔

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں آج — اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

خیر اور چیزوں کے ساتھ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو ان کے حالات و خیالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت ۲-۳ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب رزیڈنٹ) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آئے۔ باتیں چیتیں ہوئیں جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو اُنہوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا ۔

برگ سبز است تحفۂ درویش — چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اُن کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر

بخش خاں
م کی سخاوت

ار کی
ردانی

سے لیا تھا وہ اُنہیں دیا۔

تسبیح زمرد

اُن کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ایک سو ایک (۱۰۱) مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام **تسبیح زمرد** رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروئی تھی اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہہ کر لگائی تھی۔ جن دنوں اُس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل۔ کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ اُن کے بذل و کرم اور حُسنِ اخلاق اور علوِ رتبہ کے سبب سے اکثر شرفا۔ خصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے۔ اور اشعار سُنتے سُناتے تھے۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھورے خاں **آشفتہ** ایک پُرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور اِن کے مرید تھے صمہ وظیفہ پاتے تھے۔ آشفتہ کے شعر میں ہری چگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا اُن سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا:۔

سو روپیہ کو ایک محاورہ خریدا

آج یہاں کل وہاں۔ گذرے یُوہیں جُگ ہمیں	کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری جُگ ہمیں

آشفتہ کو سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دے دئے کہ تمھاری کاوشِ طبع کیوں خالی جائے۔

فرماتے تھے ایک دن مجھے ایک غزل دی اور کہا کہ میاں ابراہیم یہ غزل ہماری مُدّت سے پڑی ہے۔ دیوان میں درج نہیں کی۔ ردی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مطلع اس کا ہمیں پسند ہے۔ **مطلع**:۔

میں جو لکھنے لگا کچھ یار کے ناخونوں میں	بوسے رکھ چھوڑے ہیں کچھ سار کے ناخونوں میں

اُسی وقت عذر معقول میری سمجھ میں آگیا۔ اور **معروف** اس خوبی سے موزوں ہوا:۔

غلط العام فصیحؐ ہے سخن میں معروف	پھر سخن کیا ہے ان اشعار کے ناخونوں میں

دِلّی میں آبِ حیات کو دیکھ کر بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ ایسا کہنہ مشق صاحبِ کرامت

بزرگ ایک نوجوان شخص کا کیونکر شاگرد ہوا ہوگا۔ اس مضمون کو تم نکال ڈالو میں کیا کہوں کہ اُستاد کی صحبت میں ہفتہ میں کئی دفعہ اُن صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے، وہ غزلوں کے اصل مسوّدے اب تک بھی میرے پاس موجود ہیں۔ دکھاؤں کسے؟

استاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی۔ جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دسویں دن فرماتے۔ بھئی میاں ابراہیم ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ میں نے گوشۂ جانماز اُٹھا کر دیکھا تو حیران ہوا ایک پڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے، میں سمجھ گیا اور لے لئے۔ اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں یہ وہی تمہیں دیتا ہے۔ پھر جب کچھ دیتے تو اسی طرح دیتے۔ یہ گوشۂ جانماز اُٹھاتے اور لے لیتے۔

ایک دفعہ استاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد گئے۔ ضعف تھا اور کچھ کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ مگر نوّاب صاحب حُقّہ پلوائیں تو خالی کیا پلوائیں۔ ایک چاندی کی گُڑگُڑی۔ چلم اور چنبل۔ مغرق نیچہ۔ مُرصّع مُہنال تیار کروا کر سامنے رکھوا دی۔

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن استاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا زین زریں کسا ہوا اُس پر سوار کر کے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے۔ کیا جانے گا کہ میں کس کے پاس گیا تھا۔

اِدھر ولیعہد بہادر کی فرمائشیں۔ اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں۔ کہ کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمہ کی مشقیں خوب زوروں پر چڑھ گئی تھیں انہوں نے بھی مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی تھی شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی۔ آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں

سُنائی۔ اور کہا اِس طرح میں جو غزل لکھے اُسے میں استاد مانتا ہوں[۵]۔ دوسرے مشاعرہ میں اُنہوں نے اُس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اُس پر کچھ اعتراض ہوئے۔ جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبد العزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اُس کے صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں، اُنہوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی، مگر ولیعہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنہوں نے جو کہا تھا۔ وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا:۔

بود بگفتہ من حرفِ اعتراض چناں	کسے بدیدۂ بینا فرد برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا۔ اور دربار شاہی میں جاکر قصیدہ سُنایا۔ اسکے بڑے بڑے چرچے ہوئے۔ اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں ٭ شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو، بر سرِ معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالبِ علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کر کے فرمایا۔ کہ انھوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ کہ آپ کے اعتراضوں کے لیئے قابلِ خطاب ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ اِنہوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا۔ کہ خیر تحریر تو اُسی وقت تک ہے۔ کہ فاصلہ دوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں۔ تو تقریر فرمائیے۔ قصیدہ کا مطلع تھا:۔

صرصرو کوہ میں ہوں گر۔ آتش و آب و خاک و باد	آج نہ چل سکینگے پر۔ آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو پڑھنے کے سبب سے حرکت ہے۔ تو اسمیں آگ کو بھی حرکت ہو گی۔ معترض

۵ یہ طنز ہے شیخ مرحوم پر کہ ولیعہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں کے استاد کہلاتے تھے۔

نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ انہوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اُس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرین مشاعرہ ان سوال وجواب کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا:-

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم　　　آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

مشاعرہ میں ایک دلولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گذرانا۔ ع

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر اشعار پر سوال وجواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُس نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں ثبوتِ روانی کا نہیں ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا۔ کہ تغلیب ہے۔ اُس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جب تک کسی استاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد جانیں میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی استاد نہ ہوا معترض نے کہا کہ اسوقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ کل پر مختصر رکھنا چاہیئے۔ اور جلسہ برخاست ہوا۔

اُسی دن سے تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے۔ انہیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی استاد تھے۔ وہی اُن کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً یہ بھی ایک دن مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ ان کی تیزیٔ طبع کا شہرہ ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب رام

نے اِن سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو۔ چنانچہ یہ نوبت ہو گئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے۔ تو راجہ صاحب کا آدمی انہیں ڈھونڈ کر لاتا۔ اور نہیں تو ان کا سبق بھی ملتوی رہتا؛

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولیعہدی میں تھے۔ تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک **مثنوی** ہم نے لکھی۔ اُس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں۔ **میر نجات** کی گلِ کشتی ہم نے دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم[لہ] مرزا محمد صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے اور میرے والدِ مرحوم اُنھیں کا علاج کرتے تھے وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے اُن سے جا کر پوچھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ رواجِ اتفاقی ہے جو مثنوی آٹھ بحروں میں منحصر ہو گئی ہے۔ ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے۔ جس بحر میں چاہو لکھو۔ استاد کے مسوّدوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اُس کے نکلے تھے۔ اُن میں ساقی کا مضمون تھا۔ دو شعر اب تک یاد ہیں؛

ٹھلیاں تو نہ تھیں وہ مئے عشرت کے سبو تھے	یا قلزم مستی کے حبابِ لبِ جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں	ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

دربار
خاقانی
عطا

چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سُنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع واقسام کے صنائع و بدائع صرف کیے تھے اس کے علاوہ ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا اُن کی تعداد ۱۸ تھی مطلع اُس کا یہ ہے:۔

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن	آب و ایلولہ ہوئے نشوونمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے **خاقانیٔ ہند** کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی

لہ حکیم مرزا محمد صاحب علم وفضل کے خاندان سے ایک فاضل کامل اور جامع الکمالات تھے۔ طب میں حکیم شریف خاں مرحوم کے شاگرد تھے۔ جو حکیم محمود خاں کے دادا تھے۔ حکیم مرزا محمد صاحب خود بھی شاعر تھے۔ اور اُن کے والد بھی صاحب علم و فضل شاعر تھے۔ کامل تخلص کرتے تھے۔ اور میر شمس الدین فقیر مصنف حدایق البلاغت کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک مبسوط رسالہ علم قوافی میں نے دیکھا ہوا ہے اُنہوں نے تحفہ اثنا عشریہ کا جواب لکھا تھا۔ اخیر کے تین باب باقی تھے کہ دنیا سے انتقال کیا۔ اکثر علمائے کتاب مذکورہ کے جواب لکھے ہیں۔ مگر جس متانت اور جامعیت اور اختصار کے ساتھ اُنہوں نے لکھا ہے۔ کسی نے نہیں لکھا۔

عمر ۱۹ برس کی تھی۔

حافظ احمد یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا۔ کہ ایک جنازہ رکھا ہے۔ بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبد الرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا پیالہ لئے کھڑے ہیں۔ اور شیخ علیہ الرحمہ کو اُس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ معرکہ کیا ہے۔ اور جنازہ کس کا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے۔ اور میاں ابراہیم اُن کے قایم مقام مقرّر ہوئے ہیں۔

خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کئے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا۔ اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا! ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے۔ اُسے بھی تو دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ قصیدہ مذکورہ لا کر پڑھا گیا۔ میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سُن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اُسوقت بھی کہا تھا۔ اور جب میں ارباب زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بےخبری اور بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا۔ تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی باانصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کئے جاؤ۔ ۳۶ برس کی عمر تھی۔ جبکہ جملہ منہیّات سے توبہ کی۔ اور اُس کی تاریخ کہی ع

	اے ذوق بگو سہ بار توبہ	

مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ تو انہوں نے یہ پہلے قصیدہ گذرانا۔

لہ حافظ احمد یار سید انشا کے یار تھے، یہ عجب شگفتہ مزاج۔ خوش طبع۔ سخن فہم شخص تھے۔ باوجودیکہ استاد جوان تھے۔ وہ بڈھے تھے۔ مگر یاروں کی طرح ملتے تھے۔ حافظ مرحوم اُنہیں مولوی صاحب کے داماد تھے۔ جنہوں نے حلّتِ زاغ کا فتویٰ دیا تھا۔ اور سودا نے اُس کی ہجو کہی تھی۔ ترجیع بند مخمس میں ع اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے۔

رو کش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق	ہے ذرّہ ترا پرتوہ نورِ سحر رنگِ شفق

اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور دلی رازوں کے لیئے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے۔ جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقع آئے۔ تو استاد کے لیئے یہ ہوا۔ کہ للعہ، مہینے سے صہ، ہوگئے صہ، سے صعہ، روپے ہوگئے۔ جب بادشاہ ہوئے۔ اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوگئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا۔ مگر استاد شاہی کو ۳۰ مہینا! پھر بھی انہوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لیئے عرض نہیں کی۔ ان کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے۔ اور شعر موزوں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چُستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُسے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے:۔

یُوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے	اے کمال افسوس ہے تجھ پہ کمال افسوس ہے

میاںؒ عبد العزیز خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے۔ شیخ مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے۔ اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ الف کے نام ب نہیں جانتے زبان تک درست نہیں۔ مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے ہیں عقل ظاہر بیں کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے۔ وہ اُس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو اُس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہو گا۔ ادنیٰ ادنےٰ انشی متصدی اُس کے لکھتے پڑھتے ہونگے۔ وہ کیا ترستا ہو گا۔ کہ نہ اُن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترکی تمام ہوگئی۔ تمام کُنبہ قلعہ سے نکالا گیا۔ نواب حامد علی خاں مرحوم مختار ہوگئے۔ تب استاد شاہی کا سو روپیہ مہینا ہوا۔ ہمیشہ

لہ فراش خانہ کی کھڑکی رہتے تھے۔

عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارک باد کے پڑھتے تھے۔ اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔

اواخرِ ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور اُنہوں نے ایک قصیدۂ غرّا کہہ کر نذر گذرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خاں بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔

پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گذرانا جس کا مطلع ہے۔ ع

	شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت	

اُسپر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا ؛

جس رات کی صبح ہوتے انتقال ہوا۔ قریب شام میں بھی موجود تھا کہ اُنہیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی۔ خلیفہ صاحب نے اُٹھایا۔ چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور انہوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی تو کہا۔ آہ ناتوانی۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ۔ شاعروں ہی کا ضعف ہوگیا۔ حافظ ویران بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں مسکراکر فرمایا کہ اب تو کچھ اُس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔ اس عالم میں بھی مبالغہ قایم ہے۔ خدا اسی مبالغہ کے ساتھ توانائی دے۔ میں رخصت ہوا۔ رات اُسی حالت سے گذری۔ صبح ہوتے کہ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا، ۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا	کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں اِن کی کہیں آج تک کسی بادشاہ یا صاحبِ کمال کو نصیب نہیں ہوئیں ؛

اُردو اخبار اُن دنوں دہلی میں جاری تھا۔ برس دن تک کوئی پرچہ اُس کا ایسا نہ تھا جسمیں ہر ہفتہ کئی کئی تاریخیں نہ چھپی ہوں ؛

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قد و قامت میں متوسط اندام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ	پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا۔ چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی۔ مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ اور وہ ان کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آیندہ۔ جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے۔ تو محفل گونج اٹھتی تھی۔ ان کے پڑھنے کا انداز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتا تھا۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے۔ (ذوقؔ ایک بہت بڑے قصیدہ گو گزرے ہیں۔)

قوت حافظہ

صانع قدرت جنہیں صاحب کمال کرتا ہے اُنہیں اکثر صفتیں دیتا ہے جن میں وہ ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ تیزیٔ ذہن اور براقیٔ طبع کا حال تو آپ بھی اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوت حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالم شیر خواری کا اُنہوں نے بیان کیا جسے سُن کر سب تعجب کریں گے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اُس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا اور آپ کسی کام کو چلی گئیں۔ ایک بلی لحاف میں گھس آئی، مجھے اُس سے اور خرخر کی آواز سے نہایت تکلیف ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا۔ نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آ گئیں۔ اُنہوں نے اُسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونوں کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چنانچہ جب بڑا ہوا۔ تو

میں نے والدہ سے پوچھا اُنہوں نے یاد کرکے اس واقعہ کی تصدیق کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی؛

حیت طبع

صلاحیتِ طبع کے باب میں خدا کا شکر کیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ایک دن اِملی کے درخت میں کنکوّا اٹک گیا۔ میں اُتارنے کو اوپر چڑھ گیا۔ ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا۔ وہ ٹوٹ گئی۔ میں نیچے آپڑا۔ بہت چوٹ لگی۔ مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوّا اڑایا۔ نہ درخت پر چڑھا۔

ن خدا

عُمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرب نسخہ قوتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہو کر اُس کے بنانے کی صلاح ٹھیری۔ ایک ایک جُز کا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمّہ ہوا چنانچہ ۴۰ چڑوں کا مغز ہمارے سر ہوا۔ ہم نے گھر آکر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلا دیئے۔ اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے۔ اُن کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے پل مزے کے لیئے ۴۰ بیگناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے۔ یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں۔ اور اپنی پیاری زندگی کے لیئے ہر قسم کی لذتیں رکھتے ہیں۔ اُسی وقت اُٹھا۔ اُنہیں چھوڑ دیا اور سب سامان توڑ پھوڑ یاروں میں جا کر کہہ دیا کہ بھئی ہم اِس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے؛

خدا

عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازہ کے آگے ایک لمبی گلی تھی اکثر اُس میں پھرا کرتے تھے۔ رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ اُس وقت حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے۔ مجھے کئی رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر

پھر یہ قطعہ پڑھا:۔

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک ذات	کہ رحمت براں تربتِ پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است	کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اُسوقت قصیدہ لکھ رہے تھے ع شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت ۔ چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور جو گرتے تھے اُنہیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالمِ محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی انہوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔

اِنہوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنسکر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے؟ ایک طرف میں بیٹھا تھا ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے وہ نابینا تھے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا کہے گا اور بِسْمِ اللہِ اَللہُ اَکْبَرُ کر دے گا۔ دیوانی ہے جو تمہارے سر پر آئے۔

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں مگر مجھے اس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انہیں ازبر تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سندمیں دیتے تھے مجھے اِس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحبِ نظر مُورّخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا

معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں، خصوصاً تصوّف میں ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں۔ بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں علمِ اشراق کا پرتوہ دیکر کبھی ابو سعید ابوالخیر تھے۔ کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے تھے۔ ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سُن لیا ہے آجتک دِل پر نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیریں اُنہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اسقدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا بڑا تعجب ہے مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ اُن کے حافظہ میں اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے۔

علم طب کو خوب حاصل کیا مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا کہ ایسا نہ ہو بے پروائی سے کسی کا خون ہو جائے۔

کہتے تھے کہ شعر کا بچپن سے عشق ہے۔ ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُس کے لئے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیئے ۱۰۰ برس سیکھے ۱۰۰ برس سُنتا پھرے اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے پھر ۱۰۰ برس بیٹھ کر اَوروں کو سُنائے اور اُس کا لُطف اُٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہو گا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور؟ نجوم و رمل کا بھی شوق کیا اُس میں دستگاہ پیدا کی۔ نجوم و رمل کا ایک صاحب کمال مغلپورے رہتا تھا اُس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک دِن کسی سوال کا

نہایت درست جواب اُس نے دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ایک ستارہ کا حال اور اُس کے خواص معلوم کرنے کے لیئے ۷ برس چاہیئے ہیں۔ یہ سُن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

نجوم کے چھوڑنے کا یہ سبب بھی ہوا۔ کہ ولیعہدی کا زمانہ تھا۔ مرزا مغل بیگ کا بھائی روشن بیگ اور بھائی بندوں کی طرح بے علم بے تربیت جاہل تھا، غریبی سے بھائی کی بدولت آسودہ ہو گیا تھا۔ وضع کو تراشتا تھا۔ سرکار میں صاحبِ خدمت تھا۔ کاروبار میں دخیل تھا۔ یہی لوگ اجزائے دربار تھے۔ استاد جاتے تو اُنہیں میں بیٹھنا اور وقت گذارنا پڑتا۔ اُن دنوں جوانی کا عالم تھا۔ اُس سے ہنسا کرتے اور دل بہلایا کرتے۔ اُس کی ایک رنڈی بھی تھی۔ استاد کبھی کبھی کہتے کہو تمہاری وہ کیسی ہیں؟ وہ کہتا خوب! اُن دنوں احکام نجوم کی مشق چڑھی ہوئی تھی۔ کبھی گھر سے کبھی وہیں حساب لگا کر دیکھ لیتے۔ اور کہتے کیوں جی آج رات کو تو جوتی چلتی رہی۔ کبھی معلوم ہوتا تو کہتے کیوں رات کو تو مزے میں تھے۔ کیوں جی وہ عطر ہی پر بگڑی تھی یا اَور بات پر۔ روشن بیگ سوچتا کہ انہیں کہاں سے خبر ہو جاتی ہے۔ اُسے وہم یہ تھا کہ شاید اُس سے ملتے نہ ہوں۔ گھبراتا اور شرماتا۔

اُس نے کہنا شروع کیا کہ حضور انہیں نجوم میں بڑا دخل ہے۔ ایک دن اُستاد گئے۔ بادشاہ محل میں تھے۔ خبر ہوئی۔ باہر آئے۔ مٹھی سامنے بند کر کے اُن سے پوچھا۔ بھئی میاں ابراہیم اپنے نجوم سے حساب کر کے بتاؤ۔ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے۔ مگر حساب کر کے عرض کی کہ گوشت کی بوٹی معلوم ہوتی ہے۔ ہنس پڑے اور مٹھی کھول کر دکھا دی دہی تھی۔ ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہ مرحمت فرمائی۔ انہوں نے اُس دن سے توبہ کی۔ پھر کبھی موقع ہی آجائے تو حساب کر کے دیکھ لیتے تھے۔ وہ بات نہیں تھی۔

مکھن لعل کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے۔ ایک مردِ

دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے، اُنہوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی اور ایک دن قرار پاکر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں اِنہوں نے بے اظہارِ نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا کہ وہ شخص صاحب کمال ہو۔ اور غالباً کمال اُس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعثِ تفریح ہو۔ اس کا کمال رواج خوب پاوے۔ اُس کے حریف بھی بہت ہوں مگر کوئی سامنے نہ ہو سکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کہے جاتے تھے جو شیخ مرحوم نے پوچھا کہ اُس کی عمر کیا ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ ۶۷ - ۶۸ حد ۶۵ یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرے پر آثار ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت کہ ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ پیشینگوئی
اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیئے لیکن واقعہ نظر پیش گذرا تھا اس لئے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا کہ اُنہیں آخرِ عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُنہوں نے مبارکباد کا قصیدہ کہا۔ میں حسبِ معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت اس قصیدہ کے شعر لکھ رہے تھے۔ چنانچہ اشعار اُس کے سُنانے لگے۔ مطلع تھا:۔

زہے نشاط کہ گر کیجیئے اُسے تحریر	عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اِس کے آگے شعر سُناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مُسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:۔

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ	کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور! ظہوری کا ساقی نامہ ہو گیا۔ چپ ہو گئے۔ اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے۔ میں گُھلا جاتا ہوں۔ اسکی جوانی ہے اور میرا بُڑھاپا ہے۔ ان کی طبیعت کو خدائے تعالےٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا اور اسی میں

خوش تھے۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ ایک آدمی چل سکے۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھرّی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے۔ یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی، جاڑا برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گذر جاتی تھیں۔ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ کوئی عید اور کوئی موسم ملکہ دنیا کے شادی و غم سے انھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اول روز بیٹھے وہیں بیٹھے۔ اور جب ہی اُٹھے کہ دنیا سے اُٹھے۔

ہر وضو کے بعد ایک لوٹے سے برابر کلیاں کئے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسف ہو کر بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک بات ہے پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہکر پڑھا:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے ۔۔۔ کم نہیں ہر گز زباں منہ میں ترے مسواک سے

معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کلیاں کر کے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیر آسمان کبھی ٹہلتے جاتے کبھی قبلہ رو ٹھیر جاتے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے۔ مگر اکثر اوقات اس جوش دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا گویا سینہ پھٹ جائیگا۔

وظیفہ پڑھ کر دعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیکخواہی کا اس میں سب سے پہلے یہ دعا تھی کہ الہٰی ایمان کی سلامتی بدن کی صحت۔ دنیا کی عزت و حرمت۔ پھر۔ الہٰی میرے بادشاہ کو با دولت با اقبال صحیح و سالم رکھ۔ اس کے دشمن رد ہوں وغیرہ وغیرہ پھر میاں اسمٰعیل یعنے اپنے بیٹے کے لئے پھر اپنے عیال، اور خاص خاص دوستوں کے لیئے

یا جو کسی دوست کے لئے خاص مشکل درپیش ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک شب اس موقع پر میرے والدِ مرحوم اُنھیں کے ہاں تھے۔ ساری دعائیں سُنا کیے۔ چنانچہ اُن کے دروازے کے سامنے محلہ کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آگیا۔ کہا کہ الٰہی جُمّا حلال خور کا بیل بیمار ہے اُسے بھی شفا دے۔ بیچارہ بڑا غریب ہے بیل مرجائیگا تو یہ بھی مرجائیگا۔ والد نے جب یہ سُنا تو بے اختیار ہنس پڑے۔ فقرا اور بزرگانِ دین کے ساتھ اُنھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھُلا ✤

فصاحت کا دل خون ہوتا ہے جب ان کے دیوان مختصر پر نگاہ پڑتی ہے۔ اس کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے۔ اور مرثیہ خوانی اُس کی میرا فرض ہے۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں جبکہ ۱۵-۱۶ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانہ نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوتی جُدا کاغذ پر لکھی جاتی۔ اسی طرح طاق میں رکھ دیتے۔ کہ فرصت میں نظرِ ثانی کریں گے جب طاق بھر گیا تکیہ کے غلاف میں بھرے اور گھر میں دیدیئے اور کہدیا کہ احتیاط سے رکھنا کبھی مٹکے میں کبھی ٹھلیا میں بھرے اور گھر میں بھجوا دیئے کہ ضائع نہ ہو۔ اس طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے ٹھلیاں بھر گئے تھے ✤

والد مرحوم نے آغازِ شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ علمی اور منصبی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب فرصت پاتے تو استاد کا کلام اُن سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ بداندیشیوں میں گھِرے ہوئے تھے۔ اس لئے بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنی تصنیف کسی کو دیتے نہ تھے۔ البتہ جو چیز والد مرحوم کو دیتے۔ جانتے تھے کہ اب محفوظ ہوگئی ✤

وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا۔ محنت نے اس کے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا کیونکہ بچپن سے لیکر دم واپسیں تک کا کلام اُنھیں میں تھا۔ اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی۔ بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں ۔

چنانچہ اول اُن کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لئے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر باطمینان کیا مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائے گا۔ عالم تہ و بالا ہو جائیگا۔ حسرتوں کے خون بہہ جائینگے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی ان کے فرزند ان روحانی بھی دُنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے۔ اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا۔ اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی۔ یہ ہی خیال آیا کہ محمد حسین زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائیگا مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہونگے۔ جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں یہ گئیں تو نام بھی نہ رہیگا۔ وہی جُنگ اُٹھا بغل میں مارا سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ غرض میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا حافظ غلام رسول ویران نے شیخ مرحوم کے بعض دردخواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دلی کے ساتھ برباد ہوا۔ اس وقت یہ زخم تازہ ہے اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہوگا حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد تھا اور خدا نے ان کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی تھیں کہ بصارت

کے محتاج نہیں تھے باوجود اس کے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی۔ غرضکہ ایک مشکل میں کئی کئی مشکلیں تھیں۔ اُنھوں نے اس مہم کا سرانجام کیا اور ۱۲۶۹ ہجری میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں چھاپ کر نکالا۔ مگر دردمندی کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دنیا کی لذتیں عمر کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں دن کی عیدیں۔ رات کی شب براتیں۔ بدن کے آرام۔ دل کی خوشیاں۔ طبیعت کی اُمنگیں سب چھوڑیں اور ایک شعر کو لیا جس کی انتہا تمنا یہی ہو گی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہیگا۔ تباہکار زمانہ کے ہاتھوں آج اُس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا۔ اور جس نے ادنےٰ ادنےٰ شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا۔ اُس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔ ع یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے + میرے پاس بعض قصیدے ہیں اکثر غزلیں ہیں۔ یہ داخل ہو جائینگی۔ یا ناتمام غزلیں غزلیں پوری ہو جائینگی۔ مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں +

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں اگر جمع کی جاتیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کی برابر ہوتیں۔ غزلوں کے دیوانوں کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کام کا تازگیٔ مضمون، صفائیٔ کلام، چستیٔ ترکیب۔ خوبیٔ محاورہ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے اُن دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ اُنکا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لئے انھوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسہ کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ وا کے نکال لینے میں جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں۔ چست بندشیں۔ برجستہ ترکیبیں۔ معانی کی بلندی الفاظوں کی شکوہیں۔ ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔

چند روز بعد نواب الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں اور ولیعہد کے دربار میں

پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ ان کی پسند طبع کے بموجب انھیں بھی تصوف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولیعہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ اُدھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جُرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جُرأت اور سید انشاء اور مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُنہی کے انداز میں بنواتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کی غزل اخیر کو گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملہ کے۔ اور پیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اسی میں بندھے تو لطف دے نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا اُسی میں باندھ دیتا تھا۔ اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انھیں اصول کے لحاظ سے میر۔ مرزا۔ درد مصحفی۔ سید انشا۔ جرأت۔ بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے گویا اُنھیں کے شاگرد ہیں۔ ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے گویا اُسی دستور العمل سے اُنھوں نے تہذیب پائی ہے۔ اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے۔ پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان ان کی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا۔

نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا اور اُنھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری ظہیر۔ ظہوری۔ نظیری۔ عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں۔ لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔

ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے۔ اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں وہ الگ تھیں۔ اگر جمع ہوتے تو خاقانیٔ ہند کے قصائد خاقانی شروانی سے دوچند ہوتے۔ جب تک اکبر شاہ زندہ تھے ان کا دستور تھا کہ قصیدہ لکھکر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولیعہد بہادر کو سُناتے۔ دوسرے دن ولیعہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سُنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالم جوانی کی طبع آرائی سب برباد ہوئی جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے بڑھاپے کی برکت ہے۔

کئی مخمس تھے بہتیری رباعیاں تھیں سب اُن کے ساتھ گئیں۔

مرثیے سلام کہنے کا اُنھیں موقع نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔

ہزاروں گیت۔ ٹپّے۔ ٹھمریاں۔ ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں۔ اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔

ان کے اور ان کے دیکھنے والوں کے لیے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا دیا اور چند آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج بھی پہنچا۔ مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اس کی نیّت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی مگر خدا نے ان کی ہجو بھی کسی کے مُنہ سے نہ نکلوائی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ زبان جو ہر لطیف ہے اسے بدی سے آلودہ نہ کرنا چاہیے۔

اکثر نئے ایجاد و اختراع ان کے ارادے میں تھے۔ اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے۔ کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مُہلت نہ دیتی تھیں۔ اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالتا مگر اسے سمیٹ نہ سکتا تھا اس کا کیا ہوا انھیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

اپنی غزل بادشاہ کو سُناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح پہنچ جاتی تو وہ اُسی غزل پر خود غزل کہتے۔ اب اگر نئی غزل لکھکر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہّ نہ تھا، ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اُس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈالکر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع نہ خرچ کریں۔ جب ان کی شوقِ طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوشِ طبع ہو ادھر ہی آجائے۔

عموماً انداز کلام

کلام کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اُونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادر الکلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارہ کی بو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور کتب لغات کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائیگا۔ اور کونسا رنگینی میں۔ کامل مصوّر کی تیزیٔ قلم کو اُس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک

مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے ۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا ۔ اسی وصف نے ناوانوں کو غلطی میں ڈالا ہے کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں ۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پا کر نکلے ہیں خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں جیسے ریشم پر موتی ۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینہ کی صفائی اُڑائی یا اُنھوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیونکر جلا کی ہے ۔ جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے ۔ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرتِ کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دیکر آئینہ بناتا ہے ۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے ۔

ہمیشہ فکرِ سخن میں غرق رہتے تھے ۔ اور اپنے کلام کو آپ اُلٹ پلٹ کرتے تھے ۔ یہی سبب ہے کہ بعض اشعار دو دو تین تین چار چار طرح سُنے اور لکھے نظر آتے ہیں ۔

اُن کا کلام جس طرح دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے اُسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے ۔ اُن کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خدا داد چستی ہے جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے وہ زور فقط ان کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا ۔ بلکہ سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے اور یہی قدرتی رنگ ہے جو ان کے کلام پر سوؔدا کی تقلید کا پرتوہ ڈالتا ہے ۔

ان کے دیوان کو جب نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو اس سے رنگا رنگ کے زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں ۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے دیکھنے سے دل اُکتا نہیں جاتا ۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے اور مضامین کے طبیب تھے ۔ جس طرح برجستہ بیٹھا دیکھتے تھے ۔ اسی طرح باندھ دیتے تھے خیال بندی

ہو یا عاشقانہ یا تصوف ۔ ان کے سینہ میں جو دل تھا گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا ہزار دل آدمیوں کے دل تھے ۔ اس واسطے کلام ان کا مقناطیس کی طرح قبولِ عام کو کھینچتا ہے ۔ دل دل کے خیال باندھتے ۔ اور اس طرح باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گزری ہے +

شاگردوں کی غزل بڑی توجہ سے درست کرتے تھے ۔ میں نے پوچھا کہ اور اُستاد اس قدر زیادہ اصلاح نہیں دیتے ۔ فرمایا میری غزل پر اُستاد توجہ کم کرتے تھے اکثر واپس بھی کر دیتے تھے کہ دوبارہ دیکھو ۔ طبیعت پر زور دیکر کہو ۔ بعض شعر کاٹ دیتے تھے ۔ مجھے رنج ہوتا تھا ۔ اس لئے شاگردوں کے کلام کا درد آتا ہے اور کاوش سے درست کرتا ہوں +

اس میں خوبی یہ تھی کہ شاگرد کا کلام اُس کی حیثیت اور استعداد سے گھٹنے یا بڑھنے نہ پاتا تھا ۔ اور کیفیت اس کی مشاعرہ کی غزلوں میں کھُلتی تھی ۔ مثلاً بادشاہ کی غزل بناتے تھے ۔ ولیعہد کی غزل بھی بناتے تھے ۔ اور جب جُدا جُدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے یہ ولیعہد کا ۔ اور ہر شاگرد کا کلام بعد اصلاح کے اپنے انداز پر تھا ۔ ویران اپنی جگہ ۔ داغ اپنی جگہ ۔ اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ +

اعتراض

ان کے کلام پر لوگ اعتراض بھی کرتے رہے ہیں چنانچہ ایک پُرانی غزل کا شعر ہے :-

سر بوقتِ ذبح اپنا اُسکے زیرِ پائے ہے	یہ نصیب ! اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

لوگوں نے کہا کہ بے اضافی یا صفتی ترکیب کے اس میں تی زیادہ کرنی جائز نہیں ۔ یہ اعتراض اُن کی کم نظری کے سبب سے تھے +

دستے کہ اکنوں گرفت است پائے	بہ نیروے مردے بر آید ز جائے
اے زدہ برتر از گماں دامن کبریائے را	دست تو کجا رسد عقل شکستہ پائے را

ایک پُرانی غزل شاہ نصیرؔ کے مشاعرہ میں طرح ہوئی تھی:-

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو	آسئے ہے جُز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اس پر اعتراض ہوا کہ اصل لفظ جزو مع واو کے ہے۔ فقط جُز صحیح نہیں۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:-

ہرچہ کنند در جُز و در کل اثر	کلی و جُزئیش بو د زاں خبر

اور میر تقی فرماتے ہیں:-

جز مرتبہ کل کو۔ حاصل کرے ہے آخر	اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہو گا

ایک دن میں اوج سے ملا اور اُستاد مرحوم کے مطلع کا ذکر کیا:-

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے	صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو راستے میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا۔

یہاں جو برگِ گُلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے	دھول دستارِ فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو اُستاد نے باندھا ہے۔ یہ جائز نہیں۔ مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں بات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لاکر! میری طرف دیکھکر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں اُستاد کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اُس کے حق میں سحر ہو جائے۔ یعنے روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی۔ نہ ہوئی نہ ہوئی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ۔ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا۔ بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت

کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ تھا تو کیا تھا مبتذل۔ عامیانہ۔ اب ثقہ۔ متین اور شریفانہ ہے +

آزاد۔ ایک شعر ناسخ کا بھی اسی ترکیب کا ہے:۔

جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں		سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں۔ شمشیر کا کھیت نہیں ہے +

اُن کی ایک غزل کا شعر ہے:۔

منہ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ تجھے		ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

نواب کلب حسین خاں نادر تخلص معلّیٰ میں فرماتے ہیں (تجھے) دوسرے مصرع کا حق ہے پہلے مصرع میں نہیں لانا چاہئے۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا +

نقل۔ شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عرس ہوا کرتا تھا۔ اس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے۔ ابھی نوجوانی کا عالم تھا۔ حسب معمول اُستاد بھی گئے۔ فاتحہ کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے۔ شاہ صاحب ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے میں ایک بادیہ لئے ہوئے آئے۔ اُس میں دہی تھا۔ کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے۔ ان کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور چمچہ بھرا۔ انھیں ریزش ہو رہی تھی۔ پرہیز کے خیال سے پوچھا یہ کیا ہے؟ شاہ صاحب نے کہا سنکھیا ہے سنکھیا۔ کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ اُستاد نے ہنس دیا اور کہا کہ ع

	بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں	

مصرع میاں مجذوب[1] کا ہے۔ مگر کھانے کا موقع تھا۔ اس لئے سب کو بہت مزا دیا +

ایک دن حسب معمول حضور میں گئے۔ مرزا شاہ رُخ ایک بیٹے حضور کے تھے اُنھوں نے اُن دنوں بہت سے کاروبار کی خدمتیں قبضہ میں لے رکھی تھیں۔ اور اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے کہ لیجئے وہ بھی آ ہی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ حضور کی ایک غزل ہے۔ اُس کے ہر شعر میں ایک مصرع لگا کر مثلث کرنا چاہتے

[1] مرزا رفیع سوداؔ کے بیٹے کہلاتے تھے۔ شاید متبنیٰ تھے۔

ہیں۔ مگر ایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے بموجب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مطلع پیدا ہوتا جائے غرض بادشاہ نے وہ غزل انھیں دی کہ اُستاد اس پر مصرع لگا دو۔ انہوں نے قلم اُٹھا کر ایک شعر پر نظر کی اور فوراً مصرع لگا دیا۔ اسی طرح دوسرے میں تیسرے میں مسلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی بے تامل ساتھ ہی مصرع لکھتے گئے اور اسی وقت پڑھ کر سُنائی۔ سب حیران ہو گئے۔ بلکہ مرزا شاہرخ نے کہا کہ اُستاد آپ گھر سے کہہ کر لائے تھے۔ بادشاہ بولے۔ بھلا انھیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے ÷

نقل۔ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ بموجب معمول کے قطب صاحب میں تھے۔ مرزا فخرو بادشاہ کے صاحبزادے (کہ اخیر کو ولیعہد بھی ہو گئے تھے) شب مہتاب میں تلاؤ کے کنارہ چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ اُستاد مرحوم پاس کھڑے تھے۔ انھیں بھی شعر کا شوق تھا اور شاگرد تھے۔ ان کی زبان سے یہ مصرع نکلا۔ ع

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

ان سے کہا کہ اُستاد اس پر مصرع لگائیے گا۔ انھوں نے فوراً کہا۔ ع

عکس رُخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر

نواب حامد علی خاں کے خسر نواب فضل علی خاں سے اور شیخ مرحوم سے سابقہ محبت بھی تھا۔ اس لئے نواب حامد علی خاں مرحوم بھی محبت و اخلاق سے ملا کرتے تھے۔ ایک دن دیوان خاص میں کھڑے ہوئے شعر سنتے سُناتے تھے۔ نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا:۔

جانور جو ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے
اے شہ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

اُستاد مرحوم نے کہا کہ صدقہ میں اکثر کوّا چھڑواتے ہیں اس لئے زیادہ تر مناسب ہے:۔

زاغ بھی گر ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے
اے شہ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے[1]

[1] ایسی بہت سی اصلاحیں روز ہوتی تھیں۔ لکھی جائیں تو ایک کتاب بن جائے۔

فرماتے تھے کہ جوانی کا آغاز اور میری بدیہہ گوئی پر نظریں پڑتی تھیں کہ ایک دن میر بدیہہ
محمد خاں اعظم الدولہ کے بالاخانہ کے نیچے سے میرا گذر ہوا۔ وہ پُرانے شاعر تھے اور سرور تخلص کرتے تھے۔ مجھے دیکھکر آواز دی۔ میں گیا۔ بیٹھتے ہی فرمائش کی کہ تذکرہ ہم نے تمام کر دیا۔ اب اس کی تاریخ کہدو۔ میں نے کہا اچھا فکر کروں گا اُنھوں نے کہا فکر کروں گا کی سہی نہیں۔ ابھی فکر کرو۔ اور کہدو۔ فرماتے تھے۔ خدا کی قدرت ان کے خطاب کے خیال سے اُسی وقت ذہن میں آیا۔ دریائے اعظم۔ حساب کیا تو عدد برابر۔ عجب خوشی دل کو ہوئی۔ میں نے جھٹ کہدیا۔ ہنسے اور کہا پہلے سے کہہ رکھی ہوگی۔ پھر کہا مصرع ابھی لگا دو۔ میں نے کہا کہ مصرع پھر انشاء اللہ جو بات تھی وہ ہوگئی +

ایک دن معمولی دربار تھا اُستاد بھی حاضر تھے ایک مرشدزادے تشریف لائے۔ وہ شاید کسی اور مرشدزادے کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ اُنھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا۔ اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے عرض کی صاحب عالم اس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اُس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ اُستاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور۔ زبہ طبع حال

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے	اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ اواخر عمر کی غزل ہے۔ اس کے دو تین ہی برس بعد انتقال ہو گیا +

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے تھے جو میں پہنچا۔ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گذرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے وہیں بُلا لیا۔ اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ اُستاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال

پوچھا کہا کہ واہ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لئے کہا تھا اُس کے وہ! اشعار آج ہمیں یاد آ گئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لطف حاصل ہوا۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لئے کہتے ہو۔ ہم مر جائیں گے تو جو تخت پر بیٹھیگا اُس کے لئے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اُکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے اُٹھ جائیں گے۔ اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرامگاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امراان کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے عرش آرام گاہ کے امرا آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں! بس یہی خیال فرمالیجیے۔ جو جس کے ہوتے ہیں وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے۔ اور اپنا سامان مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سُن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا۔ مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ خدا شاہد ہے اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دُنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے +

بابل شیخ مرحوم ضعف جسمانی کے سبب سے اواخر عمر میں روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جاکر یا گھر میں جاکر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا کہ میاں خدا کے گنہگار ہیں وہ عالم نہان و آشکار کا ہے اُس کی شرم نہیں ہو سکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے +

پھر ایک دفعہ رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلیے چونکہ وہ اُس وقت کچھ لکھوا رہے تھے بمصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا

اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا لے آ یہیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔ جب اُس نے کٹورا لاکر دیا تو یہ مطلع کہا۔ کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا۔

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری	خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

تاریخ

تاریخ کی کمائی بھی سب بادشاہ کے حصہ میں آئی۔ کیونکہ اکثر اُنہی کی فرمائش سے کہتے تھے۔ اُنہی کا تخلص ہوتا تھا۔ نواب زینت محل بیگم۔ بادشاہ بیگم تھیں اور کل احکام سلطنت کی حاکم تھیں۔ اُنھوں نے شہر میں ایک مکان بنوایا۔ تاریخ کے لئے بادشاہ سے عرض کی اُنھوں نے دربار خلوت میں اُستاد سے فرمایا۔ بیگم بولیں کہ حضور اُستاد سے کہئے کہ آج تاریخ کہکر جائیں۔ اُستاد نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا

کرد اے ظفر زینت محل تعمیر قصر بے بدل	تاریخ گفتم بر محل۔ ایں خانۂ زینت محل

ایسی ایسی تاریخیں سینکڑوں کہدیتے تھے۔ یاد کہاں! اور لکھے کون؟

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے اُن سے تاریخ کے لئے کہا۔ اُسی وقت تامل کرکے کہا۔ تعزیت گاہِ امام دارین پوری تاریخ ہے۔

حکیم میر فیض علی مرحوم طب میں ان کے اُستاد تھے۔ اور اُنہیں کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں بھی موجود تھا۔ نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا۔ اور ایسا اضطراب ہوا کہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتہً بولے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔ یوں تاریخیں سینکڑوں کہدیں۔ کہاں تک لکھوں! اور یاد کہاں؟

ایک شخص نے کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے۔ اُس نے نہایت تاکید سے فرمائش لکھی ہے کہ حضرت سے ایسا سجع کہوا دو کہ جس میں دونوں نام آجائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آیئے گا۔ انشاء اللہ ہو جاویگا۔ وہ رخصت ہو کر چلے۔ ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہونگے

جو نوکر سے کہا کہ محمد بخش بُلانا انھیں۔ لینا لینا۔ خوب ہوا۔ ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہو گئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

ع	پدر غلام محمد پسر غلام علی

دیوان چندولال نے ان کا کلام سُنکر مصرع طرح بھیجا اور بُلا بھیجا۔ آپ نے غزل کہکر بھیجی اور مقطع میں لکھا۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن	کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اُنھوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے مگر یہ نہ گئے۔ ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پوچھا۔ فرمایا۔

نقل۔ کوئی مسافر دلی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کتا ہل گیا تھا۔ وہ وفا کا مارا ساتھ ہو لیا۔ شاہدرہ پہنچکر دلی یاد آئی اور رہ گیا۔ وہاں کے کتوں کو دیکھا گردنیں فربہ۔ بدن تیار چکنی چکنی پشم۔ ایک کتا انہیں دیکھ کر خوش ہوا۔ اور دلی کا سمجھکر بہت خاطر کی۔ دلہائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائی کی دوکان سے ایک بالوشاہی اُڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارہ کی دوکان سے ایک کلّہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھاتے اور دلی کی باتیں سُناتے رہے۔ تیسرے دن رخصت مانگی۔ اُس نے روکا۔ انھوں نے دلی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کئے آخر چلے۔ اور دوست کو بھی دلی آنے کی تاکید کی آئے۔ اُسے بھی خیال رہا اور ایک دن دلی کا رُخ کیا۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کُتے مردار خوار۔ خونی آنکھیں کالے کالے مُنہ نظر آئے یہ لڑتے بھڑتے نکلے۔ دریا ملا۔ دیر تک کنارہ پر پھرے۔ آخر کو دیڑے۔ مرکھپ کر پار پہنچے۔ شام ہو گئی تھی۔ شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے بظاہر خوش ہوئے اور کہا اوہو اس وقت تم کہاں؟ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا۔ ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا۔ اُسے لے کر اِدھر اُدھر پھرنے لگے

یہ چاندنی چوک ہے۔ یہ دریبہ ہے۔ یہ جامع مسجد ہے۔ مہمان نے کہا۔ یار بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ سیر ہوجائیگی۔ کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا عجب وقت تم آئے ہو اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جاتی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ انھوں نے کہا لو یار بڑی قسمت والے ہو وہ دن بھر کا بھوکا تھا منہ پھاڑ کر گرا اور ساتھ ہی منہ سے مغز تک گویا بارود ست اُڑ گئی۔ چھینک کر پیچھے ہٹا۔ اور جل کر کہا واہ بھی دلّی! انہوں نے کہا اسی چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں +

لطیفہ۔ مرزا فخرو شاہزادے اواخر سلطنت میں ولی عہدی کے حقدار ہوئے تھے وہ بھی اُستاد سے اصلاح لیتے تھے۔ شہر میں چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحب جمال اپنے ہنر کی باکمال تھیں۔ عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور کتنے ہی امیر دل کو مار کر ہضم کر چکی تھیں۔ اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چنتی تھیں۔ مرزا فخرو کی ۲۴۔۲۵ برس کی عمر تھی۔ رنڈی کو نوکر رکھکر غلام ہو گئے۔ مرزا نے ایک دن اُستاد کو بلا بھیجا۔ یہ گئے اُنھوں نے غزل عنایت کی اور کہا کہ اُستاد اسے یہیں اصلاح دے دیجئے۔ اُستاد غزل بنانے لگے۔ مرزا نے ایک تصویر صندوقچہ میں سے نکالی اُسے دیکھا اور کہا کہ اُستاد ذرا اسے دیکھئے۔ اُستاد سمجھ گئے کہ اسی کی تصویر ہے۔ دیکھکر کہا۔ بہت خوب۔ مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی۔ پھر کہا۔ دیکھئے تو سہی۔ اگر واقعی ایسا معشوق ہو تو کیسا ہو۔ اُستاد سمجھے کہ دل آیا ہوا ہے۔ چاہتا ہے کہ میں بھی بڑھیا کی تعریف کروں۔ پھر بھی اتنا کہا کہ خوب! بہت خوب! ان سے پھر بھی نہ رہا گیا۔ تیسری دفعہ تصویر ہاتھ میں دی اور کہا بھلا اُستاد اس حُسن میں کچھ نقص تو بتایئے۔ اُستاد نے دیکھا۔ اور کہا ذرا چھاتیاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ اُستاد خود فرماتے تھے کہ میں نہ کہتا۔ مگر دل نے کہا۔ لڑکا ہے اور ایک بیوا کے دام میں پھنس گیا ہے۔ کہہ تو دو۔ شاید سمجھ جائے۔ میں نے اُستاد سے پوچھا

حضرت! پھر مرزا نے کیا کہا۔ فرمایا۔ پہلو میں رکھ لی۔ میں نے کہا بارے اُس بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ فرمایا۔ کہتے کیا؟ پی گئے +

لطیفہ - دلّی میں ایک شریف خاندانی۔ خوش اخلاق۔ خوش مزاج تھے اُن کا قاعدہ تھا کہ نوکر کے پاس خاصدان میں ہر وقت چند گلوریاں رکھتے تھے جہاں جاتے یا راہ میں کوئی دوست ملتا۔ مزاج پرسی کے بعد اُسے ایک گلوری بھی دیتے تھے۔ اور اسی واسطے **میر گلوری** مشہور تھے۔ انھوں نے بیٹے کی ختنہ کی اور بعد غسل صحت کے تمام احباب کو بُلا کر کھانا کھلایا۔ جلسہ ضیافت میاں عنایت اللہ فروں خواجہ سرا کے مکان میں تھا۔ اُستاد مرحوم بھی گئے۔ کھانا کھا کر دوسرے مکان میں آ بیٹھے۔ چند بزرگ اور بھی موجود تھے۔ کہ اتنے میں میر گلوری صاحب آئے سینی میں ایک شخص گلوریاں لئے ساتھ۔ اپنے ہاتھ سے سب کو گلوریاں دیں +

حکیم آغا جان عیش اُستاد سے باتیں کر رہے تھے۔ میر صاحب سے گلوری لیکر کہا۔ آج تو دوست مبارک سے گلوریاں کھلانی واجب تھیں۔ اُستاد نے کہا۔ ہاں ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب ہنسے اور کہا حضرت! میر صاحب کی ظرافت کے نکتے کوئی کہاں تک پائے۔ ختنہ کی ضیافت کی۔ خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ اُستاد نے کہا۔ ظرافت پر ظرافت یہ کہ کھلایا بھی خصی[1] پلاؤ +

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلم حقّہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹّی کے دن اُس وقت جایا کرتا تھا۔ اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے اجی ہمارا وہ شعر اُس دن تم نے پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اُس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر پڑھ دیتا۔ فرماتے۔ ہاں اب اسے یوں بنا لو۔ ایک دن ہنستے ہوئے

[1] خصی پلاؤ۔ اُس پلاؤ کو کہتے ہیں کہ گوشت کی جگہ اسمیں چنے کی دال دم دیتے ہیں۔ گویا گوشت کا پلاؤ مراد ہے +

پائخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لوجی ۳۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا۔ حضرت کیونکر؟ فرمایا۔ ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔ ع

کھائی کمر ہے تین بل اگلے گدی کے ساتھ

ابتدائی مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیئے۔ اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی۔ حضرت پھر کیا۔ فرمایا۔ ع

کھائی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کمر کو اوپر ڈالدو۔ عرض کی پھر وہ کیونکر ہو۔ تم مصرع الٹ پلٹ کئے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں	کھائی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کابلی دروازہ کے پاس ہی مکان تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامین کتابی۔ خیالاتِ علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں۔ غوں غاں کچھ تو کہو کوئی مصرع ہی سہی میں نے کہا۔ ع

سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا۔ ہاں درست ہے ؎

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہئے	سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دلی جانا ہوتا ہے اور اس مقام میں گذر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔

اس مطلع پر حضور نے کئی دفعہ جال مارے مگر یہ ٹال گئے مضمون آنہ سکا۔ مطلع انھوں نے نہ دیا۔

کیا کہوں اُس ابروئے پیوستہ کے دل اس میں ہے	ایک طمعہ مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے

بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا

حضرت مرحوم کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے اُن کا نظم و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمھارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے۔ مگر تم سرسبز کرتے ہو۔ ورنہ شورزار ہو جائے۔ مُسَوّدۂ خاص میں کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرع۔ کوئی ایک کوئی آدھا مصرع۔ فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہوتا تھا۔ باقی بخیر۔ یہ اُن ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حُسن و عشق کی پُتلیاں بنا دیتے تھے ایجادی فرمائشوں کی حد نہ تھی۔ چند شعر اس غزل کے لکھتا ہوں جس کے ہر شعر کے نیچے مصرع لگایا ہے

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجکو — عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خمخانہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا — کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دُنیا میں خرابی ہے ظفر — ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

...ھا چورن مرچن کی پڑیاں بیچتا پھرتا تھا۔ اور آواز دیتا تھا۔

ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

...نے سُنا۔ ایک دو مصرع اس پر لگا کر اُستاد کو بھیج دئے۔ انھوں نے ...دوہرے لگا دئے۔ حضور میں کنچنیاں ملازم تھیں۔ اُنھوں نے یاد کر لئے دوسرے ...دن بچّہ بچّہ کی زبان پر یہی گیت تھا۔ دو بند یاد رہ گئے۔

لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

کنجڑے کی سی ہاٹ ہے دُنیا جنس ہے ساری اکھٹی		میٹھی چاہے میٹھی لے لے کھٹی چاہے کھٹی
	لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا	
روپ رنگ پر بھول نہ دل میں دیکھ عقل کے بیری		اوپر میٹھی نیچے کھٹی - آنبوا کی سی کیری
	لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا	

ایک فقیر صدا کہتا پھرتا تھا - کچھ راہِ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہو گا - حضور کو پسند آئی ان سے کہا - انھوں نے بارہ دوہرے اُس پر لگا دیئے - مدتوں تک گھر گھر سے یہی گانے کی آواز آتی تھی - اور گلی گلی لوگ گاتے پھرتے تھے - (حافظ ویران کو خدا سلامت رکھے اِنہی نے یہ شعر بھی لکھوائے) :-

	کچھ راہِ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہو گا	
محتاج خرابی تو ہے یا پاک نمازی ہے		کچھ کر نہ نظر اسپر - واں نکتہ نوازی ہے
	کچھ راہ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہو گا	
دُنیا ہے سرا اُس میں تو بیٹھا مسافر ہے		اور جاتا ہے یاں سے جانا تجھے آخر ہے
	کچھ راہِ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہو گا	
جو رب نے دیا تجھکو - تو نام پہ رب کے دے		گر یاں نہ دیا تو نے - واں یو یگا کیا بندے
	کچھ راہ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہو گا	
دنیا کے کیا کرتا ہے سینکڑوں تو دھندے		پر کام خدا را بھی تو کرلے کوئی بندے
	کچھ راہ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہو گا	
دیگا تو اُسی کو تو - وہ جس کو ہے دلواتا		پر ہے یہ ظفر تجھ کو - آواز سُنا جاتا
	کچھ راہ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہو گا	

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں - ٹپے - ٹھمریاں - پہیلیاں - سیٹھینا ل کیا کیا لکھوں ؛

ایک دن ٹہل رہے تھے - حافظ ویران ساتھ تھے - بہ تقاضائے استنجا

بیٹھ گئے۔ اور وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی۔ اُنھوں نے قریب جا کر خیال کیا تو کچھ گنگنا رہے ہیں۔ اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سنائے تھے کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اُس کا خیال آگیا۔ پوچھا کہ یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا اس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں +

حافظ ویران کہتے ہیں۔ ایک دن عجب تماشا ہوا۔ آپ بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ مطلع ہوا کہ ؎

ابرو کے اُس کے بات ذرا چل کے تھم گئی	تلوار آج ماہ لقا چل کے تھم گئی

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا کہ اس وقت عجب معرکہ دیکھا۔ اُستاد مرحوم متوجہ ہوئے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا۔ تو کھاری باولی کے رُخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھنچ گئی! ور دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ یہاں چونکہ غزل کے شعر حافظ ویران سُن رہے تھے ہنسکر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجود تھے۔ آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انھیں کرامات تھی یا وہ غیب داں تھے۔ ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ اہلِ ذوق کے لطف طبع کے لئے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

آج ابرو کی ترے تصویر کھنچ کر رہ گئی	سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتب تاریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں۔ طول کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں +

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا۔ باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو فرمایا

کہ ابھی خواب میں دیکھا کہیں آگ لگ گئی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کچھ نقصان نہیں ہوا +

ایک شب والد مرحوم کے پاس آکر بیٹھے۔ کہا کہ بادشاہ کی غزل کہنی ہے۔ لاؤ یہیں کہہ لیں۔ کئی فرمائشیں تھیں۔ ان میں سے یہ طرح کہنی شروع کی۔ محبت کیا ہے۔ صورت کیا ہے۔ مصیبت کیا ہے۔ میں نے کہا حضرت زمین شگفتہ نہیں۔ سکوت کرکے فرمایا۔ کہنے والے شگفتہ کر ہی لیا کرتے ہیں۔ پھر یہ دو مطلع پڑھے۔

سودا

نہیں ہے اعتبار اس کا یہ منہ دیکھے کی الفت ہے	نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے

میر

ہماری خاک یوں برباد ہو اے ابر رحمت ہے	بگولے سے جسے آسیب اور صرصر سے زحمت ہے

اتفاق۔ فرماتے تھے کہ ایک دن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے ابھی درست کرکے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا۔ ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوان خاص میں جاکر اُسی رُخ پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غزل ہے۔ پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دعا گوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا کس زبان میں؟ میں نے کہا اُردو میں۔ پوچھا۔ آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی۔ عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا۔ اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا کوئی خاص موقع ہو تو اُس میں بھی کہنا پڑتا ہے۔ ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کر سکتا ہے غیر کی زبان میں نہیں کر سکتا۔ پوچھا۔ آپ انگریزی جانتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا۔ کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا کہ ہمارا لب ولہجہ اُس سے موافق نہیں۔ وہ ہمیں آتی نہیں ہے

صاحب نے کہا وَل یہ کیا بات ہے۔ دیکھئے ہم آپ کا زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی۔ بہت مشکل معاملہ ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا کہ وَل ہم آپ کی تین زبان ہندوستان میں آکر سیکھا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے۔ یہ کیا بات ہے؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا۔ صاحب ہم زبان کا سیکھنا اسے کہتے ہیں کہ اُس میں بات چیت۔ ہر قسم کی تحریر۔ تقریر اس طرح کریں جس طرح خود اہلِ زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ ام آپ کا تین زبان سیکھ لیا۔ بھلا یہ کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے۔ اسے زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں ٭

اَللّٰھُمَّ تَمِّمْ بِالْخَیْر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الالف

ز الف الحمد رب العلمین کا ہے قلم میرا

ہوا حمد خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

رہے نام محمدؐ لب پہ یارب اول و آخر
اُلٹ جائے بوقتِ نزع جب سینہ میں دم میرا

محبت اہلبیت مصطفیٰ کی نور برحق ہے
کہ روشن ہو گیا دل مثل قندیلِ حرم میرا

دکھائی مجھکو راہ شرع اصحاب پیمبر نے
چراغ راہ ہے اکرام اصحابِ کرم میرا

کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا
کہ ہے دُرِّ نجف ہو کر چمکتا دُرِّ یتیم میرا

رہے گا دانہ افشاں مزرعِ اُمید بخشش میں
غمِ آل نبیؐ سے دانۂ ہر اشک نم میرا

شہ بغداد کا خط غلامی ذوق رکھتا ہوں
نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جام جم میرا

ز میر صاحب مغفور [illegible] ۱۲۵۵ [illegible]

ہوا یہ سینہ یکسر خارزار دشت غم میرا
کہ آیا پا بجوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

صراط عشق پر از بسکہ ہے ثابت قدم میرا
دمِ شمشیر قاتل پر بھی خوں جاتا ہے جم میرا

مری خواری کے رتبے کا کمالِ اوج تو دیکھو
کہ ہے چرخِ زحل بھی سایۂ بختِ دژم میرا

وہ ہوں میں آتشیں گل تازہ نخلِ شمع الفت کا
نہیں ہے کوئی گلچیں غیر مقراضِ ستم میرا

نشانِ بے نشانی گرد کھائے زور مٹ جائے
جھپک سے دیدۂ صراف کی نقش درم میرا

رواں رنگِ رواں ہے جائے آبِ اشک مژگاں سے
کدورت بار ہے دیکھو سحابِ رنج و غم میرا

وہ ہوں میں آہوئے وحشی رمیدہ دام ہستی سے
کہ ہے اک کوچۂ رم جادۂ دشتِ عدم میرا

جھپکتی آنکھ شب جوں حلقۂ زنجیر کیا میری
طلسمِ خواب بندی تھا سرِ زلف الم میرا

کہوں میں سو دہن سے حرفِ قطعِ آرزوئے دل
لبِ ہر زخم پر ہے جوں لبِ شمشیر دم میرا

مری افسردہ حالی گر ہو جشن آرائے دل سردی
عجب کیا شیر برفیں ہوا گر شیر علم میرا

پھپھولا کام افعی میں ہے واں تک جہاں ٹپکا
قضا کے جام سے یک قطرۂ زہر آب غم میرا

ہوا روشن چراغِ کعبہ زاہد جس کے شعلہ سے
اُسی آتش کا رکھتا ہے شرر سنگِ صنم میرا

نہ ہو بے وقر ترکِ سجدۂ ابلیس سے آدم
عدو کی سرکشی سے رتبہ کب ہوتا ہے کم میرا

وہ ہوں میں گیسوئے موجِ محیطِ عازمِ وحشت
کہ ہے گھیرے ہوئے روئے زمیں کو پیچ و خم میرا

مری صورت کے معنی ہیں نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ روحی
حدوثِ بے ثبات اثبات کرتا ہے قدم میرا

وہ ہوں میں رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جاتا ہے
برنگِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

تخیل نے مرے باندھا طلسمِ تازہ کیفیت
نہ کیوں ہو کاسۂ سر ذوقِ رشکِ جامِ جم میرا

لکھنؤ سے شیخ ناسخ کی غزل اس طرح میں آئی شہر میں چرچا ہوا کہ ان شعروں پر شعر نہیں ہو سکتے شاہ نصیر مرحوم اُستادِ وقت تھے۔ اُن کی صحبت میں بھی یہ باتیں پہنچیں۔ اُستاد مرحوم کی اصلاح بند ہو چکی تھی۔ مگر آدابِ شاگردانہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ اُن کی خدمت میں گئے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میاں ابراہیم تم نے بھی وہ غزل دیکھی یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ عرض کی۔ حضرت سُنتا ہوں ایسی تو نہیں جیسی لوگ کہتے ہیں۔ فرمایا۔ پھر تم نہیں کہتے؟ کہا جو ارشاد ہو۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہم بھی کہیں گے۔ تم کیوں نہیں کہتے۔ دیکھو تو وہ کیا کہتے ہیں۔ جب ہی اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ وہ غزلیں پھر لکھنؤ گئیں وہاں بھی تعریفیں ہوئیں +

شوقِ نظارہ ہے جب سے اُس رُخِ پرنور کا
ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

گر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پُرشور کا
لوں صریرِ خامہ سے میں کام بانگِ صور کا

لطف جاتا ہے سرودِ نالۂ پُرشور کا
خونِ دل پینا ہے یہ کھانا مجھے سیندور کا

نزع میں بھی دھیان تھا اُس نرگسِ مخمور کا
مجھ کو شربت میں مزا آیا مۓ انگور کا

وادیٔ ظلمت میں اپنی دخل کب ہے نور کا
مہر اک شعلہ سا ہے سو بھی چراغِ دور کا

تیرے کوچے میں تنِ لاغر ترے رنجور کا
اک غبارِ ناتواں ہے کاروانِ مور کا

باندھوں میں مضموں جو اپنی شور بختی کا کوئی
ہو زمین شعر میں عالم زمینِ شور کا

میں وہ ہوں نخچیر جس کو دیکھتا ہے وقتِ ذبح
دیدۂ حسرت سے حلقہ جوہر ساطور کا

اس نزاکت پر نظر کرنا کہ وہ رشکِ پری
بال بھی باندھے جو مستی پر تو زلف حور کا

دل کا یہ احوال ہے غم سے ترے اے مستِ ناز
جیسے مرجھایا ہوا دانہ کوئی انگور کا

تفتہ دل وہ ہوں کہ آگر داغِ سوزاں پر مرے
اُڑ گیا مرہم کے پھاہے سے اثر کافور کا

گر ترے فریادیوں کے نامۂ پیچیدہ کو
لب پہ رکھکر پھونکئے پیدا ہو نالہ صور کا

حق تو یوں ہے یہ انانیت عجب غماز ہے
قصہ پہنچایا زبانِ دار پر منصور کا

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سب سے تیز ذہن
تین دن جائے اگر تعویذ میری گور کا

زخم میرا ہے وہ ایذا دوست خوں رونے لگے
مُنہ سے گر جرّاح کے سُن پائے نام انگور کا

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو اُسی روزن میں گھر زنبور کا

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

ن دفن ہیں کشتے تمھاری سرد مہری کے جہاں

تو ہو بعد از مرگ بھی گر اے محبت دستگیر
استخواں سے ہو مری دستہ ترے ساطور کا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہ کن بھی نام اک مزدور کا

بل بے وحشت اب تلک بھی شاخِ آہو کی طرح
پیچ کھاتا ہے دھواں میری چراغِ گور کا

دیکھنا زہر آبِ پیکانِ محبت کا اثر
چشمِ افعی بن گیا روزن ہر اک ناسور کا

کھینچے مانی اُس پری کی کیونکہ تصویرِ کفک
جمع ہو جب تک نہ رنگ سُرخ روئے حور کا

تیرے قامت سے جو ہو برپا قیامت سرو پر
کام لے منقار سے فریاد قمری صور کا

ذوق راہِ عشق وہ کوچہ ہے جس کی خاک میں
ہے دُرِ تاجِ سلیماں بیضۂ مور کا

لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

بیمار اترا صورتِ تصویر نہالی
کیا اُٹھے سرِ بسترِ غم اُٹھ نہیں سکتا

آئی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ ردیدہ تہ خاک ہمارا
سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغ معاصی ہر اُس دامن تر سے
جوں حرف سر کاغذ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر تیر اتیسے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا

پردہ در کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گراں بار ہے جو زادِ سفر بھی
اے راہ روِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دُنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

[illegible]

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

واہ کیا مرہمِ زخمِ دلِ بیتاب بنا
آب سے نشترِ سرِ تیز نئے تیزاب بنا

نہ بجھے اشک کے دریا سے مری سوزشِ دل
گرچہ دے شعلۂ جوالہ کو گرداب بنا

دلِ بیتاب کو ہم سینہ میں ٹھیرا نہ سکے
شعلہ خور دیکھتے ہی تجھ کو وہ سیماب بنا

پوچھیں گر مجھ سے مئے عشق ہوئی کب سے تلخ
کہوں جس دن سے فلک کا سیہ زہر آب بنا

چشمِ مخمور کا ہوں کس کی میں کشتہ یارب
کہ مری خاک سے بھی جامِ مئے ناب بنا

تیرہ روزی نے مری مہرِ جہانتاب کا نور
جب اُڑایا تو وہیں کرمکِ شب تاب بنا

ہائے پچتاتا ہوں کیوں اُس سے کیا میں نے بگاڑ
کہ جواب پھرتا ہوں اس طرح سے بیتاب بنا

سرمۂ چشمِ عزیزاں نہ بنا میں اے چرخ
کیا بنا خاک غبارِ دلِ احباب بنا

آیتِ سجدہ ہے حق میں مرے ہر جوہرِ تیغ
ہے خمِ تیغ فقط کیا خمِ محراب بنا

خالِ عارض ہے جو ہندوئے خدا رس تو کیا
ہم سیہ بختوں کے حق میں تو ہے قصاب بنا

اپنے جلسوں میں جلاتے ہیں مجھے میرے حبیب
میں ہوں اک شمع پئے محفلِ احباب بنا

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ مرا دیدۂ پُرآب بنا

آہ کے ساتھ جو نکلا شررِ آتشِ دل
چرخ پر جا کے وہ خورشیدِ جہانتاب بنا

جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوق

تو کہیں موج بنا اور کہیں گرداب بنا

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اُس کا ہم پایہ نہ پایا

مقدر ہے یہ گر سود و زیاں سے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام
خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

کیا تھا یا نہ تھا سب ہم پہ گذرا
فلک لوٹے کیا اپنا نہ پایا

سراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے
کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا

کرے کیا سیر دل ملکِ فنا کی
کہ اس بازار میں سودا نہ پایا

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا
غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

تہِ خنجر ترے بسمل نے ہے ہے
ذرا قابو تڑپنے کا نہ پایا

ترے مجنوں کی تربت پر جنوں نے
بگولے کے سوا سایا نہ پایا

فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو
نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

چراغِ داغ لے کر دل میں ڈھونڈا
اثر پر صبر و طاقت کا نہ پایا

وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے
خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

یہی ہر دم ہے زخمِ دل کو رونا
دہن پایا لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

سوا تیرے خطِ مشکیں کے کوئی
مجرّب نسخۂ سودا نہ پایا

وہ بولے دیکھ کر تصویرِ یوسفؑ
سُنا جیسا اُسے ویسا نہ پایا

کیا ہم نے سلام اے عشق تجھ کو
کہ اپنا حوصلہ اتنا نہ پایا

نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل
ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا

مرے طالع کی وہ گردش ہے جس سے — فلک نے بھی قرار اصلا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا،

سنہ ۱۲۴۵ھ میں ایک بزرگ کہن سال حافظ علی شاہ نام اورنگ آباد ملک دکن سے وارد دہلی ہوئے۔ اور قلعہ میں آبدارخانہ شاہی کے داروغہ کے پاس اُترے۔ وہاں اُستاد سے ملاقات ہوگئی۔ وہ صاحب دل صاحب معرفت شخص تھے۔ طرز معاشرت سے معلوم ہوا کہ خاندانی رئیس تھے۔ امیری چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ زبان سے نہ کہتے تھے مگر ٹیپو سلطان۔ اور خوانین مدراس کے معرکے اس طرح بیان کرتے تھے گویا آپ شامل تھے۔ باوجود اس کے علوم رسمی سے آگاہ تھے شعر و سخن کا مذاق بہت خوب تھا۔ اُستاد سے تھوڑے عرصہ میں بہت رابطہ بڑھ گیا۔ اُستاد نے والد مرحوم کو بھی ملایا۔ شاہ موصوف اُستاد کی غزلیں اپنی بیاض میں لکھواتے تھے اور فرمائشیں کر کے کہواتے تھے۔ طبیعت کی آزادی اور بے نیازی اُن کی خداداد سلطنت معلوم ہوتی تھی کئی مہینے کے بعد دفعتاً غائب ہو گئے۔ بستر بچھا اور جزدان سرہانے رکھا رہ گیا۔ اُس وقت اکبر شاہ بادشاہ تھے۔

سنہ ۱۲۶۰ھ میں دفعتہً پھر آئے۔ کہا ہمیں نثار علی شاہ خطاب ہوا ہے۔ یہ زمانہ تھا کہ دلی کے ٹوٹے پھوٹے تخت پر بہادر شاہ بیٹھے تھے۔ اُستاد کی شاعری اوج پر اور اختیارات موج پر تھے۔ خلیفہ اسمٰعیل کو سرکار شاہی سے کئی خدمتیں حاصل تھیں انہی میں تیول شاہی (املاک و باغات) بھی سپرد تھے۔ شاہ صاحب ہمارے ہاں اُترے مگر فرمایا کہ فقیر کو شہر میں رہنا مناسب نہیں کوئی جگہ باہر ہونی چاہیے کہ اوقات میں خلل نہ ہو۔

شہر کے اندر کابلی دروازہ کے پاس ہی اُستاد مرحوم رہتے تھے۔ باہر ایک باغ بادشاہی تیس ہزاری[۱۵] باغ مشہور تھا۔ عمارات قدیم تعمیر تھیں۔ زیب النسا بیگم

۱۵؎ اب تیس ہزاری باغ صاف ہوگیا۔ وہاں ریل چلتی ہے۔ زیب النسا کی قبر کا نام و نشان نہیں رہا۔ میں نے خود پڑھا ہے
نادِ خلقی جنتی۔ عالمگیر کی بیٹی ... [illegible]

خواہر عالمگیر کی قبر بھی تھی۔ اس میں ایک بالاخانہ مرمت کر کے درست کروا دیا۔ شاہ صاحب وہیں جا رہے۔ شام کو اُستاد اور والد مرحوم وہاں جاتے تھے۔ شیخ ناسخ کا پہلا دیوان اُنہی دنوں ہمارے ہاں آیا تھا۔ اُس کی غزلوں میں سے کوئی مصرع لیتے تھے اُسی پر اُستاد غزل کہتے تھے۔ والد مرحوم لکھتے تھے۔ شاہ صاحب سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ عجب گلزار صحبت تھی ✤

یوں تنِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کوئیں کی تہ میں تارا[1] ہو گیا

میرے نالوں سے جو پانی سنگ خارا ہو گیا
کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہو گیا

ذکر دنیا نفسِ مردہ کو ہوا آبِ حیات
مر کے یہ سیماب پھر زندہ دوبارہ ہو گیا

دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے
میں نے جانا ماہِ تاباں پارہ پارہ ہو گیا

ہر حبابِ بحر کی کھل جائے گی تارا سی آنکھ
عکس افگن گر رُخِ روشن تمہارا ہو گیا

رشک سے اُس زلف کے کیا مشک ہی کیسہ ہے خوں
بلکہ جل کر سوختہ عنبر بھی سارا ہو گیا

شیخ نے افطاریوں کے تر نوالے کھائے خوب
ہے مگر روزوں کی گرمی سے چھوارا ہو گیا

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر اُمید وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

ہے مقام زندگی زیرِ دمِ شمشیر مرگ
ہو گیا جس طرح کوئی دم گذارہ ہو گیا

دل تیرے زخموں کی ترقی سے عجب پائی بہار
آگے تھا صد برگ یہ گل اب ہزارہ ہو گیا

ظلمتِ عصیاں سے میرے بن گیا شب روز حشر
آفتاب اک نیزہ پر دُمدار تارا ہو گیا

چشمِ مستِ یار میں آخر ہوئی سُرخی عیاں
لو ہمارا خونِ پنہاں آشکارا ہو گیا

ذوق اس بحرِ فنا میں کشتیٔ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

[1] کوئیں کی تہ کا تارا۔ یا کوئیں کا تارا۔ زبان اُردو کا محاورہ ہے۔ کبھی نہایت گہرے اور پُرانے کوئیں میں دیکھتے ہیں۔ اندھیرے کے سبب سے کچھ نظر نہیں آتا غور کے بعد پانی چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنے والا کہتا ہے۔ وہ پانی تارا چمکتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں بڑا عمیق کنواں ہے۔ ہمارا دیکھا ہوا ہے۔ پانی دور کہیں تہ میں تارا چمکتا ہے ✤

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

اب جان پہ آفت ہے جو آئے ہو دوبارہ
اک بار تو غارت دل و دیں ہو ہی چکا تھا

سینہ جو کیا چاک تو واں کچھ بھی نہ پایا
کیا جل کے جگر خاک کہیں ہو ہی چکا تھا

برہم اُسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر زلف
اے دل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا

ہوتا جو نہ پیوند زمیں تیری گلی میں
آسودہ یہ دل زیرِ زمیں ہو ہی چکا تھا

آنے سے مرے ٹھیر گئے آپ وگرنہ
جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا

جو خط میں لکھا اُس نے وہ لکھنے سے بھی پہلے
مکتوب سرِ لوحِ جبیں ہو ہی چکا تھا

بے بدرقۂ مرگ توقف رہا ورنہ
تجھ بن سفرِ جانِ حزیں ہو ہی چکا تھا

کیا ہوتا جو سمجھاتے اُسے جا کے مرے دوست
دشمن کا سخن ذہن نشیں ہو ہی چکا تھا

کیا دیکھتے ہم یوسفِ کنعاں کو کہ اپنا
منظورِ نظر ایک حسیں ہو ہی چکا تھا

کیا گرم تپش ہوتا تڑپ کر ترے آگے
میں سر دہِ خنجرِ کیں ہو ہی چکا تھا

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا
حکمِ ازلی ذوق یوہیں ہو ہی چکا تھا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی سنہ ۱۲۶ ہجری :-

محفل میں شورِ قلقلِ مینائے مُل ہوا
لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قُل ہوا

دریائے غم سے میرے گذرنے کے واسطے
تیغِ خمیدہ یار کی لوہے کا پُل ہوا

پروانہ بھی تھا گرمِ تپش پر کھُلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

آئی تھی اندروں کی نہ ہرگز سمجھ میں بات
آوازہ گو بلند مثالِ دہل ہوا

جن کی نظر چڑھا ترا رخسارہ آتشیں
اُن کا چراغِ گور نہ تا حشر گل ہوا

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی
جزوِ ضعیف محرمِ اسرارِ کل ہوا

اُس بن رہا چمن میں بھی میں ذوق دلخراش
ناخن سے تیز تر مجھے ہر برگِ گل ہوا

چند شعر اس غزل کے عالمِ شباب میں کہے تھے وہی زبان زدِ خلایق تھے۔ پھر سنہ ۱۲۶۰ھ میں تیس ہزاری باغ میں غزل پوری کی تھی :-

اس تپش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سر تا بقدم دل ہوتا

آسماں دردِ محبت کے جو قابل ہوتا
تو کسی سوختہ کا آبلۂ دل ہوتا

چھوڑتا ہاتھ سے ہرگز نہ کبھی بسملِ شوق
دامنِ برق اگر دامنِ قاتل ہوتا

چینِ پیشانی اگر تیری نہ ہوتی زنجیر
نالہ دیوانہ تھا جو پابہ سلاسل ہوتا

کرتا بیمارِ محبت کا مسیحا جو علاج
اتنا دق ہوتا کہ جینا اُسے مشکل ہوتا

ذبح ہونے کا مزہ جانتا گر صیدِ حرم
آپ گردن پہ چھُری پھیر کے بسمل ہوتا

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زُلف ہوتا ترے رخسار پہ یا تِل ہوتا

آتا کیوں مصر میں کنعاں سے نکل کر یوسف
جذبۂ شوقِ زلیخا جو نہ کامل ہوتا

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

دل گرفتوں کی اگر خاک چمن میں ہوتی
تو جہاں دیکھتے ہو غنچہ وہاں دل ہوتا

آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

ہوتی گر عقدہ کشائی نہ یداللہ کے ہاتھ
ذوقِ حل کیونکہ مرا عقدۂ مشکل ہوتا

جو نہ رنگِ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا
تو زمیں نہ زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا

کسی رنج کش کو دیتا تو کچھ اُس کو سود ہوتا
دلِ سخت کاش کا فرحجر الیہود ہوتا

تری بزم میں نہ جلتا کہ تجھے بھی بو پہنچتی،
جو یوہیں تھا دل کو جلنا تو بلا سے عود ہوتا

جو نہ ہو اُمیدِ واشد نہ ہو دل گرفتہ غنچہ
کہ قبول تنگ رہنا نہیں بے کشود ہوتا

لبِ نازک اُس کا کیونکر کہو بارِ حرف اُٹھائے
کہ جو صدمۂ تبسم سے بھی ہو کبود ہوتا

یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِّ راہ ہوتی
تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

تہِ خاک ہو تا ظاہر جو سُلگنا اپنے دل کا
تو شرارِ سنگِ تربت میں بھی اپنے دود ہوتا

جو ہے سرگذشتہ اُس کو نہیں دینا سر کا مشکل
کہ وہ سر بکف نہ ہوتا جو نہ دست جود ہوتا

جو رقیب سر بکف ہیں کبھی ہوتے سر بکف بھی
ترے جاں نثار کا گر انھیں دست جود ہوتا

ترے در کی جبہہ سائی اگر اشک اپنے کرتے
سرِ قطرہ قطرہ پر اک اثرِ سجود ہوتا

کوئی زہر نوش مجھ سا نہیں پہنچا ذوق ورنہ
شجرِ زقوم دوزخ میں بھی خشک دُود ہوتا

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا
جو چڑھا مُنہ اُسے میدانِ اجل میں مارا

اُس نے جب مال بہت ردّ و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا

اجل آئی نہ شبِ ہجر میں اور تو نے فلک
بے اجل ہم کو تمنّائے اجل میں مارا

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

عشق کے ہاتھ سے نے قیس بچا نے فرہاد
اِس کو گردشت میں تو اُس کو جبل میں مارا

دل کو اُس کاکل پیچاں سے نہ بل کرنا تھا
یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا

کھینچ کر عشق جفا پیشہ نے شمشیرِ جفا
پہلے اک ہاتھ مجھی پر تھا ازل میں مارا

چرخ بدبیں کی کبھی آنکھ نہ پھوٹی سو بار
تیر نالے نے مرے چشمِ زحل میں مارا

ہم نے جانا تھا جبھی عشق نے مارا اُس کو
تیشہ فرہاد نے جس وقت جبل میں مارا

اُس لب و چشم پہ ہے زندگی و موت اپنی
کہ کبھی دم میں جلایا کبھی پل میں مارا

کون سُنتا ہے تری زلف میں دل کی فریاد
کہ مسلماں کو ہے کافر کے عمل میں مارا

عرس کی شب بھی مری گور پہ دو پھول نہ لائے
پتھر اک گنبدِ تربت کے کنول میں مارا

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا ۔ پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
دینا دل مضطر کو تری کچھ تو نشانی ۔ پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا
کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے ۔ جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا
آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرت دیدار ۔ پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا
کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینہ میں غم سے ۔ کس وقت مرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا
میں جاتا جہاں سے ہوں تو آتا نہیں یاں تک ۔ کافر تجھے کچھ خوف خدا کا نہیں آتا
ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں ۔ شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں ۔ جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا
آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت ۔ پھر دیکھئے آنا بھی ہے دم یا نہیں آتا
غافل ہے بہارِ چمنِ عمرِ جوانی ۔ کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا
ساتھ اُن کے ہوں میں سایہ کی مانند و لیکن ۔ اس پر بھی جدا ہوں کہ لپٹنا نہیں آتا
دُنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے ۔ آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا
دل مانگنا مُفت اور یہ پھر اُس پہ تقاضا ۔ کچھ قرض تو بندہ پہ تمہارا نہیں آتا
بیجا ہے دلا اُس کے نہ آنے کی شکایت ۔ کیا کیجے گا فرمائیے اچھا نہیں آتا
جاتی رہے زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے ۔ افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا
جو کوچۂ قاتل میں گیا پھر وہ نہ آیا ۔ کیا جانے مزہ کیا ہے کہ جیتا نہیں آتا
آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے ۔ جب تک نہیں آتا اُسے غصہ نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ساتھ آہ کے شب دل سے وہ پیکاں نکل آیا ۔ تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا
شب ہم نے تہیّہ جو کیا توبہ کا ساقی ۔ مغرب سے سحر مہر درخشاں نکل آیا
تنگ آکے جو دم تن سے نکل جائے تو جانو ۔ زنداں سے کوئی قیدیٔ زنداں نکل آیا

ہاتھ آئے نہ قسمت کے سوا گوہرِ مقصود — دریا سے تہی پنجۂ مرجاں نکل آیا
رات آہ میں یوں سینہ سے اک شعلہ سا چمکا — میں سمجھا تو یہ جانا دلِ سوزاں نکل آیا
ناقوس! یہ کس دل سے کیا نالۂ جاں سوز — یاں دل کا دھواں آہ سے پیچاں نکل آیا
عصمت بھی ہے کیا شے کہ الگ یوسفِ کنعاں — درہائے مقفل سے عزیزاں نکل آیا
ہے کوچۂ قاتل میں شہادت کا دفینہ — جب کھودا کنوؤاں گنجِ شہیداں نکل آیا

دل رکھ کے کہیں ذوقؔ کا ہم بھول گئے تھے
تھا گُم وہ کئی دن سے مگر ہاں نکل آیا

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا — وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا
نہ کیوں تیرے دانتوں سے جھوٹا ہو موتی — کہ دعوے کیا تھا صفائی کا جھوٹا
ہوا جنت دامن سے جب اُن کے سچّا — ہوا ہاتھ اپنی رسائی کا جھوٹا
بناتا ہے آئینِ الفت میں تجھ کو — یہ شیوہ تری بے وفائی کا جھوٹا
ترا قول ہاتھوں میں چمکا رہا ہے — نگیں حنائی دلربائی کا جھوٹا
اُڑا کر کیا رنگ الفت کو رُخ نے — یہ ساغر ہے کہربائی کا جھوٹا
مرے لیکے پیوے اگر موت پاوے — یہ پانی مریضِ جدائی کا جھوٹا
مجھے نعمتِ خلد ہووے جو پاؤں — ترے در پہ ٹکڑا گدائی کا جھوٹا
گئے طاقِ ابرو میں تھے حضرتِ دل — سو دعوےٰ ہوا پارسائی کا جھوٹا

خدا جانتا ہے ذوقؔ جھوٹا کہ سچّا،
نہیں ہے ولے آشنائی کا جھوٹا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی :-

یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا — جھلسے ہیں منہ شکار کیے پر بھی شیر کا[1]

[1] شکاریوں کا قاعدہ ہے کہ جب شیر کو شکار کرتے ہیں تو وہیں سے گھاس پھوس کا پولا بنا کر آگ دیتے ہیں اور شیر کا منہ جھلس دیتے ہیں کہ کوئی بدنیت اس کی مونچھ کا بال نہ لے جائے اور اپنے دشمن کا خون نہ کرے۔ ان بالوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کترتے ہیں اور پان کی رگوں میں چبھو کر کھلا دیتے ہیں۔

جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں
کانٹا سمجھیے سیہ کا یا گلِ کنیر کا

مجنوں کی روح دشت میں مانندِ گردباد
کرتی طواف تھی ترے مجنوں کے ڈھیر کا

ہیں اُس صنم کے ملنے کے رستے تو سینکڑوں
پر کوئی راست ہے کوئی رستہ ہے پھیر کا

دم آچکا لبوں پہ ہے آنکھوں میں انتظار
بے دید جلد آکہ نہیں وقت دیر کا

چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک
گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب ٹھنگیر کا

کوٹھے پہ اُن کے خوب بچے آج رات کو
تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا

ہوتے زبانِ حال سے مضموں ہیں وہ ادا
جس میں نہ اختلاف زبر کا نہ زیر کا

زیبا ہے ذوق خرقۂ درویش مرد کو
برقع کبھی نہ پائے گا نامرد شیر کا

یہ غزل بھی وہیں لکھی تھی:-

دریائے اشک چشم سے جس آن بہ گیا
سُن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہ گیا

بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہو کے دل کے ساتھ
سینہ سے تیرے تیر کا پیکان بہ گیا

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چُلّو پانی میں ایمان بہ گیا

ہے موجِ بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ
بیچارہ مشتِ خاک تھا انسان بہ گیا

دریائے عشق سے دمِ تحریر حالِ دل
کشتی کی طرح میرا قلمدان بہ گیا

یہ روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
نالہ سا ایک سوئے بیابان بہ گیا

تھا تو بہا میں بیش پر اُس لب کے سامنے
سب مول تیرا لعلِ بدخشان بہ گیا

کشتی سوارِ عمر ہیں بحرِ فنا میں ہم
جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہ گیا

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان[1] بہ گیا

[1] ہندوستان میں محاورہ تھا کہ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا۔ یا کسی کام کا وقت گذر جاتا تو کہتے تھے۔ اب وہ پانی ملتان بہ گیا یعنی اب نہ ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دریائے راوی جو لاہور کے نیچے بہتا ہے ملتان کی جانب سے چل کر پنجاب کے اور دریاؤں سے ملتا ہوا دریائے شور میں جا پڑتا ہے۔ پھر اُسے ادھر آنے کا موقع نہیں۔ پس جب کسی امرِ فوت شدہ کے باب میں کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہ گیا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دریا کے بہاؤ کی طرح اس کا موقع گذر گیا اب نہ ہو سکیگا ✦

یہ غزل شیخ ناسخ کی غزل پر کہی تھی۔ مطلع

سرو عاشق ہو گیا اُس غیرت شمشاد کا
غل مچایا قمریوں نے ہے مبارکباد کا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

روز مرگِ عاشقِ ناشاد ہے شادی کا دن
ہے بجائے شور ماتم غل مبارکباد کا

آنچ سے تلوار کی ڈرتا نہیں یہ سخت جاں
کشتہ کرنا سخت ہی مشکل ہے اس فولاد کا

کچھ گداز عشق میں ہوتا اثر تو دیکھتے
کوہ کے چشموں سے ہوتا خوں رواں فرہاد کا

ہو سبق آموز شوخی گر پری کو چشم شوخ
کام لے موجِ نگہ سے سیلیٔ اُستاد کا

سوزشِ غم سے ہزاروں داغ جل جل کر پڑے
ہو گیا میرا کفن جامہ مگر حداد کا

سرو موجِ آبِ جو سے پائے در زنجیر ہے
دیکھ لو آزاد کو یہ حال ہے آزاد کا

آبداری ہے تری تلوار میں یا ہو گیا
آب زہرہ سخت جانی سے مری فولاد کا

یاد کرتا ہے مجھی کو پہلے وقتِ قتل عام
کیوں نہ میں کشتہ ہوں اے قاتل تری اس یاد کا

میں ہوں چکر میں لگی جس دن سے دنیا کی ہوا
حال میرا ہے بعینہ آسیائے باد کا

سر ترے کشتہ کا دیکھے گا نہ ہرگز روئے خاک
لے اُڑے گا شوق پابوسی اُسے جلاد کا

سلسلہ میں لفظ و معنی کے نہ آیا دل کبھی
ابجدِ عالم میں گویا تھا الف آزاد کا

یوں تو ہے اُستادِ شیطاں پر کہوں کیا تجھ کو دل
تو تو شاگردی میں بھی اُستاد ہے اُستاد کا

ذوق حیراں ہے بہت فکر کشادِ کار میں
یا علی مشکلکشا یہ وقت ہے امداد کا

مرے سینہ سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا
دہانِ زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا

مرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہ رو نکلا

پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں
اگر خورشید نکلا تیرا گرم جستجو نکلا

مئے عشرت کا تھا خمخانۂ افلاک پر دھوکا
کہ تھا لبریز غم اس خمکدہ سے جو سبو نکلا

ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا
رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا

کہیں تجھکو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

خجل اپنے گناہوں سے ہوں میں یاں تک کہ جب رویا
تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سرخرو نکلا

گھسے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹے سرِ سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

اُسے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو،
جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا

جب نیم جاں ہوں کوچۂ قاتل میں لوٹتا
قاتل ہے لوٹنے پہ مرے دل میں لوٹتا

لیلیٰ کے شوقِ وصل میں مجنوں کو دیکھنا،
کیا کیا ہے راہِ ناقۂ محمل میں لوٹتا

غیروں سے دیکھ دیکھ تری گرمجوشیاں
میں آگ پر ہوں رشک سے محفل میں لوٹتا

دی لب نے تیرے غنچہ کو اکسیرِ مسکرات
گل ہو کے ہے جو پائے عنادل میں لوٹتا

کعبہ کا رُخ ہے اور ترے دردِ فراق سے
میں اے صنم ہوں پہلی ہی منزل میں لوٹتا

دل کا سا ہوتا گر دُرِ غلطاں کو اضطراب
پھرتا تمام دامنِ ساحل میں لوٹتا

سودائیوں کے دل پہ تری یاد زُلف ہیں
اک سانپ سا ہے قیدِ سلاسل میں لوٹتا

کِس کِس مزے سے لوٹتے ہیں میکدہ میں مست
ہے ایک کے جو ایک مقابل میں لوٹتا

بے آبِ تیغ۔ ماہیٔ بے آب کی طرح
اے ذوق دل ہے سینۂ بسمل میں لوٹتا

یہ غزل نا تمام ہے عین عالم شباب کے شعر ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ قافیئے اور مضمون ہیں ہمارے خیال میں۔ کبھی کہیں گے +

عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا
گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا

جلوہ ہو کیونکہ خاکیہ تابِ عتاب کا
جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا

اے گلرخو نہ چھیڑنا دامن سحاب کا
دیکھو چھلکتا ہے کٹورا گلاب کا

اُس گل بغیر طوطیِ بسمل سے کم نہیں
سبزہ مزارِ عاشقِ پُر اضطراب کا

صد پارہ دل ہے گنجفۂ عشق ہو گیا
اور ہر ورق پہ نقش ہے حکمِ آفتاب کا

ہے دل جلوں کے واسطے یہ نامہ بر تو خوب
اڑنا مگر محال ہے مرغ کباب کا

ٹپکے اگر عرق گل رخسار سے ترے
دریا میں ہر حباب ہو شیشہ گلاب کا

اے آفتاب تیرے رخ تابناک سے
کیا کیا چمک رہا ہے ستارا حباب کا

ہوتا ہے دل جلوں سے کہیں ذوق ضبط آہ
موج دخاں سے ضبط نہ ہو پیچ و تاب کا

نالہ جب دل سے چلا سینہ میں پھوڑا اٹکا
چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

جلد آ وعدۂ دیدار پہ اے وعدہ خلاف
کبتک اٹکا رہے دم آنکھوں میں تھوڑا اٹکا

توسن عمر رواں ہر نفس اڑتا ہی رہا
کبھی میدان فنا میں نہ یہ گھوڑا اٹکا

بھاگا مجنوں مری وحشت سے بگولے کی طرح
سامنے میرے ذرا بھی نہ بھگوڑا اٹکا

لے گئے مر کے بھی اے ذوق رکاوٹ دل میں
ہاتھ تلوار کا جو یار نے چھوڑا اٹکا

عالم شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا اور آخر عمر میں آ کر غزل پوری کی ہے سنہ ۱۲۶۰ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ہے مے خواروں کا
دیجے اک جام تو ہے یارا بھی یاروں کا

اتنا تو شور و فغاں ہو کہ چمن میں بلبل
خرمن گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

ہوں رگیں حلق بریدہ کی ہما سے خونبار
گر تماشا انہیں منظور ہو فواروں کا

اے ستمگر جو ترے تیر نہیں تشنۂ خوں
تو کھلا رہتا ہے منہ کس لئے سوفاروں کا

کیوں نہ ہر تار میں دل ہو دیں گرفتار کہ زلف
جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا

دیں گے جاں بوسۂ لعل نمکیں پر ہم بھی
جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا

بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق
روسیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا

نالہ اس شور سے کیوں میرا دُہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سُنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

دے دعا وادیٔ پر خار جنوں کو ہر گام
داد یہ تیری ہے اے آبلہ پائی دیتا

لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا

پنجۂ مہر کو بھی خونِ شفق میں ہر صبح
غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا

روشِ اشک گرا دیں گے نظر سے اک دن
ہے ان آنکھوں سے یہی مجھ کو دکھائی دیتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جا کر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

کون گھر آئینہ کے آتا اگر وہ دل میں
خاکساری سے نہ جاروبِ صفائی دیتا

ساغرِ مے بھی ترے کشتۂ انداز کو یار
بوسۂ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا

مُنہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر انھیں آکے خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ گر دیکھتا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ کی بہار ہے:-

نکتہ اُس بت سے کبھی پوچھیں گے ہم ایمان کا
ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا

جھوٹ ہی جانو کلام اُس رہزنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا اُمید
تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

جو دل پُر آرزو سے نکلا نالہ عشق میں،
ایک پُتلا تھا سراپا حسرت و ارمان کا

بن گیا جوشِ محبت سے ہمارے سینہ میں
ماہیٔ دریائے خوں جوہر ترے پیکان کا

جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتا ہے انسان بھی
پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

یہ تپِ غم کی ہے شدت اس ترے بیمار کو
یومِ راحت بھی ہے حق میں اُس کے دن بحران کا

اے اجل تکلیف مت کر کیا کرے گی آن کر
ہو چکا پہلے ہی کشتہ ہے کسی کی آن کا

ہو سکے آلودہ دامن پاک دامن کس طرح
اے زلیخا چھوڑ دامن یوسفِ کنعان کا

نفس بے مقدور کو قدرت ہو گر تھوڑی سی بھی
دیکھ پھر سامان اس فرعونِ بے سامان کا

دیکھنا اے ذوق ہونگے آج پھر لاکھوں کے خوں
وہ جماتا ہے لبِ لعلیں پہ لاکھا پان کا

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارہ کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کے
تری زلفوں نے مشکیں باندھکر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دیکر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر زخمی ہے اور دل ٹوٹتا ہے تم نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

دل سنگین خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچے
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

دل بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

میں وہ شہید ہوں لبِ خندانِ یار کا
ہنستا رہے چراغ بھی میرے مزار کا

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ہو راز دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

آنا ہے گر تو آؤ کہ سینہ سے جل کے اب
آنکھوں میں آ کے ٹھیرا ہے دم انتظار کا

ہو پاک دامنوں کو خلش گر سے کیا خطر
کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

پوچھے ہے کیا حلاوتِ تلخابۂ سرشک
شربت ہے باغِ خلدِ بریں کے انار کا

پہنچیگا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر
مکتوب شوق اُڑ کے ترے بیقرار کا

توبر ہیں ہے مگر ہے مری آنکھ سوئے در
لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا

ہے دل کی داؤگھات میں مژگان سے چشم یار
کرتی ہے قصد ٹٹی کی اوجھل شکار کا

قاصد لکھوں لفافہ کو خطِ غبار سے
تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

اُس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دُور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

یہ بھی نیس ہزاری باغ کا چمن ہے :۔

خطر ہے خوں سے دل پائمال کے کیسا
بچا ہے دیکھنا دامن سنبھال کے کیسا

بغل سے لے گئے دل کو نکال کر وہ صریح
جو مانگا تو کہا آنکھیں نکال کے کیا؟

کسی کے رخنہ ہے جوگی جو چشم ہندو زاد
تو اس کو گھیرے ہیں مژگان بال کے کیسا

نمود خال کی دیکھو تو زیر ابروئے یار
ستارا نکلا ہے نیچے ھلال کے کیسا

ہماری نعش پہ ہنگامہ کیوں ہے لے قاتل
اُٹھا ہے قصہ یہ بعد انفصال کے کیسا

شب فراق میں اُس مہ جبیں کے انجم چرخ
مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کے کیسا

ہزار دم ہیں اُسے یاد تو نے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر تجھ کو ٹال کے کیسا

پرانی غزل تھی۔ میرے سامنے دوبارہ بنائی تھی :۔

میں کہاں سنگِ در یار سے ٹل جاؤنگا
کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

نالہ کہتا ہے کہ تا چرخ زحل جاؤنگا
بلکہ میں توڑ کے اِس کو بھی نکل جاؤنگا

آج اگر راہ نہ پاؤں گا تو کل جاؤنگا
کوچۂ یار میں پر سر ہی کے بل جاؤنگا

دل سے کہتا ہوں کہ تو ساتھ نہ لے جا مجھکو
جاکے میں واں ترے قابو سے نکل جاؤنگا

مدرسہ میں بھی اگر جاؤں گا تو جائے کتاب
شیشۂ بادہ لئے زیر بغل جاؤنگا

دیکھ کر کوئے صنم کہتا ہے یہ پاس ادب
ہوں جو خورشید تو یاں سر کے بل جاؤنگا

دل یہ کہتا ہے مجھے روزن سینہ سے نکال
ورنہ خوں ہو کے میں آنکھوں سے نکل جاؤنگا

سرد مہروں سے فلک ڈال نہ پالا کہ بن آگ
نخل سرمازدہ کی طرح سے جل جاؤنگا

آنکھ سے اشک صفت مجھ کو گرا کر نہ اُٹھا
دل نہیں ہیں کہ سنبھالے سے سنبھل جاؤنگا

کہتا وحشت سے یہ ہے جامۂ پیری میرا
دیکھ کپڑا ہوں پُرانا ابھی چل جاؤنگا

عقل سے کہدو کہ لائے نہ یہاں اپنی کتاب
میں ہوں دیوانہ ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

اے صنم در پہ نہیں دیر میں جا بیٹھوں گا
کچھ میں بچہ تو نہیں ہوں کہ مچل جاؤنگا

قیس و فرہاد کو بتلاؤں گا کچھ عشق کی راہ
اب کے میں گر طرف دشت و جبل جاؤنگا

گر پڑا آگ میں پروانہ دم گرمیٔ شوق
سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤنگا

کہتا پیراہن گُل ہے یہ نزاکت سے نسیم
ہاتھ مجھ کو نہ لگانا کہ نکل جاؤنگا

سُنتے ہو! زاہد و ناصح جو ہیں سمجھاتے مجھے
کیا بدل دیوینگے یہ۔ ادمیں بدل جاؤنگا

میں وہ مشتاق شہادت ہوں کہ سر دینے کو
پائے کو باں تہِ شمشیر اجل جاؤنگا

جنبشِ برگ صفت باغ جہاں میں اے ذوق
کچھ نہ ہاتھ آئے گا تو ہاتھ تو مل جاؤنگا،

اس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہو گیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی مُنہ زرد ہو گیا

سو بار مر کے عاشق جاں باختہ ترا
لڑنے کو پھر کھڑا ردششِ نرد ہو گیا

مجنوں بھی دشت گرد تھا مانند گردباد
جب خاک اُڑائی ہم نے تو وہ گرد ہو گیا

اس صید تیر خوردہ کو تو نے کیا نہ ذبح
آخر تڑپ تڑپ کے یونہیں سرد ہو گیا

آ اے مرے چمن کے گلِ ورد دیکھ لے
عاشق کا رنگ زرد زرد و رد ہو گیا

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق

نامرد مرد - مرد جواں مرد ہو گیا

پرانی غزل بھی میرے سامنے نظر ثانی کی :-

پانی طبیب دیگا ہمیں کیا بجھا ہوا
ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

کہتے تھے آفتاب قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا

چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

پھر دل میں آہ سرد ہوئی میرے شعلہ ور
لو پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا

پہلے نشانہ کرتا وہ بندوق کا مجھے
پر تھا مرے نصیب سے توڑا بجھا ہوا

جل کر اگر بجھا بھی دل سوختہ مرا
یوں جل اٹھیگا جیسے کہ کولا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینہ میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

استاد کے مسودہ سے جس دن یہ غزل میں نے لکھی۔ فرمایا کہ عجب اتفاق ہوا۔ ایک دن میاں نثار علی شاہ تشریف لائے۔ حسب عادت غزل کی فرمائش فرمائی۔ میں نے بھی یہ غزل کہی تھی۔ انھیں سنائی۔ خوش ہوئے۔ بہت عنایت کی اور چلے گئے۔ دوسرے دن سنا کہ چلے ہی گئے۔ کاش کوئی اور غزل سناتا +

جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہوں رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا

تری گلی سے نکلتے ہی اپنا دم نکلا
رہے ہے کیونکہ گلستاں سے عندلیب جدا

الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں
کہ دم بخود ہے موذن جدا خطیب جدا

تمھارا درد جدائی نہ ہو جدا مجھ سے
حروف درد میں ہو عکس طبیب جدا

ہے اور علم و ادب مکتب محبت میں
کہ ہے وہاں کا معلم جدا ادیب جدا

ہجوم اشک کے ہمراہ کیوں نہ ہو نالہ
کہ فوج سے نہیں رہتا کبھی نقیب جدا

فراق خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک
الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے مگر
نہ کر سکا مرے دل سے غم حبیب جدا

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم۔ سب سے عنقریب جدا

یہ بھی تیس ہزاری باغ کی غزل ہے سنہ ۱۲۶۰ ہجری:-

شکر پردہ ہی میں اُس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

تھا نہ پامال رہِ عشق کی تربت کا نشاں
بارے تعویذ تو نقشِ کفِ پا نے رکھا

تلخ کامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر
استخواں کو مرے منہ پر نہ ہما نے رکھا

آشیاں باغ میں ڈھونڈا جو قفس سے جا کر
ایک تنکا بھی نہ تھا بادِ صبا نے رکھا

دل جو دیوانہ نہ تھا میرا تو پھر کیوں اس کو
پابزنجیر تری زلفِ دوتا نے رکھا

آنکھیں دیدار طلب گور سے آئی ہیں نکل
دستہ نرگس کا نہیں میرے سرہانے رکھا

پئے ناواقفِ رہ پہلے ہے رہبر موجود
گور سے آگے قدم دیکھ عصا نے رکھا

ناتواں ہیں نہ تن زار مرا دیکھ سکا
خوب دھوکے میں اُسے تارِ قبا نے رکھا

نہ رکھی خوبی و زشتی سے غرض آئینہ وار
گھر میں مہمان جسے اہلِ صفا نے رکھا

کیا تماشا ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا
نام مجنوں مرا اُس ہوش ربا نے رکھا

شربت مرگ سے محروم نہ رہتا کبھی خضر
لیک ناکام اُسے آبِ بقا نے رکھا

نہ گیا مر کے بھی اُس مصحفِ رخسار کا شوق
کہ رہا گور پہ قرآن سرہانے رکھا

بے نشاں پہلے فنا سے ہو جو ہو تجھ کو بقا
ورنہ ہے کس کا نشاں ذوق فنا نے رکھا

سر نشہ دولت کا بد اطوار کو جب آن چڑھا
سر پہ شیطان کے یاں اور بھی شیطان چڑھا

حق کے ڈھب پہ نہ کوئی بجز انسان چڑھا
اس کے قابو پہ چڑھا تو یہی نادان چڑھا

توسن وحشت اگر اپنا زمیں چڑھ جائے
ابھی افلاک کو دیں خاکِ بیابان چڑھا

دل نے کب دیکھا نہ تو کو جو ابرو کا فر
لے کے شمشیر ہے سینہ پہ مرے آن چڑھا

دیکھنا ملت و دیں دونوں ہیں برباد کہ آج
باد کے گھوڑے پہ وہ دشمن ایمان چڑھا

مصحفِ رخ پہ ترے رنگ سنہرا تیرا
واہ کیا خوب ہے سونا سرِ قرآن چڑھا

آنکھ تو لڑ گئی پر کوئی بھی اس دل کے سوا
فوجِ مژگاں کے نہ منہ پر سرِ میدان چڑھا

بوالہوس جاتے ہیں گر دام میں آہو کی طرح
چلّۂ ابرو کی کماں پر ترے قربان چڑھا

دیکھو قسمت کا لکھا اُس نے پڑھا خط سو بار
دھیان پر میرا نہ مطلب کسی عنوان چڑھا

نگہ یار کو دے سونپ متاعِ دل و جاں
چور قسمت سے نظر اپنی نگہبان چڑھا

سنگِ سرمہ میں سیہ تاب تھی وہ تیغِ نگاہ
گردشِ چشم نے پر دی ہے غضب سان چڑھا

کشتۂ دستِ حنا بستہ ہوں ان ہاتھوں سے
کبھی دو پھول تو لا کر تو مری جان چڑھا

اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی
پانی سو نیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

حضرتِ عشق کی درگاہ میں آ کر اے ذوقؔ
دل و دیں دیتے ہیں سب گبر و مسلمان چڑھا

ہنچہ جب مول وہ بانکا جواں لینے لگا
موت کے جی میں مزے یہ نیم جاں لینے لگا

تیر چٹکی میں لیا اُس نے پئے جانِ عدو
رشک میرے دل میں کیا کیا چٹکیاں لینے لگا

نام میرا اُن کے مجنوں کو سنبھالی آ گئی
بیدِ مجنوں دیکھ کر انگڑائیاں لینے لگا

مجھ کو ہر شب ہجر کی ہونے لگی جوں روزِ حشر
مجھ سے یہ کس دن کے بدلے آسماں لینے لگا

ہے جو غنچوں کا چٹکنا انگلیوں کی سی چٹک
یہ بلائیں کس کی باغ اے باغباں لینے لگا

جس لئے کی اس میکدہ میں بیعتِ دستِ سبو
وہ قدم تیرے لب اے پیرِ مغاں لینے لگا

لے کے آئینہ جو دیکھی حسن کی اپنے بہار
اپنے بوسے آپ وہ غنچہ دہاں لینے لگا

آ کے دل پر جب کبھی کرنے لگے تیغِ نگاہ
چشم کی گردش سے وہ کارِ فساں لینے لگا

ذوقِ حسن و عشق روشن ہو گیا سب بزم پر
شمع کی گلگیر جو منہ میں زباں لینے لگا

موت اسکو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور
یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

رات کو اے ذوقؔ اس کے نوکِ مژگاں کا خیال
تن پہ ہر مو سے مرے کارِ سناں لینے لگا

پہنچا آبِ تیغِ قاتل تابہ سر اچھا ہوا
اے دلِ مجروح لے تو غسل کر اچھا ہوا

ایک دن بالکل نہیں اے چارہ گر اچھا ہوا
داغ اِدھر تازہ ہوا گر زخم اُدھر اچھا ہوا

کم نہو اُس آبِ خنجر کی الٰہی آبرو
آج مُدت میں ہمارا حلق تر اچھا ہوا

آرہے گا دشت میں لیلےٰ ترے ناقہ کے کام
ہو گیا مجنوں جو کانٹا سُوکھ کر اچھا ہوا

روز کہتا تھا مزہ مجھ کو چکھا دے عشق کا
بھر دیا لون اُس نے دل کو چیر کر اچھا ہوا

سُن کے مجنوں نے مرے شورِ جنوں کو یہ کہا
واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا

بندھ گیا اُس موکمر کا جب کہ مضمونِ کمر
ہو گئی مضموں میں دقتِ شعر پر اچھا ہوا

مجھ کو صدقے کر اگر ہے بدمزہ تیرا مزاج
یہ اِدھر صدقہ دیا تو نے اُدھر اچھا ہوا

ہاتھ تو اونچا پڑا تھا یار کی شمشیر کا
زخم پر قسمت سے میری کارگر اچھا ہوا

کھچ گیا میری طرف سے اور بھی دلبر کا دل
واہ وا جذبِ محبت کا اثر اچھا ہوا

قتل کرتا ہے ترا بسمل سے یہ کہنا کہ لو
اب تو دامن بھی ہوا لوہو سے تر اچھا ہوا

نامہ بر جانا ہے جا جلدی چلی جانِ حزیں
دیر مت کر ساتھ تیرے ہم سفر اچھا ہوا

آئینہ خانے میں عالم کے سمجھ لے یہ مثال
تا تجھے جانیں کہ یہ صاحب نظر اچھا ہوا

ہے بُرا تو ہی اگر آیا نظر تجھکو بُرا
تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا

ذوق کے مرنے کی سُن کر پہلے تو کچھ رُک گئے
پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر۔ اچھا ہوا

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے وہ شوخ کب آیا
اگر جہلم کو بھی آیا تو ہم جائیں گے اب آیا

چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ عیش و طرب آیا
بہاریں خوب لوٹیں گے اگر وہ غنچہ لب آیا

خلافِ وعدہ سے میں تیرے کل تو جاں بلب آیا
نہ آیا آج بھی گر تو تو اے ظالم غضب آیا

عجب حیرت میں ہوں جب سے نظر وہ خال لب آیا
دہن اُس کا عدم ہے اور عدم میں نکتہ کب آیا

نوید اے تشنہ کامی بار آبِ خنجرِ قاتل
گلو تک میرے اور زخمِ گلو کے تا بلب آیا

تامل سمجھیو ذوق طپیدن۔ دیکھئے کیا ہو
کہ اب تک ذبح کرنے کا نہیں قاتل کو ڈھب آیا

وہ مستِ ناز لیکر مجھ سے میرے شیشۂ دل کو
ہوا خوش اس قدر گویا کہ ہاتھ اُسکے حلب آیا

نوشتہ سے ہوا ایک حرف بھی ہرگز نہ بیش و کم
جو پیشانی میں تھا لکھا ہوا وہ پیش سب آیا

برنگ غنچۂ خونیں ہنسے کیا اس گلستاں میں
بھر آیا منہ میں خوں گر اک تبسم زیرِ لب آیا

وہ آئیں یا نہ آئیں میں نہیں رنجیدہ دل اُن سے
مگر یہ رنج ہے کیوں رنج اُن کو بے سبب آیا

لگائی زلف کو شانہ نے جو اُنگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی او بے ادب آیا

ترے ڈر سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا

میں اپنے ذوق کے قرباں کہ مستی میں محبت کی
بلایا کس نے اس کو جب یہ آیا بے طلب آیا

اُتارا تو نے سرِ تن سے گر اس شامت کے مارے کا
تو بھولوں گا نہ میں احساں ترے تنکا اُتارے کا

مرے طالع میں ہے کیا کام اے گردوں ستارے کا
چمک جاتا ہے کافی آتشِ دل کے شرارے کا

ستارے دیکھ کر موتی تمھارے گوشوارے کا
کہیں گے ہے ہمارا نور صدقہ اُس ستارے کا

نفس ہے جادۂ عمرِ رواں جس طرح سے گذرے
یہاں پوچھے ہے اے گمراہ کیا رستہ گذارے کا

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اُس کے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

ترا ہر موئے مژگاں دل کو انگشتِ اشارت ہے
سمجھنے والا مجھ سا چاہیے پر اس اشارے کا

ملے اکسیر گر اس کشتۂ خوں سے میں نہ لوں ہرگز
مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا

سفید پھول دل ہوں چاندنی کے پھول کیا مجھ کو
دکھا دو خندۂ دنداں نما اُس ماہ پارے کا

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

مرے گھر میں تو ہو ماہِ سریع السیر جا لے
کیا غیروں میں پیدا حکم کیونکر قطب تارے کا

سہر راہنمائیں ہوں مہیا ہے سفر لیکن
برنگِ اشکِ مژگاں منتظر ہوں اک اشارے کا

گنہ رحمت سے اُس کی بخشوائے دل نے رو رو کر
چھڑک کر ہم نے بیچا نفع پر سودا خسارے کا

ڈھلکتا ہے مثالِ دانۂ تسبیح کیوں منکا؟
کہ جب ٹھیرا سفر دنیا سے کیا کام استخارے کا

فقط تارِ نفس کا ذوق خطِ جادۂ فانی ہے

پئے عمرِ رواں کیا چاہیئے رستہ گذارے کا

نالہ ہے اُن سے بیاں دردِ جُدائی کرتا ۔ کام قاصد کا ہے یہ تیرِ ہوائی کرتا
پنجۂ شانہ کو دیتا ہے فلک کب ناخن ۔ جانتا ہے کہ یہ ہے عقدہ کشائی کرتا
دیکھتا اُس بتِ مغرور کا گر جاہ وجلال ۔ کبھی فرعون نہ دعوائے خدائی کرتا
خاک آئینہ سے ہے نام سکندر روشن ۔ روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا
نہیں گوش شنوا باغِ جہاں میں غافل ۔ ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
بند آنکھیں کیئے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے ۔ ہے تر نقشِ قدم چشم نمائی کرتا
سوز دل کون بُجھائے کہ نہیں چشم میں اشک ۔ پر ہے کچھ خونِ جگر کار روائی کرتا
بیٹھ رہیئے تو قفس ہے عجب آرام کی جائے ۔ پر ہے بے چین ہمیں شوق رہائی کرتا

ذوق اُس پائے نگاریں کا جو ہے وصف نگار
اشک خونیں سے ہے کاغذ کو حنائی کرتا

پُرانی غزل بھی نظر ثانی میں نئی ہوئی :-

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا ۔ کہ نیچے آسماں کے اک نیا اور آسماں ہوتا
ابھی ٹھنڈا بھلا کیونکر شہید تفتہ جاں ہوتا ۔ کوئی دم شمع مردہ میں بھی ہے باقی دھواں ہوتا
کہے ہے مرغِ دل اے کاش میں زاغ کماں ہوتا ۔ کہ تا شاخِ کماں پر اس کی میرا آشیاں ہوتا
عزاداری میں ہے کس کی یہ چرخِ ماتمی جامہ ۔ کہ جیب چاک کی صورت ہے خطِ کہکشاں ہوتا
نہ ہوتی دل میں گر کاوش کسی کی نوکِ مژگاں کی ۔ تو کیوں حق میں مرے ہر موئے تن مثلِ سناں ہوتا
نہ رکھتا گر نہ رکھتا منہ پہ دانہ یہ مریضِ غم ۔ مگر تیرا میسر بوسۂ خالِ دہاں ہوتا
اگر جی کھول کر میں تنگنائے دہر میں روتا ۔ تو جوئے کہکشاں میں بھی فلک پہ خوں رواں ہوتا
بگولا گر نہ ہوتا وادیٔ وحشت میں اے مجنوں ۔ تو گنبد ہم سے سرگشتوں کی تربت پہ کہاں ہوتا
ترے خونیں جگر کی خاک پر ہوتا اگر سبزہ ۔ تو مثلِ موئے مژگاں اُس سے پیہم خوں رواں ہوتا
رکاوٹ دل کی قاتل کے بوقتِ ذبح ظاہر تھی ۔ کہ خنجر تھا مری گردن پہ رُک رُک کر رواں ہوتا

نہ کرتا ضبط میں گریہ تو اے ذوق اک گھڑی پل میں
کٹورے کی طرح گھڑیال کے غرق آسماں ہوتا

لڑکپن کی غزل تھی نظر ثانی نے اصلاح کی:-

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
یہ حسرتِ پابوس نکل جائے، تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے
لینے کو خبر اس کی اجل جائے تو اچھا

کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زلفِ سیہ فام
سانپ اُس کو اگر آکے نگل جائے تو اچھا

اے گریہ نہ رکھ میرے تنِ خشک کو غرق آب
لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

تاثیر محبت تو عجب حب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

فرقت سے تری تارِ نفس سینہ میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمرِ نخلِ محبت
یہ سینہ پھپولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تری اُٹھنے کا نہیں پھر
یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یوں ہی ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یہاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہے قطع رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
یاں شمع نمط سر ہی کے بل جائے، تو اچھا

کہے ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا ۱۲۶۰

مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کب آنے دے
جو ذکر آئے نہ دے اپنے روبرو میرا

نہ پہنچا گردنِ جاناں تک اور ٹوٹ کے ہائے
پڑا گلے میں مرے دستِ آرزو میرا

نہیں بلا سے کوئی یار عشق میں اے دل
کہ غمگسار ہوں میں تیرا اور تو میرا

مقام وجد میں آئیں ابھی ملائک عرش
جو میکدہ میں سُنیں شور ہائے و ہُو میرا

عجب نہیں ہے مری سوزشِ محبّت سے
کہ تارِ شمع ہو ہر ایک تارِ مو میرا

برنگِ آئینہ چشمِ پُر آب سے میرے
گرا نہ اشک کیا پاسِ آبرو میرا

نہ آئے اے نگہ یار تجھ کو کچھ غیرت
کہ آگے تیغِ اجل کے ہو سرفرو میرا

کروں میں کیا کہ گریبان صبح کے مانند
نہیں ہے چاکِ جگر قابلِ رفو میرا

نظر جو آتا ہے اب تک فلک کا رنگ سیاہ
بڑا تھا سایۂ بختِ سیہ کبھو میرا

ہمیشہ میں ہوں اسی داؤ گھات میں اے ذوق
کہ رام ہو وہ غزالِ پلنگ خو میرا

نہ ہوا آبِ شہادت سے گلو تر نہ ہوا
مستعد جب وہ ہوا ہائے تو خنجر نہ ہوا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا

بے چراغ اس کو نہ رکھ داغِ الم سے اے عشق
خانۂ دل کوئی ویرانہ ہوا گھر نہ ہوا

ق

کب صبا آئی ترے کوچہ سے اے یار کہ میں
جو حبابِ لب جو جامہ سے باہر نہ ہوا

خونِ رگہائے گلو لاشۂ بے سر سے مرے
آ کے کب جوش پہ فوارہ سے ہمسر نہ ہوا

عشق یہ معجزہ کیسا ہے کہ اس کشتہ کے
موئے سر خلق سے پیدا ہوئے اور سر نہ ہوا

ذوق بیمارِ محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جاں بر نہ ہوا

جان کے دل میں سدا جینے کا ارماں ہی رہا
دل کو بھی دیکھا کیے یہ بھی پریشاں ہی رہا

بعد مردن بھی خیالِ چشمِ فتّاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا

میں ہمیشہ عاشقِ پیچیدہ مویاں ہی رہا
خاک پر روئیدہ میری عشق پیچاں ہی رہا

پستۂ قندی ہے کامِ غیر میں وہ لعلِ لب
پر مرے حق میں تو سنگِ زیرِ دنداں ہی رہا

بندھ سکا ہم سے نہ مضموں اس دہانِ تنگ کا
ہاتھ اپنا فکر میں زیرِ زنخداں ہی رہا

جاہل منکر نہ آئے راہ پر معجزے سے بھی
جہل سے بوجہل اپنے نامسلماں ہی رہا

حلقۂ زنجیر میں بھی دل رہا پا در رکاب
توسنِ وحشت ہمارا گرمِ جولاں ہی رہا

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

جلوہ اے قاتل اگر تیرا نہیں حیرت فزا
دیدۂ بسمل نے کیا دیکھا کہ حیراں ہی رہا

حلقۂ گیسو میں دیکھی کس کے رخسارے کی تاب
شب مہ ہالہ نشیں سر در گریباں ہی رہا

مدتوں دل اور پیکاں دونوں سینہ میں رہے
آخرش دل بہ گیا خوں ہو کے پیکاں ہی رہا

سب کو دیکھا اُس سے اور سب کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

آگے زلفیں دل میں بستی تھیں اور اب آنکھیں تری
ملک دل اپنا ہمیشہ کافرستاں ہی رہا

مجھ میں اُس میں ربط ہے گویا برنگ بو و گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

طلسم طرفہ ترا آنسو نے میرے مردماں باندھا
کہ ہے اک اک گرہ میں حالِ صد بحر و کاں باندھا

ترے جوڑے کے کھلنے نے مرا دل دلستاں باندھا
عجب تقدیر نے عقدہ وہاں کھولا یہاں باندھا

یہ بہتاں کس نے افشائے محبت کا یہاں باندھا
جو بعد از مرگ تو نے منہ کو میرے بدگماں باندھا

ہوئی تشہیر نعشِ اُس ناتواں کی جب تو پاؤں میں
کوئی تار نگاہِ مور جائے ریسماں باندھا

کیا مجنوں مجھے آشفتگیٔ زلف نے کس کی
کہ میرے سر پہ مرغِ شانہ سر نے آشیاں باندھا

ترا ہنسنا جو یاد آیا برنگِ قہقہہ مینا
تو میں نے تار اک رونے کا لے لے ہچکیاں باندھا

تڑپ کر دامنِ زیں کو نہ آلودہ کرے خوں سے
بھلا فتراک سے کیوں تو نے صید نیم جاں باندھا

نہ جھاڑا غیر کو تو نے کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا
مجھی پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بدزباں باندھا

وہ ہوں ناکام سمجھا نامرادی جو مراد اپنی
مرے مرقد پہ حلّہ دشمنوں نے دوستاں باندھا

اُڑا دینگے دھوئیں اک آن میں اس چرخ گرداں کے
اگر چکر دھوئیں نے دل کے زیر آسماں باندھا

فلک وا رستہ پھر لنے دے ہے کوئی پر خروشوں کو
گیا ہی آخرش زنجیر سے پیلِ دماں باندھا

بلا ہوں مضطرب میں بھی کہ مجھ سے برق نے دیکر
حصار اک گرد اپنے شعلۂ جوالہ ساں باندھا

مرا دل آگئے ہی سینہ میں اک پھوڑا سا پکتا ہے
خیالِ خطِ سبز یار نے کیوں برگِ پاں باندھا

دلِ مجروح پر میرے نہ سمجھو داغِ حسرت کا
پر طاؤس اس زخمی نے ہے اے دوستاں باندھا

کہاں دل بھاگ کر جاوے کہ تیرے نخلِ قامت سے
عجب اک گرد نامہ خط نے لے سرو رواں باندھا

تپ سوزِ محبت کے لیئے چارہ نہیں قمری
یہ گنڈہ نیلگوں گردن پہ کیوں اے تفتہ جاں باندھا

سمجھ کر موجِ دریائے فنا کو خنجرِ براں
کفن مثلِ حباب اے ذوق ہم نے سر سے یاں باندھا

بھڑکنا کیا کہوں سینہ میں اپنے آتشِ غم کا
کہ جائے پنبہ ہے ہر داغ پر شعلہ جہنم کا

جہاں میں عرصۂ عشرت سے سوا دہ چند ہے غم کا
کہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

ترے عاشق کو ہے یوں خوشگوار آبِ دمِ خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آبِ زمزم کا

برنگِ طوقِ قمری کوئی نکلے ہے نکالے سے
کمند گردنِ دل ہے جو حلقہ زلفِ پُرخم کا

ترے رخسار کا پرتو پڑے گر عارضِ گل پر
کرے چشمک زنی خورشید پہ ہر قطرہ شبنم کا

سئے جاتے ہیں کس سے زخم اُس تیغِ تبسم کے
کہ یاں کھلتا ہے بخیہ سوزنِ عیسیٰ مریم کا

دلیرانِ محبت کو خلش سے اس کی مژگاں کے
پسِ مردن لحد میں بھی ہے عالم چاہِ رستم کا

خراش سینہ میں اک رہ گیا ہے ٹوٹ کر ناخن
غلط ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ پھاہا ہے مرہم کا

اگر آتش مزاجوں کو حسد ہو خاکساروں پر
تعجب کیا کہ ابلیسِ لعیں دشمن ہے آدم کا

خط اس کا وصل کی دولت کا ہے پیغام اے قاصد
لگا قسمت سے نسخہ ہاتھ یہ اکسیرِ اعظم کا

شہید اے ذوق سینہ میں ہوئی ہیں حسرتیں لاکھوں
مری جو آہ ہے گویا وہ ہے اک نخلِ ماتم کا

یہ گلدستہ تیس ہزاری باغ میں بنایا تھا۔ سنہ ۱۲۶۰ ہجری :-

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

لذت کو تیغِ عشق کی سُن سُن کے بوالہوس
آکر بلغ سا حلق بریدوں میں مل گیا

گر بعدِ فقر پھر سگِ دُنیا ہوا فقیر
کمبخت پاک ہو کے پلیدوں میں مل گیا

آخر کو فیض بعیتِ دستِ سبو سے آج
پیرِ مغاں کے ہیں بھی مریدوں میں مل گیا

دکھلا کے کہکشاں سے فلک چاک سینہ رات
اُس ماہ وش کے سینہ دریدوں میں مل گیا

اُس شکل سے ہوا وہ طلبگارِ دید کا
صاف آئینہ کا نقشہ ندیدوں میں مل گیا

یعنی طلبگارِ دید ۱۲۶۰

حبِ حسینؑ ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حرؑ
تھا گرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مِل گیا

سنہ ۱۲۶۰ھ کی چمن بندی ہے:-

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

کیا قہر ہے وقفہ ہے ابھی آنے میں اُن کے
اور دم مرا جانے میں توقف نہیں کرتا

تا صاف کرے دل نہ مئے صاف سے صوفی
کچھ سودِ صفا علمِ تصوّف نہیں کرتا

دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے
دُنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا

پڑھتا نہیں خطِ غیر مرا واں کسی عنواں
جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا

کچھ اور گماں گذرے نہ دل میں ترے کافر
یا داس لئے میں سورۂ یوسف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

یہ غزل ہے جس پر شاہ نصیر مرحوم سے قطع تعلق ہو گیا تھا۔ (دیکھو صفحہ ۷)

ہر گام پہ رکھے ہے وہ یہ ہوشِ نقشِ پا
ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا

اُفتادگاں کو بے سر و ساماں نہ جانیو
دامانِ خاک ہوتا ہے روپوشِ نقشِ پا

اعجازِ پا سے تیرے عجب کیا کہ راہ میں
بول اُٹھے منہ سے ہر لبِ خاموشِ نقشِ پا

اس رہ گذر میں کس کو ہوئی فرصتِ مقام
بیٹھے ہے نقشِ پا بہ سرِ دوشِ نقشِ پا

جسمِ نزار خاک نشینانِ کوئے عشق
یوں ہے زمیں پہ جیسے تنِ دوشِ نقشِ پا

فیضِ برہنہ پائیٔ مجنوں سے دشت میں	ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوشِ نقشِ پا

پابوس درکنار کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوق اُس کے بآغوشِ نقشِ پا

اب ردیف الف کی وہ غزلیں لکھتا ہوں جن کا حال دیباچہ کے صفحہ ۲۶ میں لکھ چکا ہوں ایسے اشعار اپنے کبھی کسی سے سنتے۔ یا خود یاد آجاتے تو سُنا دیتے۔ اور عجب محبت سے فرماتے۔ یہ ہمارا بچپن کا کلام ہے۔ نظرثانی کریں گے۔ پھر دیوان میں داخل کریں گے۔ اور کچھ کچھ اصلاح کرتے بھی جاتے تھے۔ مگر والد مرحوم کے تقاضوں سے۔ اور میری حاضرباشی سے۔ جس مسودے کو درست کر دیتے تھے۔ نئی غزل مرصع ہو جاتی تھی۔ ہائے۔ وقت تھا کہ گذر گیا۔ یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں۔ اور نہیں پاتا۔ اب جو کچھ ہے یہی غنیمت ہے جیسے ہیں نقل کر دیتا ہوں۔ ضائع ہوئے تو یہ یادگار بھی نہ رہے گی۔ موئی مٹی کی نشانی اسے کہتے ہیں۔ انتہائے کلام تو سب سُن چکے ابتدائے کلام آزاد سے سنو:-

جل اُٹھا شمع نمط تارِ رگِ جاں میرا	آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا
ہلتے دیکھے جو لبِ زخم تو بولا قاتل	آج تیرا ہے دہن اور نمکداں میرا
کر کے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ	دیکھ تر کیجو نہ خوں سے کہیں داماں میرا
اے جنوں! دن سے سوا رات کو روشن کر دے	مہرِ گردوں ہو جو داغِ دلِ سوزاں میرا
خارِ وحشت سے کہو چھوڑ دے دامن دل کا	ہے خطِ جادہ ترا چاک گریباں میرا
دھیان میں آئینۂ رُخ کے گئی جان نکل	رہ گیا ہائے کھلا دیدۂ حیراں میرا
اے جنوں تو بھی ہو دُنیا میں یوہیں خانہ خراب	خاک در خاک کیا خانۂ ویراں میرا
نظمِ معنی کا بکھر جائے ابھی حرف سے حرف	باندھیں گر اہلِ سخن حالِ پریشاں میرا
خندۂ جام کو مینا کے لبوں پر رکھ دو	دیکھو پھر ہنستا ہے کیا کیا لبِ خنداں میرا

اپنا رونا مجھے ہنسنے سے مبارک ہو ذوق
دیکھ خنداں ہو جو وہ دیدۂ گریاں میرا

آغازِ شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کا ایک قلمی دیوان کتب خانۂ آزاد میں موجود ہے اُن کی بھی ایک غزل اسی طرح میں درج ہے:۔

رکھتے تھے جو کشور کسرےٰ و قیصر زیرِ پا　　ہے اُنہی کا آج سر با تاج و افسر زیرِ پا
اے جنوں ہم پا برہنہ۔ گرم پتھر زیرِ پا　　دوپہر ہے۔ سایہ بھی بیٹھا ہے چھپکر زیرِ پا
تم چلو رکھکر جو میرا دیدۂ تر زیرِ پا　　پُل ہوں بحرِ اشک پر مژگاں سراسر زیرِ پا
خاکساری کو ہماری مل گئی اکسیر عشق　　اب تو پارس ہوگا جو آئے گا پتھر زیرِ پا
میری آنکھوں کو ملو تم لے کے تلوؤں کے تلے　　کیوں نشے میں توڑئے۔ ہو رکھکے ساغر زیرِ پا
ہے نمازِ کشتۂ قامت۔ بجائے جانماز　　اے قیامت لا بچھا دامانِ محشر زیرِ پا
زیر دستی پر بھی ہے موذی سے لازم احتراز　　جب دبیگا سانپ کاٹے گا مقرر زیرِ پا
ہیں ترے مجنوں کے مژگاں وادیٔ وحشت کے خار　　راہ آنکھوں کے نکل آئے ہیں چھپکر زیرِ پا
بو نہ گل سیدھی کے گلبن پر شکِ گل کھلوں میں تو　　آکھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیرِ پا
فاتحہ عاشق کا دیتا ہے تو واجب ہے ادب　　اپنے کفش پا کو رکھ لے پا سے باہر زیرِ پا
میں ہوں وہ کشتی شکستہ بحرِ الفت میں صبا　　ایک تختہ رہ گیا ہے جس کے بچ کر زیرِ پا

قصرِ تن کو ذوق سب غارت کرے گا ایک دن
چونٹیوں کا پھر رہا ہے یہ جو لشکر زیرِ پا

اُسی عالم میں یہ غزل ایک مرشدزادہ[۱] کی فرمائش سے کہی تھی۔ اُنھیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا۔ اُسی کے لئے غزل کہوائی تھی۔ نظرثانی اس پر بھی نہیں ہوئی:۔

دشمنِ جاں یک بیک سارا زمانہ ہوگیا　　ہائے تاثیرِ محبت یہ ستم کیا ہوگیا
تم میں تھا یا مجھ میں تھا دل۔ پھر کہو کیا ہوگیا　　دل کے جانے کا تو عالم کو اچنبھا ہوگیا
جس کو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہوگیا　　سُوکھ کر ایسا ہوا دُبلا کہ کانٹا ہوگیا

[۱] مرشدزادہ۔ اہلِ قلعہ کے محاورہ میں عموماً شہزادہ کو کہتے تھے۔ اور جو شہزادے قرابتِ قریب کے لحاظ سے ایک وقت میں دعوے دار سلطنت کے ہو سکتے تھے وہ سلاطین کہلاتے تھے۔ مثلاً شاہ موجود کا چچا بھائی۔ وغیرہ وغیرہ ✦

ہم نے اُن سے دوستی کی وہ ہیں کرتے دشمنی
دیکھو کیا سوچا تھا ہم نے اور وہاں کیا ہو گیا

بادۂ گلگوں نے رنگِ رُخ کو روشن کر دیا
پہلے تھا گلرنگ مکھڑا پھر بھبو کا ہو گیا

جب اُٹھا تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شورِ ماتم تھا کہ اک عالم میں برپا ہو گیا

تم نے کل عزمِ سفر کا ہم کو بھیجا تھا پیام
لو سفر یاں آج دُنیا سے ہمارا ہو گیا

پھر چلو اے حضرتِ دل ہو چکا ملنا بس اب
آج گھر میں غیر کے پھر اُن کا رہنا ہو گیا

مرنا جینا اک جہاں کا ہے نگاہوں پر تری
جس نظر سے آنکھ بھر کر تو نے دیکھا ہو گیا

خط لکھا مجھ کو تو اُس میں نام بھی پورا نہ تھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

وہ تو خود شعلہ تھا۔ جب میں نے کہا ہو شعلہ خو
اس لطیفہ سے بھڑک کر آگ دونا ہو گیا

غیر کے گھر۔ ہم سے تو اُڑ کر اگر پہنچا تو کیا
تیرے جانے کا تو اک عالم میں چرچا ہو گیا

گرم ہو کر آتا ہے مُنہ پر مرے طفلِ سرشک
دیکھ۔ کیا اے چشمِ تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

کر دیا تیغِ نگہ نے ایک عالم کا ہے خوں
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہو گیا

یادِ زلفِ عنبریں میں رات یہ آہیں بھریں
گنبدِ گردوں سیہ سارے کا سارا ہو گیا

ذوقؔ نے ہو زلف کو چھیڑا تو نے مجھ سے قسم
تو نے خود چھیڑا اُسے اور برہم اتنا ہو گیا

یہ بھی ابتدائی مشق تھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
اے صنم پر ترا پتھر نہ پگھلتے دیکھا

ضعف سے سینہ میں آتا ہے مرا دم جس طرح
ریگ کو شیشۂ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

تھا میں اس باغ میں نخلِ گلِ آتشبازی
پھولتے دیکھا مگر آہ نہ پھلتے دیکھا

اُس رُخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہر کو فروغ
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

اے صبا جنبشِ سبزہ کے سوا کس کو بھلا
مور چھل گورِ غریباں پہ ہے جھلتے دیکھا

جو چڑھا اوجِ فنا پر وہ گرا سایہ نمط
پاؤں اس کوٹھے پہ ہے سب کا پھسلتے دیکھا

کوئے جاناں میں ہے دل جیسا گیا قابو سے
ہم نے بچے کو بھی ایسا نہ مچلتے دیکھا

زلف کہتی ہے درِ گوش سے دکھلادے کوئی / گر سرِ بیضہ سے ناگن کو ہو ٹلتے دیکھا
کج ادائی گئی کب ہم سے ترے ابرو کی / شاخِ آہو سے ہے خم کس نے نکلتے دیکھا
اشک کو لیتا نہ دامن میں تو کیا کرتا میں؟ / گاہوارہ میں یہ لڑکا نہ سنبھلتے دیکھا
جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آبِ حیات / تجھ کو دانتوں پہ مسی ہے کبھی ملتے دیکھا
کوئے جاناں سے ہم اور خلد سے آدمؑ نکلے / اُن کو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا

خانۂ دل کے سوا آتشِ غم سے لے ذوق
سامنے آنکھوں کے گھر کس نے ہے جلتے دیکھا

برنگِ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا / کہ ہے بباغ جہاں میں غنچہ، تصویر دل میرا
خط و عارض کا ترے رات دن جو دھیان رکھتا ہے / تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر دل میرا
ورق بر سینہ کے کھینچا ہے تارِ اشک سے مسطر / کرے گا شرحِ دردِ عشق کچھ تحریر دل میرا
سنبھالے رکھ ذرا اے آسماں دیکھ اپنے دامن کو / وہیں پر کھینچتا ہے نالۂ شبگیر دل میرا
بتوں کی سرد مہری نے کھلا دی زعفراں لیکن / کرے کیا گرمجوشی ہو گیا کشمیر دل میرا
تری چشمِ فسوں گر نے کہاں سیکھا تھا یہ جادو / کیا ہے اک نگہ میں اے پری تسخیر دل میرا
تصور میں کسی تیغ نگہ کے کشورِ الفت / ہوا تسخیر کر کے صاحبِ شمشیر دل میرا
بتو! گر حسن کی دولت سے تم ہو بن گئے پارس / ہوا ہے کیمیائے عشق سے اکسیر دل میرا
کبھی منت کی زنجیر اُن کو پہنے اُس نے دیکھا تھا / ہے اب تک پہنے تارِ اشک کی زنجیر دل میرا
نشاں تو رہنے دے قاتل ذرا سا خوں لگا دوں میں / قیامت میں ترا تا ہووے دامنگیر دل میرا

بتوں کا عشق ہے گر ذوق تو ساری خدائی میں
کرے گا شہر اک دن مجھے تشہیر دل میرا

یہ بھی ابتدائی مشق تھی۔ شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے ان دنوں کی غزلوں میں انھوں نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب جوشِ طبع عالمِ طفولیت میں ہوتا ہے تو ایسے ذوق شوق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اُسی عہد کے خیال ہیں۔

اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

تم نے دشمن ہے جو اپنا ہمیں جانا اچھا!
یارِ ناداں سے تو ہے دشمنِ دانا اچھا

پھول گل مہندی کے لالا کے نہ ہاتھوں میں ملو
خونِ عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

طائرِ جاں کے سوا۔ کوچۂ جاناں کی طرف
نامہ بر کون ہے جو کیجے روانا اچھا

طاقِ ابرو کے تصور میں دلا کھینچ نہ آہ
سمت کعبہ پہ نہیں تیر لگانا اچھا

بدگماں دیکھو کچھ اس میں بھی نہ ڈالیں رخنہ
روزنِ در سے نہیں آنکھ لڑانا اچھا

آتشِ عشق ہے سینہ میں دبی۔ دیکھ اے چشم
اب نہیں دامنِ مژگاں کا ہلانا اچھا

بیٹھ رہ کر کے قناعت۔ کہ بشکلِ مہِ نو
چھوڑی آدھی تو نہیں ساری کو جانا اچھا

مرغِ دل نے نگہِ یار سے پوچھا اُڑ کر
پھر بھی کہنا کہ لگاتے ہیں نشانہ اچھا

یاں تو دم میں نہیں دم۔ اور وہ لئے تیغِ دودم
کہتے ہیں دیکھو نہیں دم کا چرانا اچھا

طرّۂ شمشاد دکھاتا ہے بڑی زلفوں کو
لاؤ آرہ کہ یہی اس کو ہے شانہ اچھا

ق

ساقیا ابر ہے آیا تو بڑھا خُم پہ ہاتھ
کہ گھٹا میں نہیں ہمت کا گھٹانا اچھا

جل کے گر قطرۂ خوں دل کا ہوا اشک آلود
تو نہیں نیچے مژگاں سے گرانا اچھا

گردشِ عمر میں تسبیحِ سلیمانی کا
آج اک ہاتھ لگا ہے مرے دانا اچھا

سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو،
ہے تو چاہت کے جتانے کو بہانا اچھا

چاہے ہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

کیجو مشاطہ نہ سبزہ گوشِ دلبر سے جدا
بدنما ہے گر رکھیں مینا کو ساغر سے جدا

دل مرا یارب نہ ہو زلفِ معنبر سے جدا
سر جدا ہو تن سے یہ سودا نہ ہو سر سے جدا

لکھے شرحِ سوزشِ ہجراں جو تیرا بیقرار
ہوں تڑپ کر جوں شرر ہر نکتہ دفتر سے جدا

فندقِ پائے نگاریں کا ہوں میں سودا زدہ
قطرۂ خوں بھی نہ ہو گا نوکِ نشتر سے جدا

شیشۂ دل میں ہے کیا چمکا شرارِ عشقِ یار!
شیشہ گر رکھ تو بھی شیشہ کو نہ اخگر سے جدا

خطِ شرحِ ناتوانی ہو گیا اُڑتے ہی آہ
جوں پرِ کمزور بازوئے کبوتر سے جُدا

حضرت آدمؑ کو شیطاں نے نکالا خلد سے
غیر نے ہم کو کیا ہے کوئے دلبر سے جُدا

ذوقؔ ہے ترکِ وطن میں صاف نقصِ آبرو
بکتے پھرتے ہیں گہر ہو کر سمندر سے جُدا

نظرِ ثانی سے نور نہیں پایا ہے۔

سخت دل اور اشکِ تر۔ دونوں بہم۔ دونوں جدا
ہیں رواں دو ہمسفر۔ دونوں بہم۔ دونوں جُدا

میں نہ چکوا ہوں نہ وہ چکوی پھر آخر کس لئے
رہتے ہیں شب تا سحر دونوں بہم۔ دونوں جُدا

وصل کی شب نکہتِ گُل کی طرح ہم اور وہ
رہتے ہیں باہمدگر۔ دونوں بہم۔ دونوں جُدا

شکلِ عکس و آئینہ۔ تیرا خیال اور میرا دل
آئینے ہیں سیمبر۔ دونوں بہم۔ دونوں جُدا

ذوقؔ ہیں سینہ میں اوراقِ جلاجل کی طرح
دل جگر باشور و شر۔ دونوں بہم دونوں جدا

اُسی عالم کا کلام ہے :۔

لعلِ لب و دندانِ صنم کا دل نے جب سے خیال کیا
صُمٌّ بُکمٌ کہکے ہے گویا ہم نے زباں کو لال کیا

لیگا دلا اس عشق سے کیا تو۔ جس نے ہے کوہ و صحرا میں
مجنوں کا وہ حال کیا۔ فرہاد کا ہے وہ حال کیا

پھرتا ہے تو اے چاند کے ٹکڑے لسکہ شب و روز آنکھوں میں
دل نے روشن ہو کے شب فرقت کو ہے روز وصال کیا

آتشِ گل ہوئی روشن وہاں۔ یہاں چمکا ہمارے دل کا جنوں
موسمِ گل نے کیا ہنگامہ گرم ہے اب کے سال کیا

سادہ رخوں سے کی جو محبت۔ تیری ہی تھی یہ سادہ دلی
منہ چڑھ کر اُس شوخ کے اپنا کالا منہ لے خال کیا

موقلم ایسا لاؤں کہاں سے۔ جو یہ کرے تحریر اُنھیں
حال تو دیکھو تم نے مجھے ہر موئے تن ہے وبال کیا

نامۂ یار کو رکھ دیجو تو ہمدم میرے زیرِ کفن
نامہ جواب نامہ ہے اپنا وہاں جو کسی نے سوال کیا

شمع نمط ہر خارِ جنوں کی اُنگلی لگی جاتی ہے
آبلوں میں تیزاب تھا گر تو ناحق کیوں پامال کیا

آگ ہے دل میں۔ درد جگر میں۔ آنکھ میں آنسو۔ لب پہ فغاں
عشق نے اُس کے ذوقؔ ہمارا دیکھ لو ہے یہ حال کیا

ایضاً از عالمِ بالا۔

ہجر میں کیا کیا مرض ہے سنگدل پیدا ہوا
ہول دل پیدا ہوا۔ آزار سِل پیدا ہوا

تیرہ بختی بھی اُسی دن اپنی روشن ہو گئی
روئے تاباں پر تمھارے جب یہ تل پیدا ہوا

یاالٰہی کیا کہوں تیری عنایت کے سوا
میں نے کیا ایسا کیا جو ایسا دل پیدا ہوا

غیر کے چھلے سے واں تو نے جو گل کھائے تو یاں
داغ تازہ داغ دل کے متصل پیدا ہوا

اُس لبِ لعلیں پہ ہے یہ جلوۂ رنگ مسی
یا کہ نافرمان و لالہ مشتعل پیدا ہوا

کرکے وعدہ رات کو جو راہ سے تو پھر گیا
وہم کیا دل میں یہ اے پیماں گسل پیدا ہوا

خاکساری نے اُسی دن روشنی پائی بھی ذوق
آدمِ خاکی کا جس دن آب و گل پیدا ہوا

رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا
سوز دروں وہی ہے پہ ہوں گے نہ داغ پا

تو باغ میں رکھے اگر اے رشکِ باغ پا
پھر آئے واں خزاں تو وہیں ہو ویں داغ پا

وہ اور میرے گھر میں رقیبوں کو لے کے آئے!
بلبل کے آشیاں میں رکھے حیف زاغ پا

گر کوئے یار میں نہیں ملتا پتا تو پھر
تو کوئے زلف یار میں دل کا سراغ پا

روئے گی پھوٹ پھوٹ کے ہر چشمِ آبلہ
جوشِ جنوں میں رکھ نہ سوئے کوہ و راغ پا

ہم دل جلوں کی خاک پہ رکھیو نہ تو قدم
اس سے تو ڈال دیجو میانِ اجاغ پا

اُس گل سے گر اجازتِ پابوس ہو نصیب
ہو جائے جھوم جھوم کے دل باغ باغ پا

اُچھلے ہے شیخ وجد میں اس طرح بار بار
جس طرح بدلگام ہو گھوڑا چراغ پا

ساقی کا دورِ چشم ہو گر بر کنارِ آب
پائے حباب آبِ رواں سے ایاغ پا

ہے جی میں آب جو منظر اے سروِ خوش خرام
دھو دھو پیا کریں ترے سب بے دماغ پا

اے ذوق کیوں چمن میں وہ گل جائے جسکے ہوں
رنگِ حنا سے غیرتِ صد پاش باغ پا

تجھ کو یوسف سے کیا حسن میں برتر پیدا
گر کیا اس کو پیمبر تجھے کافر پیدا

ہو جہاں کشتۂ مژگاں کا تمھارے مدفن
عوض سبزہ ہو وہاں خاک سے نشتر پیدا

عاجزی سے رہے آئے نہ ہوا میں کمزور
موت ہے چیونٹی کی ہوویں اگر پر پیدا

قصد پرواز کرے کیوں نہ مرا طائرِ روح
تیرے خنجر سے جو پہلو میں ہو نشتر پیدا

خط ترے شعلۂ رخسار پہ ہے معجزِ حُسن
ورنہ ہو سبزہ بھلا آگ پہ کیونکر پیدا

خاکِ دلِ سوختہ یک مشت ہو گر صرفِ چمن
ہوویں غنچوں کی جگہ باغ میں اخگر پیدا

رُخِ روشن پہ عیاں ہیں جو عرق کے قطرے
کیا تماشا ہے کہ دن کو ہوئے اختر پیدا

دُرفشاں وقتِ سخن ہیں لبِ رنگیں تیرے
ہوتے گویا ہیں یہاں لعل سے گوہر پیدا

اشکِ گرم ایک بھی دریا میں جو ٹپکے میرا
جائے ماہی ہو تہِ آب سمندر پیدا

آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے
دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا

سر کٹانے میں مزا وہ ہے کہ جی چاہتا ہے
سر ہر موے بدن ہوئے جدا سر پیدا

بے مکیں ہوتی نہیں زیبِ مکاں کی اے ذوقؔ
خانۂ دل ہے تو کر لو رُخِ دلبر پیدا

غزل مذکورہ بالا بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ مجھے یاد ہے مقطع کا مصرع ثانی کئی طرح کہا اور پسند نہ آیا۔ پھر فرمایا۔ خیر حبیب صاف کرینگے تو سمجھ لیں گے۔ اب آگئے۔ یہ کہکر اور غزل شروع کردی ✤

لکھنؤ میں ایک دن میں اور مولوی رحبب علی خاں ارسطو جاہ کے دونو صاحبزادے میر انیس مرحوم کے پاس گئے۔ اور پہلی ہی ملاقات تھی۔ اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر میں نے مطلع پڑھا:۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ بھٹیریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں بھٹیروں تُو بھٹیریگا

میر مرحوم نے پھر پڑھوایا۔ اور کہا کیا خوب کہا ہے۔ یہ کس کا ہے۔ میں نے کہا شیخ ابراہیم ذوقؔ کا۔ کچھ گفتگو کے بعد پھر کہا کہ وہ مطلع ذرا پھر پڑھیئے گا۔ میر شریف حسن خاں صاحب نے کہا اُنکے شعر آپ کو بھی پسند ہیں؟ اور کچھ تعریف کے لفظ کہے۔ میر صاحب نے کہا جی ہاں۔ دلّی میں میاں خواجہ میر کے بعد یہی ہوئے اور شاعر کون ہوا؟ تھوڑی دیر کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ کھڑے ہو کر اُنھوں نے پھر کہا کہ ذرا وہ شعر پڑھ دیجئے گا۔ میر شریف حسن صاحب نے کہا کہ آپ کو یہ شعر اتنا

پسند کیوں آیا۔ اُنھوں نے کہا۔ دوسرے مصرع میں قافیہ ایسے پہلو سے بیٹھا ہے۔ کہ وہ اُسی کا حق ہے۔ میر شریف حسن صاحب بولے کہ آپ کو کیا حاجت ہے۔ وہ نہ ہوا اور لگالیا۔ فرمایا۔ نہیں۔ وہ اُستاد تھے۔ جو اُنھوں نے کہا وہی لفظ ہو تو ہو اور ہو تو نہیں ہوتا +

ترے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں ٹھیریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ ہیں ٹھیروں نہ ٹھیریگا

جو ننگ کرنا قۂ لیلےٰ سر ہاموں نہ ٹھیریگا
اگر سو کوس ہوگا نجد تو مجنوں نہ ٹھیریگا

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئیگا گنجینۂ قارون نہ ٹھیریگا

گرا ہوں چشم ساقی سے مری تصویر میں بھی گر
بنا دیگا کوئی جام مئے گلگوں نہ ٹھیریگا

سر بالیں اسے ہمدم کوئی دم تو ٹھہرنے دے
ابھی سے کیا کہوں حال دل محزوں نہ ٹھیریگا

بتاتے ہو علاج اشک جو اُس خال کا بوسہ
طبیبو آب نزلہ ہے؟ کہ بے افیوں نہ ٹھیریگا

یہی ہے دل کی بیتابی تو بعد از مرگ بھی قاتل
نہ ٹھیرا ہے زمیں پر عاشق محزوں نہ ٹھیریگا

نہ جنوں اگر آئیگا بیٹھا سر لیلےٰ امروز نہ ٹھیرےگا

قتل کرتی ہے نگہ شہرہ نگاہ یار کا
سچ کہا ہے بار کاٹے نام ہو تلوار کا

گرد کھاؤں عالم اپنے نالہائے زار کا
کام لوں ہر تار مو سے تار موسیقار کا

کوچۂ زلف بتاں میں دل پڑا ہوگا کہیں
پوچھتے کیا ہو ٹھکانا اُس خدائی خوار کا

کعبہ کے دیوار و در سے نور کے جلوے اُٹھیں
گر پڑے سایہ مرے بتخانہ کی دیوار کا

آنسوؤں میں شمع بالیں سے برستے ہیں جو پھول
میں شہید ناز ہوں کس آتشیں رخسار کا

استخواں اس سوختہ جاں کی نہ کھانا زینہار
اے ہما یہ رزق ہے مرغان آتش خوار کا

نالۂ بلبل میں گر پیدا اثر ہو جائے گا
خندۂ گل خندۂ زخم جگر ہو جائے گا

کشتیٔ بحر شہادت ہے ترے بسمل کو تیغ
اب ادھر سے دیکھنا دم میں اُدھر ہو جائے گا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر
کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائے گا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار
آپ ہی تصویر اُس کو دیکھکر ہو جائے گا

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا
دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

دُنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا
وہ دل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا

خورشید وار چرخ پہ چمکا کوئی تو کیا
آخر کو پھر جو دیکھا تو زیر زمیں گیا

دیکھا کہیں نہ اسکو جو دیکھا تو اپنے پاس
میں دُور دور جوں نگہ دُور بیں گیا

کیا کیا مزا نہ تیرے ستم کا اٹھا لیا
ہم نے بھی لطف زندگی اچھا اُٹھا لیا

یوں لائے وا سے ہم دل سیپارہ کرکے جمع
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

جو بار آسمان و زمیں سے نہ اُٹھ سکا
تو نے غضب کیا دل شیدا اُٹھا لیا

سر ہم نے جب سے پائے صنم پر ہے رکھدیا
دونوں جہاں سے دستِ تمنا اُٹھا لیا

مرض الوفات سے تین دن پہلے غزل کہی اور مجھے سُنائی۔ پھر ملازم کو دی کہ اندر کے طاق میں احتیاط سے رکھ دے۔ میں اکثر اُسی وقت اپنی کتاب میں نقل کر لیتا تھا۔ بد ترین اتفاق یہ کہ اُس وقت خیال نہ آیا۔ دوسرے دن بیمار ہو گئے۔ پھر نقل کا کسے ہوش تھا۔ انتقال کے بعد ہر چند ڈھونڈی۔ نہ ملی۔ یہ شعر یاد رہ گئے وہی لکھ دیتا ہوں:۔

کیا کہیں اُس بت سے جو ہم سے زیادہ جانتا
وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا

بولتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشر مست غرور
گر بڑا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا

کرتا ہے جب نالہ اپنا عالمِ بالا کی سیر
ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانتا

آفتابِ حُسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد
پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

کروں درد آشنا کیونکر دل احباب اپنا سا
بلا سے جیسا میں ہوں ڈھونڈلوں بیتاب اپنا سا

ملک سجدہ کریں آدم کو کیا ذرّہ نوازی ہے
دیا بندہ کو لینے اُس نے خود آداب اپنا سا

آنا تو خفا آنا ۔ جانا تو رُلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا ۔ جانا ہے تو کیا جانا

کیا طبع میں جودت ہے جھٹ دل کی اُڑا جانا
ہونٹوں کا یہاں ہلنا ۔ وہاں بات کا پا جانا

اے دل نہ راہ عشق کشادہ سمجھ کے جا | یاں اژدھا ہے ہر خطِ جادہ سمجھ کے جا
عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں دلا | اور اُس کو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

اگر رقصاں نہ سر اپنا سنانِ یار پر دیکھا | تو سر بازی کا اپنے کیا تماشا اپنا سر دیکھا
جہاں بار یک بین و ناتواں ہیں اس قدر دیکھا | ہلال اُنتیسویں کا سب کو منظور نظر دیکھا

رہیگا تشنہ لب سیراب یہ بسمل نہ ہو دیگا | میسر جب تک آب خنجر قاتل نہ ہو دیگا
کوئی اے لالہ رو اس حسن کا قائل نہ ہو دیگا | اگر مہر گواہی میرا داغ دل نہ ہو دیگا

چاندنی نے شب تجھ بن ۔ روپ یہ دکھایا تھا | مجھ کو ماہتابی پر ۔ دُھوپ میں بٹھایا تھا

بعد فراق کوئی دن ۔ ایسا نہ وصل کا ہوا | وہ کہیں تم کو کیا ہوا ۔ ہم کہیں تم کو کیا ہوا

آدمی گر ہو مکدّر کیا قصور ادراک کا | خاک کا پُتلا ہے یہ کچھ تو اثر ہو خاک کا

کیوں کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا | کہہ جو تجھے کہنا ہے ۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ دیکھیں کس طرح ہے روز فرقت دیکھکر جیتا | کہ جو عاشق ہو تیرا تیری صورت دیکھکر جیتا

جب قیامت قد ترا اے رشک گلشن بن گیا | اخترِ صبح قیامت خالِ گردن بن گیا

نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا | ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا وہی در پردہ تھا

بعد قاف عشق تھا جو درس مکتب خانہ تھا	کاف کن کے ہا سبق کیا جانے کیا تھا کیا نہ تھا
مژہ پیکاں کا ہے ٹکڑا کہ سری کا ٹکڑا	مکھڑا ہے چاند کا ٹکڑا کہ پری کا ٹکڑا
بل بے گریہ گل زمیں ہو کر قدم گڑنے لگا	اور قدم اُکھڑے تو کیا دیکھا۔ بھنور پڑنے لگا
دل کی طپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا	طائر جاں جو رشتہ بپا تھا فرصت پاکر چھوٹ گیا
ضبط گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا	چشم کے کوزہ میں دریا بند کر دکھلا دیا
ہاتھ آکر دل وحشی جو کوئی چھوٹ گیا	ہوس صید سے صیاد کا جی چھوٹ گیا
لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کی مژگاں کا	نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا
دل کہاں جس پر گماں ہو غنچۂ تصویر کا	ہے کوئی سینہ میں خوں آلود پیکاں تیر کا
چشم و نگہ کو تیرے بدنام کیوں کرے گا	مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مرے گا
عہد پیری نے بھلایا دوڑ چلنا کودنا	ہائے طفلی کھیلنا۔ کھانا۔ اُچھلنا۔ کودنا
مسجد میں اُس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا	کافر کی دیکھو شوخی۔ گھر میں خدا کے مارا

ہوئے انسان ہم دردِ محبت کے لئے پیدا
فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لئے پیدا

یا رب یہ اس زمانہ کے لوگوں کو کیا ہوا
جس کا بُرا ہو۔ اُن کو یہ کہنا۔ بھلا ہوا

آج غصّہ سے ادھر کو دستِ قاتل اُٹھ گیا
بس بھروسا زندگی کا ہم کو اے دل اُٹھ گیا

آخرِ گِلِ اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہو گیا نامۂ شوق اُن کو سب از بر میرا
کھا گئے ذبح جو وہ کر کے کبوتر میرا

کچھ رازِ نہاں دل کا عیاں ہو نہیں سکتا
گونگے کا سا ہے خواب۔ بیاں ہو نہیں سکتا

سبزۂ خط اے خضرِ طریقت۔ رکھتا رسم الخط ہے جُدا
خطِ بتاں ہے خطِ الٰہی۔ لکھے موسے پڑھے خدا

ردیف بائے موحدہ

پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پسِ جامِ شراب
لب تک اُسکے جو ہوئی دسترس جامِ شراب
جھجکا مستی میں وہ صاحب ہوس جامِ شراب
دل جو ہے جامِ شراب ہوس جامِ شراب
ساغرِ دل کو جو ہو دسترس جامِ شراب
بازگشت اپنی ہے یوں جانبِ قسامِ ازل
دستِ بدمست سے کی ٹوٹ کے فریاد بہت

لب پہ توبہ ترے دل میں ہوسِ جامِ شراب
بن گیا خالِ لب اُس کا مگسِ جامِ شراب
عکسِ خال اپنا جو سمجھا مگس جامِ شراب
اس میں ہے خالِ سویدا مگس جامِ شراب
دستِ ساقی میں ہو وقت ہوس جامِ شراب
جیسے ساقی کی طرف باز پس جامِ شراب
نہ ہوا کوئی بھی فریاد رس جامِ شراب

جوشِ مستی ہے عجب قافلہ جس میں کہ نہیں
بے شکست ایک صدائے جرس جام شراب

محتسب شعلۂ آواز سے جل جائے گا
ٹوٹا گر اک دل آتشِ نفسِ جام شراب

رات میخانہ میں ساقی جو نشے میں بہکا
خس شیشہ کو لگا کہنے خسِ جام شراب

مرغ دل نرگسِ میگوں کی ہے مژگاں میں اسیر
تازہ مضموں ہے جو باندھوں قفسِ جام شراب

دل شکستہ ہوں وہ میں ٹوٹ کے ہو سو ٹکڑے
نام لکھدے جو کوئی میرا پسِ جام شراب

ساقی اس دور میں کب آنکھ چرا سکتا ہے
رات بھر گشت کرے ہے عسس جام شراب

نوشدارو سے بھی بہتر ہے دم رنج خمار
ساقیا شربت فریاد رس جام شراب

بے خبر قافلۂ عیش گذر جاتا ہے
بے زباں ہے جو دہانِ جرس جام شراب

ابلقِ چشم سیہ مست کو تیرے دیکھا
ورنہ اب تک نہ سنا تھا فرس جام شراب

سمجھے میخانہ کی عظمت تو نہ بیٹھے ہرگز
سر جمشید پہ اڑ کر مگسِ جام شراب

نخل مینا سے خدا جانے کہ ساقی کس کو
پہلے پہنچے ثمر پیش رس جام شراب

بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا
عکس مژگاں ترا میکش ہے خس جام شراب

مجھ کو اس بوسۂ دنداں نے پس از بوسۂ لب
دئے نقل نمکیں چند پس جام شراب

ذوق جلدی مئے گلرنگ سے بھر ساغر گل
لب نازک کو ہے اُس کے ہوسِ جام شراب

ہو ہجر مدتوں جو ہو وصل ایک دم نصیب
کم ہوگا کوئی ہم سا بھی الفت میں کم نصیب

ہوں میری خاک کو جو تمھارے قدم نصیب
کھایا کریں نصیب کی میرے قسم نصیب

بہتر ہیں لاکھ لطف و کرم سے ترے ستم
اپنے زہے نصیب کہ ہوں یہ ستم نصیب

ماہی ہو یا کہ ماہ۔ وہ دے ایک یا ہزار
بے داغ ہو نہ دست فلک سے درم نصیب

ہے خوش نصیب عشق میں اے بوالہوس وہی
جس کو کہ غم پہ غم ہے الم پر الم نصیب

غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ ہووے تو
ہر دم ہے تجھ کو سیر وجود و عدم نصیب

سو بار جوں قلم ہو زباں شمع کی قلم
اک حرف ہو نہ مثلِ زبانِ قلم نصیب

مجنوں سیاہ خیمۂ لیلےٰ کے گرد پھر / اے خوش نصیب تجھ کو یہ طوف حرم نصیب
دے جس کو اپنے ہاتھ سے تو ایک جامِ مے / ساقی دے خدا اُسے مثلِ جم نصیب
ایماں ہے تیرا شوقِ لقا جس کو یہ نہ ہو / دیدار اُسے خدا کا نہ ہو اے صنم نصیب
جاتے ہیں کوئے یار کو جو اس میں ہو سو ہو / اے ذوق آزماتے ہیں آج اپنے ہم نصیب

دل عبادت سے چُرانا اور جنت کی طلب / کام چور اس کام پر کس مُنہ سے اُجرت کی طلب
حشر تک دل میں رہے اُس سروقامت کی طلب / یہ طلب ہے اپنی یارب کس قیامت کی طلب
دل سُلگ جائے نہ جب تک اور بھڑک جائے نہ جاں / کم نہ ہو قلیاں کشِ سوزِ محبت کی طلب
واسطے نظارۂ قاتل کے فرصت چاہیئے / اور یہاں فرصت کہاں جز کیجیے فرصت کی طلب
ہو مبارک خضر کو سرچشمۂ آبِ بقا / ہے ہمیں آبِ دمِ تیغِ شہادت کی طلب
دُور رہ اور دیر مست رہ۔ سامنے مثلِ ہلال / شہر میں تجھ کو اگر ہے اپنی شہرت کی طلب
بڑھ گئی ہے عشق میں حرص اسقدر اپنی کہ ہے / غم پہ غم کی آرزو حسرت پہ حسرت کی طلب
جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے / کاسۂ زہر آب سے کرتا ہے شربت کی طلب
ہو کے دل غمزہ کا بسمل ناز پر دیتا ہے دم / کرتا ہے آفت طلب۔ آفت پہ آفت کی طلب
یاد ہیں صلب و شکم کی پہلی دونوں منزلیں / یاں کہاں وسعت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب
گر گلستانِ جہاں میں تنگ ہے تو غنچہ وار / کر کشادہ دل سے اپنے ذوق وسعت کی طلب

کرے ہے شرع کا پاس نمک مدام شراب / حرام ہے۔ نہیں لیکن نمک حرام شراب
یہ ایسا ماہِ مبارک۔ وہ ایسا کارِ سعید / شروع دیکھ کے کیجیے مہِ صیام شراب
عوض ہے نشۂ دنیا کا ذوق عقبےٰ پر / دوام بکتی ہے اس میکدہ میں وام شراب

اس بتِ نامہرباں کو ہے پسند اتنا رقیب / وردِ اسمائے الٰہی میں بھی ہے تو یا رقیب

تائے مثناۃ

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

ہیں داغِ محبت درم و دامِ محبت
مژدہ تجھے اے خواہشِ انعامِ محبت

ہر روز اُڑا دیتا ہے وہ کر کے تصدق
دو چار اسیرِ قفسِ دامِ محبت

مانند کباب آگ پہ کرتے ہیں ہمیشہ
دلسوز ترے بسترِ آرامِ محبت

کاسہ میں فلک کے رہے اک بوند نہ زہرآب
دھر کھینچے اگر تشنہ لبِ جامِ محبت

خاکسترِ پروانہ دکھا دوں میں اُڑا کر
پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجامِ محبت

شوقِ حرمِ کوچۂ قاتل میں کفن کو
ہم جانتے ہیں جامۂ احرامِ محبت

کی جس سے رہ و رسمِ محبت اُسے مارا
پیغامِ قضا ہے ترا پیغامِ محبت

نے زہد سے ہے کام نہ زاہد سے کہ ہم تو
ہیں بادہ کشِ عشق و مے آشامِ محبت

ایماں کو گرو رکھ کے اگر کفر کو لے مول
کافر نہ ہو گرویدۂ اسلامِ محبت

کہتی تھی وفا نوحہ کناں نعش پہ میری
سونپا کسے تونے مجھے ناکامِ محبت

معراج سمجھ ذوق تو قاتل کی سناں کو
چڑھ سر کے بل اس زینہ سے تا بامِ محبت

مجنوں نے دی لگا جو سرِ خار زار پشت
پشت اب ہجومِ خار سے ہے پشتِ خارپشت

حوروں کے گر ہو پنجۂ مژگاں سے خارِ پشت
کھجلائے وہ پری نہ کبھی زینہار پشت

ماہی سے تا بماہ ہیں دستِ فلک سے داغ
واں دغدار سینہ ہے یاں داغدار پشت

پیدا فلک سے اک نہ ہو تجھ سا ماہوش
نہ پشت تک تو کیا کہ نہ تا نہ ہزار پشت

بارِ زمانہ پشت پہ لے کر شتر کی طرح
سیدھی نہ کی فلک نے کبھی ایکبار پشت

ہوجاتی ہے زیادہ گرانباریٔ گناہ
پیری میں ہو خمیدہ نہ کیوں زیرِ بار پشت

سینہ سپر جو منہ پہ ہیں تیغِ نگاہ کی
دکھلاتے وہ کبھی نہیں آئینہ وار پشت

ڈر ہے یہی کہ ایسا نہ ہو بعد مرگ بھی
لگنے نہ دے زمیں سے دل بیقرار پشت

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

جیم عربی

ہے وہ آزار محبت سے دل زار کو رنج
جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج

دیدۂ آبلۂ پا کا یہی ہے رونا
کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو
ہے جو ناکامیِ فرہاد کا کہسار کو رنج

کبھی کرتی ہے قدم رنجہ جو گلشن سے صبا
اور ہوتا ہے سوا مرغ گرفتار کو رنج

شربتِ خضر بھی دے ہے روش تلخیِ مرگ
تیری اس زہر بھری آنکھ کے بیمار کو رنج

راحت و رنج زمانہ میں ہیں دونوں لیکن
یاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج

سخت جانی سے ہوں لاچار وگرنہ مجھ سے
نہ تو خنجر کو ہے آزار نہ تلوار کو رنج

سُن کے فریاد قفس میں مری خوش ہوں بیدرد
یہ نہ پوچھیں کہ ہے کیا مرغ گرفتار کو رنج

ہوش کو بیچ کے لے دارُوئے بیہوشی تو
ذوق بیہوش کو آرام ہے ہشیار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج
خط بھیج یا نہ بھیج۔ زبانی خبر تو بھیج

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

جیم فارسی

اُس پری کو تو نہ لے حیف اے دل بیتاب کھینچ
اور لیوے آدمی کو چاہ میں سیماب کھینچ

یوں گلوئے تشنہ میں وہ آب خنجر ہو فرو
جیسے تفتیدہ زمیں لے ایک دم میں آب کھینچ

وہ مثل ہے ناؤ یہ کس نے ڈبوئی ؟ خضر نے
لے گیا خطِ ذقن دل کو سوئے گرداب کھینچ

عاشق رسوا کے خط میں کیا تکلف چاہیئے
چار حرف اک پرچہ پر دو یہ ہیں بے القاب کھینچ

حائے حطی

فرقت کی رات جی چکے ہم تا زمانِ صبح
ہو گی اذان گور ہماری اذانِ صبح

پُر نور ہے ترا رُخ سیمیں لبانِ صبح
آنکھیں ہیں تیری مست صبوحی کشانِ صبح

تارِ شعاع مہر بھی رنگ شفق میں روز
ماتم میں ہیں مرے مژہ خوں چکانِ صبح

اب میکدہ میں شام کو ناقوس پھونکئے
مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوانِ صبح

پیسے یہ دانت رات نے مجھ پر کہ گھس گئے
انجم کے جتنے دانت تھے زیبِ دہانِ صبح

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

گم کردہ رہ ازل سے بھٹکتے ہیں رات دن
یہ میرے نالۂ شب و آہ و فغانِ صبح

یوں پہنچے اُس کی زلف میں عارض سے جان و دل
منزل پہ پہنچیں رات کو جوں رہروانِ صبح

اے ذوق کچھ نہ پایا شبِ وصل کا مزہ
یا آج صبح ہم نہیں یا طائرانِ صبح

ٹھیری ہے اُنکے آنے کی اب کل پہ جا صلاح
اے جان بر لب آمدہ تیری ہے کیا صلاح

منظور چشم یار ہے سب عین مصلحت
پوچھے بلا کشوں کی کسی سے بلا صلاح

سیدھے ہی جائیں کعبہ کو بیت الصنم سے ہم
گر پھیر دے نہ وہ صنمِ کج ادا صلاح

اُس چشم مست کے ہیں خراباتیوں میں ہم
تقویٰ کجا و زہد کجا و کجا صلاح

کیا جان میری جان کے درپے وہ ہو سکے
غمزہ سے تیرے پوچھے نہ جبتک قضا صلاح

اُس بد معاملہ سے بھلا کیا معاملہ
کس بد صلاح نے تجھے دی یہ دلا صلاح

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو
دیتا ہے ایسی کوئی بھی مرد خدا صلاح

کرتی خراب اُسی کو ہے تیری نگاہ مست	جس کو کہ دیکھتی ہے نکو کار و با صلاح
یارب ہو دل کی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج	چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا صلاح
منظور اگر ہے قتل مرا غیر سے نہ پوچھ	ہے تو صلاح نیک میں کیا پوچھنا صلاح
قلابے آسمان و زمیں کے ملا نہ تو	اُس مہروش سے ملنے کی ناصح بتا صلاح
یہ ہی مرا رفیق ہے۔ یہ ہی مرا شفیق	لوں کس سے وان کے جانے کی دل کے سوا صلاح

اے ذوق جا نہ ہوش و خرد کی صلاح پر
جو عشق دے صلاح وہی ہے بجا صلاح

خائے معجمہ

اس غزل کا باعث تحریر یہ ہوا تھا کہ خوانین رامپور میں سے نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلی میں رہتے تھے۔ پھر میرٹھ میں صدر الصدور ہو گئے تھے۔ شعر و سخن کے شیدا تھے۔ اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔ اُستاد مرحوم کا عالم جوانی۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ اکثر شعرا کی نشست نواب کے ہاں ہوتی تھی۔ اُستاد کی اُن سے شناسائی تھی۔ مگر وہ اُنھیں اُستاد مانتے تھے۔ شہیدی مرحوم بہ لباس فقیری دلی میں آئے اور مناسبت طبع نے نواب سے بھی ملایا۔ اپنے شعر سُنائے اور اثنائے گفتگو میں کہا کہ مبصران سخن کے نزدیک آج فن شعر میں تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں شیخ حفیظ دکن میں۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں +

نواب صاحب نے کہا کہ شیخ ابراہیم ذوق کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی اور شاخ کی غزل سُنا کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اُٹھا سکتا ہے۔ نواب با اخلاق اُس وقت تو چپ ہو رہے مگر پھر اُستاد کو بلایا۔ حال بیان کیا اور غزل کی فرمائش کی۔ اُستاد نے کہا کیا حاصل؟ عبث کاوش ہے اور انجام کاوش ہے۔ جب نواب نے اصرار کیا تو اُستاد نے

غزل کہہ کر مع قصیدہ جلسۂ خاص میں سُنائی۔ اور خلوۃ میں اتنا بھی کہا کہ ان قوافی کو اور ان کے مضامین کو دیکھئے جو ان سے بڑھ کر کہیگا تو میں پھر دیکھوں گا۔

نواب نے کہا۔ ایک مشاعرہ کرتے ہیں۔ اُس میں پڑھیئے۔ یہ سُنکر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہو گئے۔ نواب نے سنکر آدمی دوڑایا۔ وہ بریلی جا پہنچے تھے۔ آدمی نے جا کر پیغام پہنچایا اور ناکام پھر آیا۔ قسمت سے اُس زمانہ کا ایک مسودہ میرے ہاتھ آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔ خیر یادگار تو ہے:۔

(یہ بھی [illegible] کی طرح)

تھی زلف تیری سنبلِ صحنِ چمن کی شاخ
قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ

اُس قد کو کیونکہ کہیئے نہالِ چمن کی شاخ
لائیگی وہ کہاں سے ادا بانکپن کی شاخ

ابرو پہ اُس کے خال ہے کیا زاغِ شوخ چشم
سمجھا ہے اپنی شاخ نشیمن ہرن کی شاخ

دکھلائی اُس کے سُرمۂ دنبالہ دار نے
آنکھوں سے ہم کو نرگس ہاروت فن کی شاخ

ناف اُس صبیح کی ہے کوئی نسترن کا پھول
تا ناف سیلی سینہ پہ ہے نسترن کی شاخ

دل باغِ عشق نخل۔ کہ جس میں ہزارہا
حسرت کے برگ۔ الم کے ثمر ہیں۔ حزن کی شاخ

بے بہرہ انتفاع سے رہتے ہیں پُرجفا
ممکن نہیں کہ لائے ثمر کرگدن کی شاخ

کہتی تھی چوب تیشہ مری طرح ایکدن
سوکھے گی نخلِ آرزوئے کوہکن کی شاخ

جیب سے پڑا ہے باغ میں جھولا ترے لئے
ممنون باغ میں ہے نہایت رسن کی شاخ

لچکے ہے یوں کمر تری وقتِ خرامِ ناز
جنباں ہو جوں نسیمِ چمن سے سمن کی شاخ

حیراں ہوں دیکھ خال کو ابروئے یار پر
گل نیلوفر کا لائی ہے کیونکر ہرن کی شاخ

ہے جوش پارہ پارۂ دل ہر مژہ پہ یوں
لائے نکال کونپلیں جس طرح گھن کی شاخ

مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار
ہے یہ بھی اُس کے ایک شجر مکروفن کی شاخ

دیتی ہے سر پہ بلبلِ آتش نفس کو جا
رکھتی ہے کیا چمن میں ہوس سوختن کی شاخ

ہے نعش تیرے کشتۂ بیکس کی دشت میں
گویا کہ اک نشیمن زاغ و زغن کی شاخ

جز شمع استخوانِ صفا کیش زیرِ خاک
دیکھی نہ ہے سُنی گل صبح کفن کی شاخ

بے برگ ہے نہ غنچہ۔ نہ گل ہے۔ نہ ہے ثمر
میں خشک طالعی سے ہوں گویا ہرن کی شاخ

ریشم کا لچھا ہاتھ میں اُس کے نہیں دلا
یہ یاسمن کا سانپ ہے وہ یاسمن کی شاخ

چھوٹے جلانے والوں سے وحشی نہ مر کے بھی
انجن[1] کے کام آئے اگر ہے ہرن کی شاخ

تشبیہ کیونکہ دوں مژہ خوں فشاں سے میں
مرجاں کی شاخ کب ہے بھلا اس پھبن کی شاخ

صیاد میں چمن سے ہوں مایوس۔ چاہیئے
چوبِ قفس بھی ہو تو نہال چمن کی شاخ

باریک ہیں بتاتے ہیں جس کو تری کمر
یا کوئی موئے تن ہے ویا موئے تن کی شاخ

گل خوردِ تن مرادم روئیدگی مو
ہے آشیان بلبل گلشن وطن کی شاخ

دیوے خراش دل کو نہ کیونکر وہ نازنیں
رکھتی ہے خار سینکڑوں نازک بدن[2] کی شاخ

دکھلائے باغ میں قدر عنا جو اپنا تو
قمری کے حق میں دار ہو سرو چمن کی شاخ

موذی کو سرکشی سے میسّرن ہوا اعتبار
نکلے ہے طول عمر سے مارِ کہن کی شاخ

ہوتی ہے وحشیوں پہ پس از مرگ بھی شکست
زور آزمائیوں کے لئے ہے ہرن کی شاخ

شاخ نبات کو سنئے قلیاں نہ مُنہ لگائے
ایسی مصاحبت سے لگی اُس دہن کی شاخ

ہے فیض سے وقار کے میری نگاہ میں
جس شاخ میں ثمر ہے وہ ہے لاکھ من کی شاخ

آخر یہ دستگیریٔ تیشہ نے پھل دیا
کی قطع نخل آرزوے کوہکن کی شاخ

بدخصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک
اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

رہتے ہیں کشمکش میں پس از مرگ پُرجفا
آخر کو زیر ارّہ کٹی کرگدن کی شاخ

بیمار چشم دلبر آہو نگاہ کو
شاخیں بھی گر لگائیں تو لیکر ہرن کی شاخ

ہر صید کی کمر سی گئی ٹوٹ جس گھڑی
ٹوٹی کمان دلبر ناوک فگن کی شاخ

تاثیرِ بیکسی سے ہو سارا درخت خشک
ڈالے جو سایہ نعش پہ اس بے کفن کی شاخ

ہے سیبِ باغ خلد کو کیا کیا نہ سرکشی
جب سے مشابہت سے لگی اس ذقن کی شاخ

سوفار کا دہن جو ہوا خون دل سے سرخ
تیر اُس کا بن گیا ہے گل خندہ زن کی شاخ

ن ہتی سیب باغ خلد کو کب اتنی اوج قدر - لیکن مشابہت سے لگی اُس دہن کی شاخ + ن فزوں تر ہوا اعتبار +

[1] انجن - سُرمہ
[2] نازک بدن ایک قسم کا بیر ہوتا ہے اُس کے درخت کو بھی نازک بدن کہتے ہیں +

لکھ ذوق اُس کی مدح کہ جسکی ثنا سے ہے
سرسبز تیرے گلشنِ باغِ سخن کی شاخ

وہ کون؟ شاہ اکبر ثانی کہ جس کو روز — مجرا کرے ہے جھک کے نہالِ چمن کی شاخ
اُس کی دُعائے حرز پڑھے جوشِ غنچہ سے — تسبیح ایک لے کے عقیقِ یمن کی شاخ
کردے جو وہ نہال تو لائے ابھی نکال — پرویں کا خوشہ گاؤ سپہرِ کہن کی شاخ
بہرِ تصدق آئے زرِ گل کو لے صبا — کرنے لگے نثار گہر یاسمن کی شاخ
پہنچائے اُس کا مژدۂ صحت جو باغ میں — سجدہ میں بہرِ شکر جھکے نارون کی شاخ
ہمسر ہے آج خضر ارم سیر سے شجر — ہم قد ہے آج یوسفِ گل پیرہن کی شاخ
گرمیِ عدل اُس کی اگر ہو ستم گداز — پگھلے برنگ شمع ابھی کرگدن کی شاخ
مطلع وہ پُر بہار لکھوں اُس کی مدح میں — مصرع کو جس کے سُن کے کٹے نسترن کی شاخ

تیرے بہار فیض سے نخلِ کہن کی شاخ
سرسبز یوں ہے جیسے کہ سرو چمن کی شاخ

تیرے سحاب لطف سے سیراب ہو اگر — ہمسر ہو شاخ نخلِ ارم سے ہرن کی شاخ
شاہا یہ تیرا دستِ سخا باغِ دہر میں — گویا کہ نکلی ہے کرمِ ذوالمنن کی شاخ
گر تیرا حفظ ہو چمن بند روزگار — آبِ مژہ سے سبز ہو سرو چمن کی شاخ
صرصر کا سارا خاک میں مل جائے زور شور — چھیڑے گر آشیانۂ مرغِ چمن کی شاخ
دیکھے جو تیرا قوتِ بازو تو ٹوٹ جائے — وقتِ کشش کمانِ سپہرِ کہن کی شاخ
تیرے عصا کو اُس سے ہیں تشبیہ کیونکہ دوں — ہے شاخ سدرہ ایک کنارِ کہن کی شاخ
تاثیر تیرا زور ضعیفوں کو دے اگر — ٹوٹے نہ بیلتن سے بھی نازک بدن کی شاخ
بلکہ کمند مار کے ہاتھی کو کھینچ لے — خرطوم سے لپٹ کے بصورت رسن کی شاخ
منظور گر خزانہ میں ہو تجھ کو شاخ زر — طیار ہو وہیں زرِ خور سے کرن کی شاخ
ہاتھی کو تیرے چاہیئے لکڑی تو دشت میں — خرطوم سے اُکھاڑ لے وہ کرگدن کی شاخ

دانتوں کو اس کے دیکھ ہو لرزاں بہ مثلِ بید
صد دیو کوہ پیکر و البرز تن کی شاخ

گلگوں سے تیرے بڑھ نہ سکے یک قدم صبا
سو تازیانے مارے نہالِ چمن کی شاخ

ہو تیرا فیض اگر چمن آرائے باغِ دہر
آب تبر سے سبز ہو نخلِ کہن کی شاخ

نالاں ہیں تیرے عدل سے خونریز اسقدر
مانند نے ہو گرمِ فغاں کرگدن کی شاخ

برسائے جبکہ لعل و گہر تیرا دستِ جود
محتاج ابر ہو نہ نہالِ چمن کی شاخ

شاداب آبِ لعلِ یمن سے ہو مثلِ گل
سیراب ہووے آب سے دُرِّ عدن کی شاخ

یاں تک ہے پاس شرع ترے عہد میں کہ اب
ساغر بکف نہ ہوئے گُلِ خندہ زن کی شاخ

پیدا ہو بادہ خوار کی تعزیر کے لئے
نخلِ کدوے تاک ہیں صورت رسن کی شاخ

یہ ذوق کی دُعا ہے کہ تا باغِ دہر میں
سرسبز شعرِ تر سے ہو نخلِ سخن کی شاخ

جب تک کہ ہووے گردنِ مینا کی طرح سے
نخلِ نشاط ساقیِ پیماں شکن کی شاخ

نخلِ حیات تیرا تر و تازہ ہو مدام
جوں موسمِ بہار میں نخلِ چمن کی شاخ

دال مہملہ

پہلے بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی۔ اُن کی غزل لکھکر بیٹھے بیٹھے دل لگ گیا اور چند قافیئے خوشنما پہلوؤں پر بیٹھتے نظر آئے۔ فرمایا۔ ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔ دوسرے دن میں گیا تو غزل سُنائی۔

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا ہم نے گریہ کو اپنے کہ لگ گئی
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

گر دم کے دم وہ ہم سے ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کھڑی دو گھڑی کے بعد

اُس لعل لب کے ہم نے لئے بوسے اسقدر
سب اُڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

اللہ رے ضعف سینہ سے ہر آہ بے اثر
لب تک جو پہنچی بھی تو چھڑی دو گھڑی کے بعد

کل اُس سے ہم نے ترک ملاقات کی تو کیا
پھر اُس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک
غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی ۔ شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

پروانہ گرد شمع کے شب دو گھڑی رہا
پھر دیکھی اُسکی خاک پڑی دو گھڑی کے بعد

تو دو گھڑی کا وعدہ نہ کر۔ دیکھ جلد آ
آنے میں ہو گی دیر بڑی دو گھڑی کے بعد

گو دو گھڑی تک اُس نے نہ دیکھا ادھر تو کیا
آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوقؔ کس طرح
پھر تو نہ ٹھیرے پاؤں گھڑی دو گھڑی کے بعد

ایک قدیم الخدمت محمد بخش نام استادِ مرحوم کے پاس ملازم تھا۔ بڈھا بھی تھا مسخرا بھی تھا۔ سامنے بورچی خانہ میں سب کا اتالیق بنا بیٹھا رہتا تھا۔ اور باتیں بنایا کرتا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اُستاد مرحوم کی اور اُن کے والد کی خدمتیں کرتے کرتے وہ بھی ایک رقم ہو گیا تھا۔ بچے کاموں کو اصلاح دیتا تھا۔ میں حد شباب میں پہنچ لیا تھا۔ پھر بھی اسی طرح باتیں کیا کرتا تھا جس طرح بچپن میں مجھے کھلاتا تھا اور ہنساتا تھا۔ اُستاد کا وہ عالم اب تک آنکھوں کے سامنے ہے کہ خاموش اپنے شغل میں مصروف ہیں۔ کوئی بات اُس کی بھی کان میں جاتی ہے تو مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی خوش ہوتے تھے تو ایک دو گالیاں بھی دیدیا کرتے تھے! اور ٹہلتے ٹہلتے ایک آدھ دھول بھی لگا دیتے تھے۔ اُسے بڑے اُستادوں کے بہت شعر یاد تھے اُستاد مرحوم کے بھی لڑکپن کے شعر یاد تھے۔ جوانی میں سورج مکھی پر شعر پڑھا کرتا تھا +

ایک دن میں نے اپنے مطبع میں چرچا سنا کہ رات کو فلاں بازار میں سورج مکھی پر اُستاد ذوقؔ کے نوکر نے بھی شعر پڑھے۔ بڈھا تھا۔ پھر بھی خوب پڑھا۔ اور شعر بھی خوب تھے۔ ایک بولا آخر اُستاد کا نوکر تھا صاحب۔ خوب کیوں نہ پڑھتا +

میں حسبِ معمول شام کو اُستاد کے پاس گیا۔ وہ حرم سرا میں گئے تھے میں نے پوچھا محمد بخش! کل سورج مکھی پر شعر پڑھے تھے؟ پہلے تو مکر گیا۔ پھر بڑی مشکلوں سے قبولا

میں نے پوچھا۔ کیا کیا پڑھے تھے؟ بڑے غمزوں سے سودا کی ایک غزل سنائی۔ میں نے کہا اُستاد کے شعر بھی تو پڑھے تھے! کہا یہ تو اب شعر کہنا بھول گئے۔ میں نے کہا۔ کون؟ کہا۔ یہی میاں ابراہیم۔ میں نے کہا۔ بھول کیونکر گئے۔ کہا۔ پہلے اچھے کہتے تھے۔ اب تو کچھ اور ہی ڈھب کے کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ خیر جو شعر تونے وہاں پڑھے وہ سنا دے۔ کہنے لگا لڑکوں کے سامنے شعر نہیں پڑھا کرتے میں نے کہا اچھا ایک ہی پڑھ دے۔ بڑی خوشامدوں سے یہ مطلع پڑھا۔

ماتھے پہ ترے چمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

اتنے میں اُستاد آئے۔ میں نے یہ مطلع سُنایا۔ فرمایا۔ تمھارے ہاتھ کہاں سے آیا۔ میں نے کہا محمد بخش نے ابھی پڑھا ہے۔ حضرت! آج رات کو سورج مکھی پر اس نے شعر پڑھے تھے۔ مسکرا کر بولے۔ کیوں بے گنجے فلاں فلاں تو ہمارے شعر سورج مکھی پر پڑھا کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کو کوئی شعر اس کا یاد ہے۔ فرمایا مدتوں کی باتیں ہیں۔ اب کہاں یاد۔ پھر کہا۔ یادداشت کے جُز میں لکھ لو۔ کتاب میں نہ لکھنا۔ میں نے کہا۔ حضرت! کیوں؟ فرمایا لڑکپن کی باتیں ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی فرمایش سے کہہ دیتے تھے۔ فرصت میں بیٹھیں گے تو اپنے رنگ میں لے آئینگے۔ میں نے وہیں لکھ لیا۔

ہے آئینہ خانہ بھی گذرگاہ بد و نیک
دم گھٹتا ہے سینہ میں دمِ شدتِ گریہ

دیکھا نہ کبھی ہم نے دلِ اہلِ صفا بند
باراں کی علامت ہے جو ہو جائے ہوا بند

ایک دن والد مرحوم کے پاس آئے۔ ترتیب دیوان کی تجویز ہونے لگی۔ ایک ان میں سے یہ کہ ہر ردیف میں کچھ غزلیں ہونی چاہئیں۔ جن میں نہیں اُن کے لئے طرحیں تجویز ہوں۔ ردیف دال کے لئے یہ مصرع بھی طرح ہوا۔ ع

مُنہ داغِ دل پہ اندک سُرخ ہے اندک سفید

ذال معجمہ

۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اُس میں یہی طرح ہوئی تھی شاگرد آئے اصلاحیں لے گئے مشاعرہ کے بعد اور غزلیں بھی آئیں۔ دیکھکر فرمایا۔ دیکھو قافیہ کا پہلو نہیں بٹھا سکتے۔ زمین ماپتے چلے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا۔ ہم بھی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں۔ زمین ٹھنڈی ہے تو ہو۔ کلام بے اصول تو نہ ہو ✤

مژدۂ قتل سے اُس عہد شکن کا کاغذ
ہے مری روح کو آزادیٔ تن کا کاغذ

گور میں پیش ہو جب دفتر تن کا کاغذ
ہو سیاہہ کو سفیدیٔ کفن کا کاغذ

بن گیا عکس سے اُس شوخ گلستاں رو کے
صفحۂ آئینہ۔ تصویر چمن کا کاغذ

کیا کرے خانۂ گیتی کا کوئی دعوئے ملک
نام پر کس کے ہوا اس قصر کہن کا کاغذ

لکھیں اُس چشم کے وحشی کے لئے گر تعویذ
اہل تکسیر کریں۔ پوست ہرن کا کاغذ

رقعہ شادیٔ شہادت کا ہو۔ خوں سے رنگیں
ایسی شادی کو ہو ایسی ہی پھبن کا کاغذ

سینہ صافوں کو زمانہ کے ہے ہاتھوں سے شکست
ہے صفائی سے سزاوار شکن کا کاغذ

ورق چرخ ہو گو نسخۂ آشوب۔ نہ ہو
سرمۂ چشم مہ سیم بدن کا کاغذ

یوں قفس میں کوئی رہم تک ہے پہنچا گلبرگ
جیسے غربت میں شفیقان وطن کا کاغذ

ظاہر آرا نہ کتابوں سے ہو۔ ڈر دوزخ سے
کر نہ آتش میں لباس اپنے بدن کا کاغذ

جعلسازی پہ زمانہ کی گواہی دے ہے
مہری و سادہ مہ چرخ کہن کا کاغذ

مہر دہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آئے ہے رشک
ہائے یوں چوسے لعاب لب سکے دہن کا کاغذ

ذوق دلسوختہ دیواں لکھے اپنا کیا خاک
متحمل نہیں گرمیٔ سخن کا کاغذ

ہول دل کا مجھے کیا دیتے ہو لا کر تعویذ
اُس کا خط لاؤ کہ رکھوں میں بنا کر تعویذ

جو تری چشم کے دیوانوں کا کرتے ہیں علاج
لکھتے ہیں پوست کا آہو کے بنا کر تعویذ

تم نے تعویذ نشانی جو دیا تھا اپنی
لے گیا کوئی موکل وہ اُڑا کر تعویذ

اب تلک جوش میں ہے خون شہید غم عشق
دیکھ لو تم سر مرقد سے اُٹھا کر تعویذ

جلتوا لی نہ پڑی یار میں اور غیروں میں
سینکڑوں خاک کئے ہمنے جلا کر تعویذ

ردائے مہملہ

نگہ نہیں۔ حرف دلنشیں تھا۔ دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر
نکل کے رستہ سے چشم فتاں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

پھر آیا لو وہ نگار خونی ادھر کو سر گرم جنگ ہو کر
کہ جس کے ہاتھوں سے اڑ گئے سر ہزاروں مہندی کا رنگ ہو کر

وہ چشم مخمور اک نظر سے۔ جبھو سے لاکھوں جو نیشتر سے
تو ہو رواں ہر رگ جگر سے لہو۔ مئے لالہ رنگ ہو کر

جو رنگ الفت سے آشنا ہیں۔ وہ گر بُرے بھی ہیں خوشنما ہیں
کہ رنگ ہی سے گراں بہا ہیں۔ عقیق و یاقوت سنگ ہو کر

جو سمجھیں حسن بتاں کو ایماں۔ اُنھیں رہ کفر و دیں ہے یکساں
پہنچتے کعبہ ہیں وہ مسلماں ہمیشہ چین و فرنگ ہو کر

صفائی دل کی یہی ہے صورت۔ کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائیں گے بالضرورۃ۔ اس آئینہ میں یہ زنگ ہو کر

غزال رم دیدہ بن گیا ہے۔ جو خواب آنکھوں میں۔ تو بجا ہے
کہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ پلنگ تجھ بن پلنگ ہو کر

ہوئے جو یک رنگ اُن کو زیبا۔ نہیں جہاں میں رعونت اصلا
کہ پایا گل نے بھی نام رعنا۔ تو اس چمن میں دو رنگ ہو کر

دہن سے گر کے آیا جو ۱۰۱ نکل کر دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

حلاوت شرم و پاسداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری
مزے سے گزری اگر گزاری کسی نے بے نام و ننگ ہو کر

خوب روئے رات ہم سنسان ہاموں دیکھکر
یاد آیا ہم کو مجنوں۔ بیار مجنوں دیکھکر

اُڑ گئے اک آن میں جادوئے بابل کے دھوئیں
سرمہ آلودہ تری چشم پُر افسوں دیکھکر

دیکھکر غیروں میں مہتابی پر اُس مہوش کو رات
آہ کی اک دل سے ہم نے سوئے گردوں دیکھکر

سچ کہا ہے۔ آگے کالے کے نہیں جلتا چراغ
چھپ گیا مہ رُخ پہ تیرے زلف شبگوں دیکھکر

لب پہ میرے ساغر سرشار وحشت کا نشا
چھپ گیا خم میں مری صورت فلاطوں دیکھکر

آگئیں ہم کو لگائی اُنگلیوں پر فندقیں
نوک مژگاں پر مرے اشک جگر گوں دیکھکر

جو ہے نالہ اپنا۔ وہ اک مصرعِ برجستہ ہے
ہم جو نالاں ہیں کسی کا قد موزوں دیکھکر

قتل کو کس کے چڑھائی تیغ تو نے سان پر
اُترا آنکھوں میں جو زخموں کی مرے خوں دیکھکر

لے گیا دل کون میرا۔ ذوق کس کا نام لوں
سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھکر

کہا پتنگ نے یہ۔ دار شمع پہ چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مر لے کسی کے سر چڑھ کر

مرے خیال پہ۔ وہ چشم فتنہ گر چڑھ کر
یہ خانہ جنگ بنی۔ آئی لڑنے گھر چڑھ کر

دکھا نہ جوش و خروش اتنا زور پر چڑھ کر
گئے جہان میں دریا بہت اُتر چڑھ کر

ستمگروں کی کشاکش میں آبرو ہو سوا
کہ ہوتی سان پہ ہے تیغ تیز تر چڑھ کر

الٰہی خیر ہو مانند شعلۂ سرکش
پھر آیا باد کے گھوڑے پہ وہ ادھر چڑھ کر

ہنر شناس کو دکھلا ہنر۔ کہ خوبیٔ زر
اگر کھلے ہے تو صراف کی نظر چڑھ کر

کہیں فلک پہ نہ چڑھ جائے چاند جھومر کا
کہ دور آپ کو کھینچے ہے تیرے سر چڑھ کر

ترا مکاں تو ہے کیا لامکاں میں گو ڈٹیں
اُمید وصل میں ہم۔ بام عرش پر چڑھ کر

جو مارے نفس کو۔ اور کرلے اپنے غصہ کو زیر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

ہماری خاک پہ برپا ہے ذوق فتنۂ حشر
سمند ناز پہ کون آیا فتنہ گر چڑھ کر

جاں ہوا یوں ہوئی اُس خال کا بوسہ لے کر
جیسے اُڑ جائے دہن میں کوئی گُٹکا لے کر

تیرا بیمار نہ سنبھلا جو سنبھالا لے کر
چپکے ہی بیٹھ رہے دم کو مسیحا لے کر

شرطِ ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب
تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑے گا بدلا لے کر

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر
تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لے کر

کھینچتی روز قیامت سے بھی ہے آنکو دُور
تیری زلفوں کی بلائیں شب یلدا لے کر

مجھ سا مشتاق جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں
گرچہ ڈھونڈو گے چراغ رُخ زیبا لے کر

جبکہ دیکھا نہ ملا مجھ میں کہیں میرا پتا
پھر گیا نامہ بر یار خط اُلٹا لے کر

رہ گیا اپنا سا منہ لے کے وہ آئینہ رُو
تیری تصویر کو یوسف نے جو دیکھا لے کر

تیرے پُرزے نہ کئے خط کی طرح اے قاصد
شکر کر چھوڑ دیا اُس نے نوشتہ لے کر

میرے قدموں ہی میں رہجائینگے جائیں گے کہاں
دشت میں میرے قدم۔ آبلۂ پا لے کر

واں سے یاں آئے تھے لے ذوق تو کیا لائے تھے
یاں سے تو جائیں گے ہم۔ لاکھ تمنا لے کر

دیوان چند و لعل مدار المہام دربار حیدر آباد نے کئی ہزار روپے بھیجکر بلا بھیجا۔ اور مصرع اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا۔ حضرت مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزلہ کہکر بھیج دیا۔ اور روپیہ نہ لیا۔ میں نے ایک دن نہ جانے کا سبب پوچھا۔ فرمایا۔ پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے۔ میاں وہاں جلسے خدا جانے کیا ہوتا اور کیا کیا نہ ہوتا۔ اپنی دلی اور حضور کا دربار کیا تھوڑی نعمت ہے۔ خدا کا شکر کیا اور یہیں بیٹھے رہے +

کل گئے تھے تم جسے بیمار ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

طفلِ اشک ایسا گرا دامان مژگاں چھوڑ کر
پھر نہ اُٹھا کوچۂ چاکِ گریباں چھوڑ کر

کیونکہ نکلے تیر اُس کا دل میں پیکاں چھوڑ کر
جائے بیضہ کو کہاں یہ مرغ پرّاں چھوڑ کر

لے سنبھالا لینا بعض دفعہ بیمار قریب المرگ ہوتا ہے تو مرنے سے ایک دو دن پہلے ایسا سنبھل جاتا ہے گویا اچھا ہو گیا۔ سب کو صحت کی امید ہو جاتی ہے۔ پھر دفعۃً حالت بگڑ کر پہر دو پہر میں کام تمام ہو جاتا ہے اُس وقت کہتے ہیں کہ جو صحت معلوم ہوئی تھی وہ سنبھالا لیا تھا +

کام یہ تیرا ہی تھا۔ رحمت ہے اے ابرِ کرم
ورنہ جائے داغِ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر

جس نے ہو لذت اُٹھائی زخمِ تیغِ یار کی
کب وہ مرہماں کو ڈھونڈے ہے نمکداں چھوڑ کر

صیدِ دل کو کیونکہ چھوڑے۔ جبکہ دکھلائے ہے تو
مچھلیاں دستِ حنائی میں مری جال چھوڑ کر

سرد مہری سے کسی کی آگے ہی دل سرد ہے
یاں سے ہٹ جا دھوپ اے ابرِ بہاراں چھوڑ کر

دیکھئے کیا ہو۔ کہ ہے اب جان کے پیچھے پڑی
دل کو اے کافر تری زلفِ پریشاں چھوڑ کر

اے دل اُس کے تیر کے ہمراہ سینہ سے نکل
دیکھ پچتائیگا تو یہ ساتھ ناداں چھوڑ کر

کیوں نہ رم کرجائیں آہو ایسے وحشی سے ترے
شیر بھاگے جس کے نالوں سے نیستاں چھوڑ کر

سُرخیِ پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے
اُٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیحِ مرجاں چھوڑ کر

پیش خیمہ لے کے نکلا گردِ بادِ دُودِ آہ
ہے جو سر گرمِ سفر تن کو مری جاں چھوڑ کر

گر خدا دیوے قناعت ماہ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری کو کبھی آدھی نہ انساں چھوڑ کر

ساغرِ دل بیچتا آیا ہوں کھو مست ہاتھ سے
جو کتا ہے کیوں یہ جنسِ دست گرداں چھوڑ کر

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوق لیکن اب نہ جا
عالم مضموں میں طرز تفتہ جاناں چھوڑ کر

جب چلا وہ مجھ کو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر
کیا ہی پچتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر

میں وہ مجنوں ہوں جو نکلوں کنج زنداں چھوڑ کر
سیب جنت تک نہ کھاؤں سنگ طفلاں چھوڑ کر

پیوے میرا ہی لہو مانی جو لب اُس شوخ کے
کھینچے تو شنگرف سے خونِ شہیداں چھوڑ کر

میں ہوں وہ گمنام جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشیِ قدرت جگہ واں چھوڑ کر

سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سرو خراماں چھوڑ کر

ہو گیا طفلی ہی سے دل میں ترازو تیر عشق
بھاگے ہیں مکتب سے ہم اوراق میزاں چھوڑ کر

اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

شوق ہے اُس کو بھی طرزِ نالۂ عشاق سے
دمبدم دیکھے ہے منہ سے دود قلیاں چھوڑ کر

دل تو لگتے ہی لگے گا حوریانِ عدن سے
باغ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑ کر

گھر سے بھی واقف نہیں اُسکے کہ جسکے واسطے
بیٹھے ہیں گھر بار سب ہم خانہ ویراں چھوڑ کر

وصل میں گر مجھ کو ہوئے رویتِ ماہِ رجب
روئے جاناں ہی کو دیکھوں میں توقرآں چھوڑ کر

گرچہ ہے ملکِ دکن میں اِن دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

بندہ آزاد بھی ان دنوں حاضر خدمت ہونے لگا تھا۔ ایک دن مومن خاں صاحب اُستاد کے پاس آئے اثنائے گفتگو میں کہا۔ آج کل کا کوئی شعر سُنائیے۔ اُستاد نے فرمایا کہ حضور کی غزلیں کہاں فرصت دیتی ہیں جو اپنی فکر کروں۔ جب کئی دفعہ کہا تو غزل مرقوم الذیل کا مطلع اُنہی دنوں کہا تھا۔ یہی سُنایا۔ وہ ہنسے اور کہا اس پر کوئی مطلع کیا کہے گا۔ راستہ بند ہے۔

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دُور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر

کیا ڈھونڈے دشت گم شدگی میں مجھے کہ ہے
عنقا مرے سُراغ سے دُور اور شکستہ پر

اُس مرغ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
مرغانِ کوہ وراغ سے دُور اور شکستہ پر

ساقی بط شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی
خم سے الگ ایاغ سے دُور اور شکستہ پر

خود اُڑکے پہنچے نامہ۔ جو ہو مرغ نامہ بر
اُس شوخ خوش دماغ سے دُور اور شکستہ پر

کرتا ہے دل کا قصد کماندار تیرا تیر
پر ہے نشانِ داغ سے دُور اور شکستہ پر

اے ذوق میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دُور اور شکستہ پر

غزل مرقومۃ الذیل کے مطلع کے باب میں بعض اشخاص سے میں نے سُنا کہ اس میں شاہ نصیر مرحوم کی اصلاح ہے۔ اُستاد مرحوم سے پوچھا۔ اُنھوں نے فرمایا عالم شباب میں میں نے فقط مطلع کہا تھا۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈالکر
ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

یہ دفعتہً مشہور ہو گیا۔ تم دیکھتے ہو کہ میں ہمیشہ اپنے کلام کو زیر نظر رکھتا ہوں۔ میں نے خود اس میں اصلاح کی۔ کہنے والوں نے کہدیا کہ شاہ صاحب نے اصلاح کی۔ دل کو

سخت رنج ہوا مگر ضبط کر گیا۔ اور تدارک یہی سمجھ میں آیا کہ غزل پوری کی۔ اللہ نے داد یہ دی کہ وہ اس سے زیادہ مقبول خلائق ہوئی۔ پھر سب چپ چاپ ہو کر بیٹھ گئے:۔

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

دل سینہ میں کہاں ہے؟ نہ تو دیکھ بھال۔ کر
اے آہ۔ کہہ دے تیر کا نامہ[۱] نکال کر

ہوں سرد ہو چکا۔ نہ دوبارہ حلال کر
ہیں! اور دم چراؤنگا۔ یہ تو خیال کر

عاشق کے خوں سے اپنا پر تیر لال کر
دکھلا دے شاخ خشک میں کونپل نکال کر

تیرے مریض نے کئی نقل مکاں کیئے
آخر کو روح تن سے گئی انتقال کر

شہرگ پر اپنی زندگی و موت ہے لاگ
آ تیغ یار! قصہ یہ۔ تو انفصال کر

اُتریگا ایک جام بھی پورا نہ چاک سے
خاکِ دلِ شکستہ نہ صرف اے کلال کر

لیکر بتوں نے جان جب یاں پہ ڈالا ہاتھ
دل کیا کنارہ ہو گیا سب کو سنبھال کر

سینہ ہمارا وادیٔ وحشت سے لے جنوں
ہر داغ پر تصور چشمِ غزال کر

گر چاہتا ہے مثل مہ چاردہ فروغ
آ پھر کے شہر شہر میں کسبِ کمال کر

پوچھو چلے ہیں کو نسے کعبہ کو اہل درد
ملک فنا ہے۔ جائیں ذرا دل سنبھال کر

تصویر ان کی حضرت دل کھینچ لائے گر
رکھ دیں گے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر

قاتل ہے کس مزے سے نمک پاش زخم دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ٹال کر

[۱] نامہ نکالنا۔ وہی مشہور عمل ہے جسے عوام اب بھی ناواں نکالنا کہتے ہیں۔ پہلے جب کوئی چیز کھوئی جاتی تھی کسی عامل سے چور کا نام۔ کبھی صورت۔ کبھی اور اتا پتا معلوم کر لیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کاغذ کے پرزوں پر نام لکھ کر۔ کبھی پانی میں اور کبھی آئینہ میں صورت دیکھکر۔ کبھی تیر کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ تیر میں بھی یہ اشارہ ہوتا تھا۔ کہ یہی چور کے کلیجے میں لگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اے یار۔ دل سینہ میں کہاں ہے دیکھ بھال نہ کر۔ ہاں اے آہ دل تو تیر کا ناواں نکال کر بتا دے کہ تیرے ہی تو پاس ہے (اے یار) +

اُستاد مرحوم بادشاہ کے سامنے اپنا شعر یا غزل پڑھتے نہ تھے۔ طبیعت سے واقف تھے۔ اہلِ دربار میں سے کوئی سُنا دیتا تو جو پسند آ جاتا خوشی حضور کی تھی کہ یہ ہمارے نام سے مشہور ہو۔ چنانچہ اس پر خود غزل کہتے۔ اور بموجب معمول کے ٹوٹا پھوٹا مسوّدہ اُستاد کے پاس بھیج دیتے کہ اصلاح دیدیں۔ اس حالت میں استاد کو واجب تھا کہ اپنے اشعار کے پہلو بچا کر اُن کے شعر درست کریں چنانچہ جب غزل مرتب کر کے حضور میں لے جاتے تو بادشاہ زبان سے کچھ نہ کہتے مگر کئی دن کے بعد اسی طرح میں پھر ایک اور مسودہ بھیج دیتے ابتدا میں ۲-۳ دفعہ ایسا ہوا۔ اُستاد سمجھ گئے آخر یہ ہو گیا کہ جب ایسا موقع ہوتا۔ تو اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر بھیج دیتے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے۔ جب بادشاہ کا پہلا دیوان چھپکر آیا۔ تو مجھے یاد ہے۔ والد مرحوم نے غزل مرقوم الذیل دیکھکر مجھ سے کہا۔ دیکھو یہ غزل بھی بادشاہ کو دیدی۔ لڑکپن کی ہے۔ والد کو پہلے سے ساری یاد تھی ❖

مزا چکھایا ہے کو ہکن کو۔ جو عشق آیا ہے امتحاں پر
کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودہ آگیا زباں پر
خدنگ دنبالہ کھایا لیکن نہ لایا شکوہ کبھی زباں پر
کہ بوسہ اُس چشم سرمہ سا کا ہے مہر گویا مری زباں پر
لگا کے باتوں میں اُن کو لائیں جو حرف مطلب کا کچھ زباں پر
تو ایسی کہدیں ٹھکانا جس کا لگے زمیں پر نہ آسماں پر
تپِ محبت میں سخت جانی کا یہ اثر ہے دل طپاں پر
کہ شکل سوہان پڑ گئے ہیں ہزاروں کانٹے مری زباں پر
اُٹھائے سو زخم ہر نمط ہیں۔ یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں
کہ مثلِ قط گیر خط بہ خط ہیں۔ ہنوز باقی ہر استخواں پر
خلش یہی خار خار غم کا رہا۔ تو مرقد پہ میرے سبزہ
بتیں ہے مانند برگ خرما اُگے گا نشتر لئے زباں پر

کہا یہ سو بار دل کو رو کر۔ حریف مت تُرک چشم کو کر
سو آخرش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہا ہے مژگاں کی ہر سناں پر
وہ چشمِ ابرو تمھارے زیبا کہ۔ قاب قوسین جن سے ادنےٰ
یہ خال پیشانی کیوں تمھارا۔ نہ فرق لے جائے فرقداں پر
کہے ہے داغ جنوں کہ چمکوں۔ جو تیرے سر پر یہ دشت ہا ہوں
چراغ وحشت سرائے مجنوں کروں میں روشن چراغداں پر
بنا بگولے کو برج آسا۔ قریب ناقہ کے قیس پہنچا
پر اُترے محمل سے کیونکہ لیلےٰ۔ کہ پردہ کھلتا ہے ساربان پر

کہاں رہی مجھ میں جاں ہے باقی کہ ہے دھواں ہو کے لب پہ آتی
جو ذوق آنسو کی بوند ٹپکی۔ ہمارے داغِ دلِ طپاں پر

جب وہ پوچھے کہ ہے عشق کون مرے جوبن پر
میں کہوں میں۔ تو کہے میں کہ چھری گردن پر
جو ترے دوست پہ تجھ بن ہے گذرتی ظالم
وہ مصیبت نہ ہو دنیا میں کسی دشمن پر
تیرے دندانِ مسی زیب کی دیکھی جو بہار
پڑ گئی اوس سی گلشن میں گل سوسن پر

اے دل وہ ہر غمزۂ پنہاں عیاں نہ کر
آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر
آہوں میں دودِ دل جو نکالوں تو وہ کہے
او تفتہ جاں! ہوا ہو یہاں سے دھواں نہ کر

ایک غزل کے دو مطلع مجھے ایک مجہول آدمی نے سُنائے اور کہا کہ اُستاد کے ہیں۔ میں نے یاد کر لئے اور اُستاد سے جا کر پوچھے۔ فرمایا۔ اُہو۔ لڑکپن کے ہیں بھئی۔ بلکہ بچپن کے۔ اب تو سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ لکھ لو۔ کبھی درست کریں گے۔ وہ بھی عجب دن تھے ہم مشاعرہ میں گئے۔ یہ غزل پڑھی۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ برہان الدین خاں زار۔ میر غالب علی خاں سیّد۔ تشریف لائے۔ یہ بزرگ اُس زمانہ میں اراکین مشاعرہ بلکہ اراکین شہر شمار ہوتے تھے۔ لوگوں

نے اُن سے کہا۔ اُنھوں نے پھر ہمیں پاس بُلایا۔ دل بڑھایا۔ اور فرمائش کرکے دوبارہ غزل پڑھوائی۔ کیا لوگ تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

نامۂ شوق کو مرے باندھے جو تو نے بال و پر مصحف روئے یار میں دیکھا ہے جو خال پر	کیوں ارے مُرغ نامہ بر تجھ کو ہوئے وبال پر لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پر
ہیں ہُما کے سر پہ افسر اُن ہواگیروں کے پر اُن کو لے پر عرش اعظم پہ اڑاتے ہیں مُرید	جل گئے جن طائروں کو ہیں ترے تیروں کے پر کیا غضب لائیں خدا جانے جو ہوں پیروں کے پر
شرحِ بختِ برگشتہ گر کروں رقم پھر کر	تیر بازگشتی ہو۔ ہاتھ میں قلم پھر کر
رکھ لیا اُس نے چمن میں گل جو سر پر توڑ کر	میں بھی حاضر ہوں کہا غنچہ نے یوں منہ پھوڑ کر
بعد مردن آ چکے روئے کو سُن کر گور دور	جیتے جی کہتے ہو چل صورت تری در گور دور
دل شوریدہ سر نے خاک اُڑا کر	بیاباں رکھ لیا سر پر اُٹھا کر
خفا تو ہو نہ وقتِ ذبح میرے تلملانے پر	کہوں کیا لوٹتا ہوں میں ترے بازو دبانے پر

سین مہملہ

یہ دو غزلہ اُنھیں مسوّدوں سے نقل ہوا ہے جن پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی۔

کونسا ہمدم ہے تیرے عاشقِ بے دم کے پاس ہم کو کیا ساقی جو تھا جامِ جہاں میں جم کے پاس	غم ہے اُس کے پاس ہمدم۔ اور وہ ہے دم کے پاس تیرا جامِ بادہ ہو۔ اور تو ہو اس پُرغم کے پاس

ہم کو کیا ساقی جو تھا جامِ جہاں میں جم کے پاس

نسخہ: ساقیا ہے کیا جو تھا جام جہاں میں جم کے پاس

خط کہاں آغاز ہے پشتِ لبِ دلدار پر
ہیں جناب خضر آئے عیسیٰ مریم کے پاس

مردمک کے پاس ہے یا اشک خونیں کا ہجوم؟
یا دھرے یاقوت ہیں یہ دانۂ نیلم کے پاس

روح اُس آتش بجاں کی بعد مردن جوں پتنگ
آئے گی اُڑ کر چراغِ خانۂ ماتم کے پاس

کس کی قسمت ہے کہ زخمِ تیغِ قاتل ہو نصیب
جان سے جائیں۔ نہ جائینگے مگر مرہم کے پاس

کیا مزے لے لے کے گل کھائیں اگر آجائے ہاتھ
یہ جو چھلا آپ کی اُنگلی میں ہے خاتم کے پاس

زلف سے بے وجہ خطِ سبز ہم پہلو نہیں
ہے لہکتا عشق پیچاں سنبلِ پُرخم کے پاس

واہ صیادِ اجل۔ اور واہ صیادی کا پیچ
کھچکے ہے اسفندیار آیا کہاں رستم کے پاس

دیکھو فیاضِ ازل نے کیا دیا آنکھوں کو فیض
کاسہ در کف ہو کے یم آتے ہیں اُنکی نم کے پاس

ہے جو قسمت میں تو دریا بھی کبھی ہو جائے گا
آلگا ہے اپنا قطرہ بھی کنارِ یم کے پاس

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل
بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس پرغم کے پاس

تیر و کماں ہے گر بُتِ ناوک فگن کے پاس
آہ و قدِ خمیدہ ہے اُس خستہ تن کے پاس

شب جانِ زار رُک گئی لب پر دہن کے پاس
پھر اُٹھ کے رہ گیا یہ مسافر وطن کے پاس

یہ جوئے خوں رواں نہیں۔ دیکھو ہے رو رہا
تیشہ سر اپنا رکھ کے سرِ کوہکن کے پاس

اس آرزو میں جان ہوں دیتا کہ لے کے جام
پہنچوں کبھی لبِ بتِ پیماں شکن کے پاس

انگشت شمع کیوں نہ اُٹھے بہرِ فاتحہ
یہ ڈھیر ہے پتنگ کا پائے لگن کے پاس

میں تو اسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو
شب کیا ہٹا لیا مرے لا کر دہن کے پاس

چمکے گی تا بہ حشر ہماری لحد میں آگ
چاک جگر میں دیکھنا چاک کفن کے پاس

ق
میں نے کہا کہ بوسہ بھی دو! ادب سے ہیں
لا سکتا اپنا منہ نہیں چاہِ ذقن کے پاس

ہنسکر کہا کہ جاتا ہے پیاسا کوئیں پہ آپ
یا جاتا ہے کنواں کسی تشنہ دہن کے پاس

اے ذوق صدقے جائیے پیکِ خیال کے
کیا لے گیا اُڑا کے بتِ سیمتن کے پاس

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو اُن کے پاس
بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

چمن سے بعد ہیں۔ جیسے سین و قاف قفس
قفس میں بند ہیں ہم جیسے فائے نافِ قفس

لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کی اُس عہد کی بیاض میں لکھی تھی۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے:-

لبِ شیریں کو ترے جان کے رس چشمِ نرگس
بیٹھی نظروں میں پڑے جائے ہے بس چشمِ نرگس

بوالہوس جیفۂ دُنیا سے بھرا دل نہ ترا
تو نرگس اور تری چشمِ ہوس چشمِ نرگس

صاد مہملہ

سب مذاہب میں یہی ہے نہیں اسلام میں خاص
کہ جہاں عام ہے۔ ہوتا ہے وہاں عام میں خاص

ساغرِ دل کی تو واقف نہیں کیفیت سے
دیکھ عکسِ رُخِ ساقی ہے اسی جام میں خاص

خضر! باتیں ہیں کہ ہے چشمۂ حیوان جان بخش
ہے یہ خاصیت اُسی کے لبِ دشنام میں خاص

شیخ صاحب کے ہیں نزدیک وہ خاصانِ خدا
خدمتی اُن کے ہیں جو زمرۂ خدام میں خاص

کام دن رات ہے عاشق کا ترے ناکامی
کہ دیا تو نے لگا اس کو اسی کام میں خاص

عشق کا جوش ہے جبتک کہ جوانی کے ہیں دن
یہ مرض کرتا ہے شدت انھیں ایام میں خاص

ذوق اسمائے الٰہی ہیں سب اسمِ اعظم
اس کے ہر نام میں عظمت ہے نہ اک نام میں خاص

ضاد معجمہ

پر کترنے کو جو صیاد نے چاہی مقراض
ہاتھ ملتی تھی مرے حال پہ کیا ہی مقراض

بحر و بر میں نہیں کس کو ہوسِ قطع و برید
ناخنِ شیر ہے خنجر دمِ ماہی مقراض

گل کترتی ہیں ہزاروں تری آنکھیں کافر
ہے عجب طرح کی اک تیز نگاہی مقراض

کب زباں چلتی ہے اُس بزم میں بدگویوں کی
اُن کے منہ میں یہ زباں ہے کہ الٰہی مقراض

محضر خوں مرا سارا ہے کتر کر پھینکا | دے گی اس ظلم کی محشر میں گواہی مقراض
پاس کیا قطع تعلق ہیں۔ کہ یکساں سب سمجھے | قطع میں جامۂ درویشی و شاہی مقراض

رشتۂ عمر کیا قطع سراسر اے ذوق
کھو سکی شمع کے دل کی نہ سیاہی مقراض

اس غزل میں ایک شعر اور بھی کہا تھا:-

اُڑتے پرزے ہیں جگر کے کبھی پڑھتا ہوں جو آہ | ہوتا حق میں ہے مرے مطلع آہی مقراض

اسے میں نے لکھکر تامل کیا۔ فرمایا کیا سوچتے ہو؟ میری ابتدا تھی۔ کچھ نہ بولا۔ فرمایا۔ آہی سبزواری بڑا شاعر ہوا ہے۔ پھر آپ ہی کہا۔ کاٹ دو۔ شاید اور لوگ بھی نہ سمجھیں۔ ہم تو سب ہی کے لئے کہتے ہیں ٭

عین مہملہ

ذوق کیونکر ہو اپنا دیواں جمع | کہ نہیں خاطرِ پریشاں جمع

قاف

پھر کرا دھر اُدھر بھی نہ اپنا گیا قلق | لفظِ قلق کی طرح سے یوں ہی رہا قلق

کاف

جو کھل کر اُن کی زلفیں بال آئیں سر سے پاؤں تک | بلائیں آکے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک
ہم اُن کی چال سے پہچان لیں گے انکو برقع میں | ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک
یہ جتنے سرو ہیں۔ سب اُن کے قد پر زہر کھاتے ہیں | چمن میں سبز کیونکر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک
مرا دل ایک۔ دو دل اُس خوش ادا کی کس ادا کو میں | کہ ہیں واں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک
سراپا شوق جائیں سر کے بل ہم جن کے جلسہ میں | مثال شمع وہ ہم کو جلائیں سر سے پاؤں تک

نہ ہوں بے پردہ۔ تو بھی وہ کھڑے ہو ہو کے شوخی سے
پھبن چلمن سے در پردہ دکھائیں سر سے پاؤں تک

بنایا اس لئے اس خاک کے پُتلے کو تھا انساں
کہ اس کو درد کا پُتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

سراپا پاک ہیں دھوئے جنھوں نے ہاتھ دنیا سے
نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پاؤں تک

مزا اُتنا ہی ذوق افزوں ہو۔ جتنے زخم افزوں ہوں
نہ کیوں ہم زخم تیغ عشق کھائیں سر سے پاؤں تک

پھر تو آئے خیر سے ہم جا کے اُس مغرور تک
پر اُچھلتا ہی رہا اپنا کلیجہ دُور تک

صفحۂ دہر پہ یکدل نہ ہوا ایک سے ایک
دل کے دو حرف ہیں سو بھی ہے جُدا ایک سے ایک

گاف

پُرانی غزل ہے۔ ۷ شعر تھے۔ دو یاد رہ گئے۔ وہی لکھ دیتا ہوں:-

بینی و عارض و ابرو سے ہیں شاخ وگل وبرگ
یوں عیاں اس چمن رو سے ہیں شاخ وگل وبرگ

بینی اور وہ دہن خندہ زن اور تارک لب
لکھے گویا قلم مو سے ہیں شاخ وگل وبرگ

لام

پھنسے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار میں دل
بلا سے گر ہو نوالہ دہان مار میں دل

بغل میں جیسا مرا دل بغل کا دشمن ہے
نہ ایسا ہو کسی دشمن کے بھی کنار میں دل

نکل نہ جائے دم اضطراب سینہ سے
برنگ شعلہ کہیں۔ آہ شعلہ بار میں دل

ہمیشہ روزن سینہ سے کیوں ہے چشم براہ
اگر نہیں کسی مہوش کے انتظار میں دل

ترا سنگار بھی ہے وہ بلا کہ جائے گھر
پروئے زلف مسلسل کے تار تار میں دل

خدا بچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے
کہ میرا دشمن جاں ہے مری کنار میں دل

بغیر مارے نہ چھوڑے گی دل کو کافر زلف
کہو یہ دل سے کہ جائے نہ مار مار میں دل

اگر نہ جبر کروں اختیار اے ناصح
تو کیا کروں کہ نہیں میرے اختیار میں دل
اڑے گا مثل شرر ٹکڑے ہو کے سنگ مزار
رہا اگر یوُں ہی گرم تپش مزار میں دل
برنگ غنچۂ پیکان و غنچۂ تصویر
ہوا شگفتہ نہ اپنا کسی بہار میں دل
فلک کے رنگ سے ظاہر ہیں ماہیٔ آثار
خوش اپنا کیونکہ ہو اس نیلگوں حصار میں دل
برنگ بیضۂ نور ورتہ۔ توڑے دل اس نے
ہزاروں۔ ایک ہمارا ہے کس قطار[1] میں دل
ہزار دشمن جاں سے ہے ایک دوست بُرا
جو پوچھو کون ہے وہ؟ میں کہوں ہزار میں دل
نہوتیں خلد میں حوریں تو رہتا خلد میں کون؟
لگے ہے صحبت خوبانِ گلعذار میں دل
یہ جسم زار ہے یا میرے پیرہن میں ہے تار
گرہ ہے تار میں؟ یا میرے جسم زار میں دل

ن غزل رنگ کی مانند اڑ گئے شگفتہ مزار

اُٹھا بھی لائے اگر ہمنشیں مجھے اے ذوق
رہیگا میرے عوض میرا کوئے یار میں دل

ازل سے یُوں دل عاشق ہے نور کی قندیل
کہ جیسے عرش خدائے غفور کی قندیل
سمجھ وہ دُرِّ بناگوش نور کی قندیل
خجل ہے اختر صبح نشور کی قندیل
ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے
کسی کے باب کمال ظہور کی قندیل
جہاں ہے خانۂ عشرت! ابھی ہو اس کا فروغ
کہ لٹکے اس میں سرِ پُرغرور کی قندیل
رہے ہے جوں قمر منخسف سدا بے نور
سیاہ بختوں کے بالین گور کی قندیل
پڑے جو عکس ترا جام میں تو ہو روشن
حباب بادہ تجلّی سے طور کی قندیل
عیاں ہے یوں مرے روز سیاہ میں خورشید
کہ جیسے شب کو نظر آئے دُور کی قندیل
سوائے دل کے ہو نارنج باغ خلد سے بھی
کبھی پسند نہ اُس رشک حور کی قندیل

ن اٹھا والائے مجھے بمنزل سے ذوق

[1] قطار۔ بہار نوروز میں لوگ ہار جیت پر انڈے لڑاتے تھے۔ اس کے کئی طریقے تھے ایک یہ بھی تھا کہ دو آدمی ۲۰۔۲۰۔۳۰۔۳۰ انڈے لے کر اپنی اپنی قطار باندھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قطار سے ایک ایک انڈا لیتا تھا۔ اور حریف سے لڑایا جاتا تھا۔ جس کا انڈا آخر کو ٹوٹتا۔ اُس کی ہار ہوتی تھی۔ حریف ٹوٹے ثابت سب انڈے لے لیتا تھا۔ اسے قطار لڑانا کہتے تھے۔ یہ سب ایران۔ توران۔ افغانستان سے ہو کر ہندوستان میں آئی تھی +

اُڑے جو آہ کے ہمرہ نکل کے پارۂ دل ‌ ‌ ‌ ہوئے ہوا میں وہ صورت طیور کی قندیل
وہ تیر ہیں یہ مرے نالۂ قیامت زا ‌ ‌ ‌ کہ اُن کے رکھنے کو لازم ہے صور کی قندیل
نسیم کیا ہے۔ کہ روضہ میں خفتہ جانوں کے ‌ ‌ ‌ نہ گل ہو بادسے آواز صور کی قندیل

سمجھتا قدر ہے ناقص کب اس غزل کی ذوق
یہ روشن آپ نے کیوں پیش کور کی قندیل

یہ غزل لڑکپن کی ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی:-

دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کہ لوں گل ‌ ‌ ‌ زیبائش سر کو ہیں مرے داغ جنوں گل
ہوں زیر قدم خار۔ بہ سر داغ جنوں گل ‌ ‌ ‌ چاہیے ہے جنوں بوؤں سدا خار جنوں گل
میں کشتہ ہوں لعل لب پان خوردہ کا کس کے ‌ ‌ ‌ نکلے ہے مری خاک سے آغشتہ بخوں گل
سو ٹکڑے ہیں ایڑی کے برنگ گل صدبرگ ‌ ‌ ‌ کیا دشت نوردی میں کترتا ہے جنوں گل
اُس گل میں نہ پایا اثر بوئے محبت ‌ ‌ ‌ سو بار سنگھائے اُسے بڑھ بڑھ کے فسوں گل
ہے روشنئ خانۂ دل۔ سوز محبت ‌ ‌ ‌ زاہد تو بتا شمع حرم کیونکہ کروں گل
پیکاں تو ہے دلدوز۔ سر سینہ ہے سوفار ‌ ‌ ‌ اُس تیر سے ہے دل میں دروں غنچہ بروں گل

اے ذوق محبت میں کسی غنچہ دہن کے
گلدستہ سے بھی ہیں مرے ہاتھوں میں فزوں گل

آئینۂ فلک میں ہے عکس چراغ دل، ‌ ‌ ‌ خورشید ہو نمود ہوا بل بے داغ دل

میم

عالم نوجوانی کی غزل ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک مشاعرہ میں زمین مرقوم الذیل طرح ہوئی۔ آغاز شباب تھا ہم نے کہا کہ زمین تو گرم ہے مگر تاثیر ٹھنڈی ہے۔ میر مشاعرہ نے کہا خیراب تو ہوگئی۔ ہم نے کہا اچھا ہم تو دو غزلیں کہدینگے۔ مگر دیکھنا سب کیا کہیں گے جب مشاعرہ ہوا تو جو جلسہ میں آیا نالاں آیا۔

شمع نازاں نہ ہو اک رات بہا آنسو گرم
برسوں یاں آنکھ سے ٹپکا ہے مرے لو ہو گرم

اے جنوں! ہے خبر موسم گل ہر سو گرم
دم تو تو لینے دے مجھ کو۔ نہ کر اتنا تو گرم

آتش رشک سے اُس کاکل مشکیں کے صبا
جل گیا نافہ میں اس درجہ ہوا لو ہو گرم

آبلے سینۂ دریا میں ہوئے جل کے حباب
دیدۂ تر نے بہائے یہ غضب آنسو گرم

اے صبا نکہت گل لے کے چمن کو پھر جا
کیا کروں سر کو مرے کرتی ہے یہ خوشبو گرم

آتش حسن کا پتلا ہے تو اے رشک پری
تاب رخ تیری بھبوکا ہے بلا ہے تو گرم

توسن ناز ترا ہر قدم اے رشک غزال
کیوں نہ ہو تیز کہ رکھتا ہے مزاج آہو گرم

فاختہ سوز محبت سے ہوئی جل کے ہے خاک
کھینچے ہے دل سے پر اب تک نفس کو کو گرم

مشعل افروز جنوں کون ہو مجنوں کے لئے
گر نہ ہو گرمیٔ وحشت سے دل آہو گرم

ق
سرد مہری کا تری ہو جو خنک دل کشتہ
ہووے گلگشت سے کیا اُس کا دل اے گلرو گرم

تابش نار جہنم سے سوا اُس کو لگے
ہمرہ باد سحر بوئے گل شبو گرم

ق
سرد مہری سے رکھا اپنی خنک دل تو نے
گرم جوشی سے کیا تو نے بت دلجو گرم

اپنے کشتے کی کرامت کو ذرا دیکھ آ کر
ایک پہلو ہے اگر سرد تو اک پہلو گرم

ذوق دل میں یہ تپ عشق۔ کلام ایسا خنک
عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

بل بے اے آتش غم۔ دل کو کرے یہ تو گرم
کہ زمیں پشت سمک تک ہو نہ پہلو گرم

لطف بوسہ نہ رہا۔ ہم پہ ہوا جب تو گرم
شربت قند دیا کر کے بر آتش خو گرم

تن رہا یوں ہی تپ غم سے اگر گرم مرا
سیخ آہن کی طرح ہونگے بدن پر مو گرم

نشتر جل کے وہیں کشتۂ فولاد ہوا
نکلا یہ آتش سودا سے مرا لو ہو گرم

کٹ سکا صید محبت کا نہ قاتل سے گلا
اُس نے پتھر پہ یہ رگڑا کہ ہوا چاقو گرم

آتش دل سے پس از مرگ برنگ شعلہ
خاک عاشق سے نکلتا ہے گل خودرو گرم

مہروش بل بے ترے حسن جہانتاب کی تاب
رخ سے گرم آئینہ ہو۔ آئینہ سے زانو گرم

کیا کہوں نامۂ جانسوز کی اپنے تاثیر
جل گیا بس یہ کبوتر کا ہوا بازو گرم

سرِ مجروح کو ٹھکرا کے گیا وہ۔ اور میں
چونکا اُس وقت کہ جب منہ پہ بہا لوہو گرم

دستِ خورشید کی رعشہ سے سپر جائے چھوٹ
کھینچ کر تیغ کو جب ہو وہ ہلال ابرو گرم

دل عاشق کے جلانے کا ہے سارا ساماں
بینی شعلہ ہے تری۔ رنگ بھبوکا۔ رُو گرم

کونسا سوختہ جاں صبح سے ہے گرم فغاں
کہ ہوا آتی ہے کوچہ سے ترے گلرو گرم

ہم تو سنتے تھے سدا شُعْلَۃٌ حُمُوضٍ بَارِدٌ
ذوق ہوتا ہے وہ کیوں ہو کے ترش ابرو گرم

پابندِ جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

ہوتی نہ یاد زُلف تو خطِ شکستہ میں
لکھتے الف خطوں کی نہ پیشانیوں میں ہم

زنجیر میں بھی نالۂ زنجیر کی طرح
جوشِ جنوں سے رہتے ہیں جولانیوں میں ہم

پائی نہ تیغ عشق سے ہم نے کہیں پناہ
قرب حرم میں بھی ہیں تو قربانیوں میں ہم

دوزخ بھی جائے نعرۂ ھَلْ مِنْ مَزِیْد بھول
لائیں جو آہ کو شرر افشانیوں میں ہم

پاکوبیوں کو مژدہ ہو زنداں کو ہو نوید
پھر ہیں جنوں کے سلسلہ جنبانیوں میں ہم

تم بھی نہیں جگر پہ رہی۔ اس قدر رہے
سرگرم سوز عشق کی مہمانیوں میں ہم

مطلب سے اپنے کون ہے آگاہ جُز خدا
جوں خطِ سرنوشت ہیں پیشانیوں میں ہم

ہیں آئینہ میں صورت تصویر آئینہ
آئینہ رو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

ہو وہ عزیز سورۂ یوسف سے بھی سوا
رکھ دیں تری شبیہ جو کنعانیوں میں ہم

کیا جانیں ہم زمانہ کو حادث ہے یا قدیم
کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

کیوں جی کے ہجر میں ہوئے شرمندہ یار سے
اب مر رہے ہیں اس کی پشیمانیوں میں ہم

پردہ میں چشم مست کے سرخوش ہیں جو مدام
شربُ الیہود[1] کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

[1] شربُ الیہود۔ یہودی لوگ کئی ہزار برس سے ایسی حالت میں ہیں کہ جس ملک میں ہوں کمزور رہتے ہیں اور اسی واسطے خواہ عیسائیوں خواہ مسلمانوں کے ماتحت ہوں خوشحالی نہیں ظاہر کرتے۔ عیسائیوں سے زیادہ تر دبے رہتے ہیں۔ شراب بھی کم پیتے ہیں اور چھپکر پیتے ہیں۔ اہل ایران نے شربُ الیہود اصطلاح مقرر کردی یعنی کم پینی اور چھپکر پینی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم شراب نہیں پیتے چشم مست کی یاد میں دربردہ سرخوش رہتے ہیں۔ گویا ہماری میخواری یہودیوں کی شراب خواری ہے ✣

اُس خال رُخ پہ جمع ہوئے قطرۂ عرق
ہندو اسیر دیکھیں ہیں دُرّانیوں میں ہم

سینہ کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں
مصروف زخمِ دل کی نمکسرانیوں میں ہم

ہیم کدورتِ دلِ صیاد گر نہ ہو
کیا کیا اڑائیں خاک پرافشانیوں میں ہم

دکھلائیں روزِ حشر کو بین السطور سے
اپنے سیاہ نامہ کی طولانیوں میں ہم

جا سکتے ضعف سے نہیں کوچہ میں اُس کے ذوق
بھجوائیں کاش گریہ کی طغیانیوں میں ہم

نون

در جواب غزل [illegible] شاہ نصیر

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں

دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہو جام جس کے ہاتھ میں وہ جم سے کم نہیں

اُس زلف فتنہ زا کے لئے اے مسیح دم
کچھ دستِ شانہ پنجۂ مریم سے کم نہیں

زیبا ہے روئے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں
اپنی خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں

سرعت ہے نبض کی رگِ سنگِ مزار میں
دل کی تپش کچھ اب بھی تپِ غم سے کم نہیں

وحشی کو تیری چشم کی مژگانِ ہر غزال
صحرا میں تیز ناخنِ ضیغم سے کم نہیں

ہوتی ہے جمع زر سے پریشانی آخرش
درہم کی شکل صورتِ درہم سے کم نہیں

ساقی ملے ہزار فلاطوں ہیں خاک میں
جو خم بنے ہے قالبِ آدم سے کم نہیں

اُس حور وش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا
لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں

شورابۂ سرشک میں ڈوبا ہوا ہے دل
تیزاب میرے زخم پہ مرہم سے کم نہیں

ہاتھوں سے تیرے پارۂ الماس زخمِ دل
مجھ کو تو جلوۂ گل و شبنم سے کم نہیں

اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھئے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

ہاں تا تل دم ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

تشنۂ دشتِ محبت کے لئے اس لب سے
کوئی دنیا میں عقیق یمنی خوب نہیں

گل پریشاں ہوا ہنس ہنس کے چمن میں آخر
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

خوبیاں یوں تو ہیں اس عالمِ تصویر میں سب
اک مگر نازسے یہ کم سخنی خوب نہیں

چشم کہتی ہے تری جنبش مژگاں سے کہ دیکھ
سر بہ بیمار کے یہ سینہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے۔ ہے کسی میخوار کا دل
محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

تاب دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر
کوئی کھا جائے جو ہیرے کی کنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب۔ مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خلش خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ گل دعوئے نازک بدنی خوب نہیں

اُٹھے ہی جائیگا اس دل سے دھواں آہ کے ساتھ
جب تلک جلنے کا یہ سوختنی خوب نہیں

کون آتش نفس اے ذوق چمن سے گزرا
آج جو سرد نسیم چمنی خوب نہیں

۱۸۵۲ء میں مرزا خدا بخش ایک معزز شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ شروع کیا حضور سے غزل کا وعدہ لیا۔ اُستاد مشاعرہ میں نہ جاتے تھے اُن سے بھی بہت کہا اور اقرار لیا۔ مطلب یہ تھا کہ آئیں گے تو سینکڑوں آدمی سُننے کو آئیں گے مشاعرہ کو رونق ہو جائیگی شاہزادہ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے۔ مگر اُستاد کو مانتے تھے۔ غرضکہ مشاعرہ میں گئے غالب مرحوم۔ مولوی امام بخش صاحب صہبائی وغیرہ وغیرہ اچھے اچھے اشخاص آئے حضور بالا بالا تشریف لائے اور پس پردہ بیٹھے ✢

حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بڑے شائق سخن تھے اور سخن شناس تھے۔ اُنھوں نے اُستاد سے کہا۔ کیوں حضرت مشاعرہ شروع ہو؟ اُستاد نے کہا۔ بسم اللہ۔ چنانچہ بموجب آئین مشاعرہ پہلے شمع مشاعرہ وسط مجلس میں رکھی گئی۔ ایک خواص خاص حضور کا شمع کے پاس باادب بیٹھا اور حضور کی غزل سُنائی (اکثر مشاعروں میں یہ غزل خلیفہ اسمٰعیل مرحوم پڑھا کرتے تھے) ✢

اُستاد جب حضور کی غزل مشاعرہ کے لئے کہتے تھے تو اپنی غزل اُس طرح میں نہ کہتے تھے۔ اور کبھی کہنی بھی پڑتی۔ تو اپنی غزل کے ایسے شعر پڑھتے کہ حضور کی غزل پھیکی نہ پڑجائے اب بھی نہ کہی تھی۔ شمع سامنے آئی تو کہا۔ مجھے تو فرصت نہیں ہوئی۔ کیا کہوں۔ غالب مرحوم مولوی امام بخش صاحب اور اور اشخاص نے فرمائش کی کہ کوئی غیر طرح کی غزل ہی پڑھئے۔ سب نے بہت کہا تو میں ایک بیاض لیتا گیا تھا۔ وہ لیکر غزل مرقومۃ الذیل پڑھی۔ تعریفوں کا غل تھا کہ دوسرا مصرع سُنائی نہ دیتا تھا۔ در و دیوار بول رہے تھے۔ ع

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدو سے ہیں

حضور کی غزل جو اس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی ایک شعر اُس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولے گا۔

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو	ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

دلی میں تو ، پشت خاندان زیر زمین آباد ہے۔ سکندرہ میں اکبر۔ آگرہ میں شاہجہاں۔ اورنگ آباد میں عالمگیر۔ اس غریب کو کوئی جگہ پسند نہ ہوئی۔ پسند کہاں؟ رنگون۔ جَلَّ شَانُہٗ جَلَّ جَلالُہٗ

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدو سے ہیں	اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
مردار ہیں وہ طائر سدرہ ہی کیوں نہ ہوں	تیر نگاہ یار کی جو دُور زد سے ہیں
خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ	روشن ضمیر ملنے ہر اک نیک و بد سے ہیں
وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تمنّا	بنیاد میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں
جاں دادگان عشق سے پوچھو فنا کی راہ	اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں

لہ غزل مذکور بادشاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی۔ مذکورۂ بالا شعر اُس کا جب مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ عبرت سے لہو ٹپک پڑتا ہے۔ دیکھو! خانہ برباد کا واقعہ بھی اُسی پسند پر ہوا۔ کابل میں موا ہوتا۔ بابر دادا کا مقبرہ موجود تھا۔ دکن میں موا ہوتا تو اورنگ آباد میں عالمگیر کا مقبرہ تھا۔ اکبر آباد بھی دار السلطنت تھا وہاں مرتا شاہجہاں کا مقبرہ تھا۔ سکندرہ پاس تھا وہاں مرتا اکبر کے دامن میں سوتا۔ لاہور میں آن مرتا جہانگیر کی خوابگاہ حاضر تھی۔ موا تو کہاں؟ رنگون میں۔ خدا مغفرت کرے اُستاد مرحوم نے کیا خوب کہا تھا

لاشے کو دفن کیجے۔ میرے کہ پھینک دیجے
مردہ بدست زندہ جو چاہیے سو کیجے

چشم ثمر ہے سرو سے اُن کو جو بے وقوف
رکھتے امید دوستی اُس سرو قد سے ہیں

دو گالیاں کہ بوسہ۔ خوشی پر ہے آپ کی
رکھتے فقیر کام نہیں ردّ و کد سے ہیں

بر میں خنک دلوں کے ہو گر خرقۂ فقیر
سمجھو کہ کرتے برف کی پوشش نمد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس میں میسر ہو وصل یار
بہتر سمجھتے ہم اُسے عمر ابد سے ہیں

جتنے مزے ہیں یاں روشِ نشۂ شراب
ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ہر چند ناتواں ہیں۔ مگر رکھتے دل قوی
ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں

جانِ لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری۔ عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہر داغ عشق
ہم کرتے ذوق عشق کا دعوے سند سے ہیں

ہے چشم تیری مست۔ قدح گیر باغ حسن
عارض پہ خط ہے طوطیٔ تصویر باغ حسن

ہو جاتا دل ہے بیٹھ کے خود گلرخوں میں گل
تاثیر باغ خلد ہے تاثیر باغ حسن

تحریر سرمہ ہے تری آنکھوں میں وقتِ خواب
اے غیرتِ چمن۔ در و زنجیر باغ حسن

پان و مسی و سرمہ و رُخ ہونگے لالہ زار
مشاطہ باغباں ہے یہ تدبیر باغ حسن

تبخالہ لب پہ گرمیٔ بوسہ سے ہے کہاں
ہے گلرخو! یہ غنچۂ دلگیر باغ حسن

اے رشک باغ طاقِ دو ابرو کا تیرے عکس
دریائے آئینہ میں ہے تعمیر باغ حسن

سیر خزاں جو چاہے تو اے ذوق دیکھ لے
اُس نازنیں کا جلوۂ تغییر باغ حسن

گئیں یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں
پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دل کے ہم بس میں

کبھی ملنا۔ کبھی رہنا الگ، مانند مژگاں کے
تماشا کج سرشتوں کا ہے کچھ اخلاص آپس میں

توقع کیا ہو جینے کی ترے بیمار ہجراں کی

نہ جنبش نبض میں جس کے۔ نہ گرمی جس کے ملمس میں
دکھائے جبرہ دستی آہ بالا دست گرا پنی
تو مارے ہاتھ دامانِ قبائے چرخ اطلس میں
جو ہے گوشہ نشیں تیرے خیال بیت ابرو میں
وہ ہے بیت الصنم میں بھی تو ہے بیت المقدس میں
کرے لب آشنا حرف شکایت سے کہاں تک دم؟
ترے محزونِ بے دم میں، ترے مفتونِ بیکس میں
ہوائے کوئے جاناں لے اُڑے اس کو تعجب کیا
تن لاغر میں ہے جاں اس طرح جس طرح بُو خس میں
مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُن کے
ہزاروں دے چکے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

جو مضموں ذوق دیوانِ دوعالم میں ہوئے موزوں
حواسِ خمسہ ہیں انساں کے وہ بند مخمس میں

بلائیں آنکھوں سے اُن کی مدام لیتے ہیں
ہم ان کی زلف سے سودا جو وام لیتے ہیں
ترے خرام کے پیرو ہیں جتنے فتنے ہیں
شب وصال کے روز فراق ہیں کیا کیا
ترے اسیر جو صیاد کر سکتے ہیں فریاد
ہم اُن کے زور کے قائل ہیں زور بازو میں
جھکائے ہے سر تسلیم ماہ نو۔ پر وہ
ترے قتیل بتاتے نہیں تجھے قاتل
قمر کا داغ بھلا آئے کس حساب میں واں

ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں
تو اصل و سود وہ سب دام دام لیتے ہیں
قدم سب آن کے وقت خرام لیتے ہیں
نصیب مجھ سے مرے انتقام لیتے ہیں
تو پھر وہ دم بھی نہیں زیر دام لیتے ہیں
جو عشق میں دل مضطر کو تھام لیتے ہیں
غرور حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں
جب اُن سے پوچھو اجل ہی کا نام لیتے ہیں
وہ مول ایسے ہزاروں غلام لیتے ہیں

ہمارے ہاتھ سے اے ذوق وقتِ مے نوشی
ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانہ میں — شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانہ میں
میں ہوں وہ خشتِ کہن مدت سے اس ویرانہ میں — برسوں مسجد میں رہا۔ برسوں رہا بتخانہ میں
مستی و ناآشنائی وحشت و بیگانگی — یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانہ میں
میں وہ کیفی ہوں کہ پانی ہو تو بنجائے شراب — جوش کیفیت سے میری خاک کے پیمانہ میں
ہوش کا دعویٰ ہے بیہوشوں کو زیرِ آسماں — خم نشیں ہیں مثلِ افلاطوں سب اس خمخانہ میں
پتھروں میں ٹھوکریں کھاتی ہے ناحق سیلِ آب — پوچھو کیا لے جائیگی آکر مرے ویرانہ میں
عشق کو اے حسن اگر نشو و نما منظور ہو — سبز نخلِ شمع ہو خاکسترِ پروانہ میں
برقِ خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری — ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانہ میں
کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحادِ حسن و عشق — زلفِ واں شانے نے کھینچی درد ہے یاں شانہ میں

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے
ذوق ہر بت قابلِ بوسہ ہے اس بتخانہ میں

اس گلستانِ جہاں میں کیا گلِ عشرت نہیں — سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں
علم جس کا عشق اور جس کا عمل وحشت نہیں — وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابلِ صحبت نہیں
خواہ گردش ہے زمیں کو خواہ پھرتا ہے فلک — پر ہمیں زیرِ فلک سر منزلِ راحت نہیں
بسملِ تیغِ محبت کا لبِ ہر زخمِ دل — ہوتا وا۔ بے شور وا ویلا و واحسرت نہیں
مریں گر پانی چُوا دے یار اپنے ہاتھ سے — مرگ کی تلخی سے شیریں تر کوئی شربت نہیں
دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال — چشم وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں
کہتے ہیں مر جائیں گر چھوٹ جائیں غم کے ہاتھ سے — پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں
ایک حسرت تو برستی ہے کبھی برسی کے دن — ورنہ روتا ابر بھی اپنے سرِ تربت نہیں
ہے نوشتہ میں ترے بیمار کے صحت کہاں — اُس کے نسخہ میں دوا کے لفظ کو صحت نہیں

کھا کے زخمِ تیغِ قاتل جو بجا لائے نہ شکر
کوئی بھی اُس سے زیادہ کافرِ نعمت نہیں

خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار
ایک ساعت مثلِ ریگِ شیشۂ ساعت نہیں

خانۂ ہستی کا اپنے صحن ہے دشتِ عدم
روز کر لیجے چہل قدمی مگر فرصت نہیں

میری وحشت پاؤں پھیلائے تو پھر دونوں جہاں
ہوں اگر یک عرصۂ میداں تو کچھ وسعت نہیں

ایک دل اور اُس پہ اتنے بارِ غم یا اللہ رے دل
اور اس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

ذوق اس صورت کدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں
کوئی صورت اپنے صورتگر کی بے صورت نہیں

ن: نعمت

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں۔ جیسی خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو!
دل خانہ خراب کی باتیں

واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد
کر شراب و کباب کی باتیں

حرف آیا جو آبرو پہ مری
ہیں یہ چشمِ پُر آب کی باتیں

مہ جبیں یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں

تجھ کو رسوا کریگی خوب اے دل
تیری یہ اضطراب کی باتیں

جاؤں ۔ ہوتا ہے اور بھی خفقاں
سن کے ناصح جناب کی باتیں

جام مے لب سے تو لگا اپنے
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں

سُنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف
کہ یہ ہیں پیچ و تاب کی باتیں

ن: جاؤں کدھر خفقاں۔

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

ایک موقع پر دو فرقوں میں اختلاف کا رنگ بگڑا۔ اُستاد نے ایک فرقہ کے لوگوں کو حق بجانب دیکھ کر طرفِ ثانی کے سرگروہوں کو سمجھایا۔ مگر وہ اپنی جمعیت اور کارسازیوں کے گھمنڈ میں تھے۔ نہ سمجھے۔ قلعہ میں ان نابکاروں کی کارروائیاں دیکھ کر زمانہ کے اہلِ ظرافت

کہا کرتے تھے کہ ۱۲ ٹوپی جمع ہو گئی ہے۔ یعنے قلعہ پر قیامت آئی) جب نصیحت کے نوشدار وسے مزاجوں کی اصلاح نہ کی۔ ناچار اُستاد نے بھی معمولی رفتار سے قدم بڑھایا۔ اور چند جملوں میں جو عطر مطلب تھا۔ بادشاہ سے عرض کیا۔ اثر بھی اس کا اتنا بڑا ہوا کہ حکماً قلم اور زبانیں بند ہوئیں چند روز میں ایسی ہوا چلی کہ ساری ٹوپیاں اُڑ گئیں اُنہی دنوں میں اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ دیکھو ہمارے بزرگ کسی طلسم کو توڑتے بھی تھے تو اتنے ہی دائرہ میں پھیلتے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ ایک آج ہے۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

ہے جی میں اپنے غرۂ جوہر کو توڑ دوں
آئینہ خیال مکدّر کو توڑ دوں

دُنیا سے میں اگر دل مضطر کو توڑ دوں
سارے طلسم وہم مکدّر کو توڑ دوں

میں کاٹ دوں پہاڑ کو۔ پتھر کو توڑ دوں
پر کیونکہ غیرتِ بت کافر کو توڑ دوں

کیا دور جام ہو۔ جو کہے سر پہ دورِ چرخ
گر چاک پر پھرے تو میں ساغر کو توڑ دوں

دشتِ جنوں میں میں جو اُٹھایا ذرا قدم
پائے رفیق و ہمت رہبر کو توڑ دوں

کیا دشمنی ہے اہلِ کرم سے کہے ہے چرخ
یاں تک جھکاؤں شاخ ثمرور کو توڑ دوں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی
باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

ہر موج بحرِ عشق کو یہ بل ہے۔ بل بے زور
کہتی ہے دست و پائے شناور کو توڑ دوں

نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

اے آشنا نہ پوچھ گرانباریِ گناہ
کشتی میں ہوں تو بوجھ سے لنگر کو توڑ دوں

پھر اُس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق
نشتر چبھو کے میں سرِ نشتر کو توڑ دوں

گذرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتیٔ دُخانی میں

رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

وفور اشک اگر سر بہ اوج ہو اپنا
فلک برنگ گل نیلوفر ہو پانی میں

لگاتے تہمت گریہ ہیں دل جلوں کو ترے
یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی میں

کہوں میں اپنی کہانی تو وہ یہ کہتے ہیں
بغیر جھوٹ نہیں اور کچھ کہانی میں

نگاہ کس کی چڑھا دل کہ خوف سے دن رات
گذرتی ہے مجھے دل کی نگاہبانی میں

کہانیاں ہیں حکایات خضر و آبِ بقا
بقا کا ذکر ہے کیا اس جہان فانی میں

نہیں خضاب سے مطلب بگریہ ہوئے سفید
سیاہ پوش ہوئے ماتمِ جوانی میں

وہ سیدھے گھر کو سدھارے اور انکے کھوج میں ہم
پھرے بھٹکتے ہوئے کوئے بد گمانی میں

مبصروں سے کہو دیکھیں کوئے ابروئے یار
کہ جوہر ایسے کہاں تیغ اصفہانی میں

مزا ہے تیغ محبت کے زخم کھانے کا
کرے جو صرفہ نہ قاتل نمک نشانی میں

نہیں جو ضعف سے دم۔ دل سے یہ کہے ہے آہ
کہ بس نہ دے مجھے تکلیف ناتوانی میں

ہمیشہ ہے مجھے سرمایۂ بقا میں فنا
حباب وار ہوں میں آبِ زندگانی میں

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوقؔ
تری زباں کا مزا تیری شعر خوانی میں

[illegible]

تو کہے غنچہ کہ اُس لب پہ دھڑی خوب نہیں
چپ! اکہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

سامنے سے مرے ٹلتا نہیں ناصح جب تک
مغز کھاتا مرا دو چار گھڑی خوب نہیں

فتنہ سرکش ہے جبھی تک کہ تری آنکھوں نے
دست مژگاں سے کوئی ھول اٹھی خوب نہیں

منہ چڑھے تیغ غمِ عشق کی۔ کیا مُنہ ہے ترا
بوالہوس تجھ پہ کوئی ضرب پڑی خوب نہیں

خوبرویوں سے بہت آنکھ لڑی پر افسوس
قسمت اے ذوقؔ کہیں اپنی لڑی خوب نہیں

مطلعؔ مرقومہ حاشیہ کو اُستاد مرحوم نے بیاض خاص میں سے کاٹ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ فرمایا۔ "سودا کے ایک مطلع سے بہت ملتا ہے۔ لڑکپن میں خدا جانے کیونکر ہو گیا تھا۔"

له گہر کو جوہری صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

دیوان سابق میں یہ مطلع چھپ گیا۔ اہل تالیف بیچاروں کو کیا خبر۔ سب کو خدا مغفرت کرے +

سلام کرتے ہیں اُن کو جدھر کو دیکھتے ہیں
اور اُن کو دیکھو ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں

یہ لوگ کیوں مرے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
انھیں تو دیکھیں ذرا۔ وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ اپنی بُرّشِ تیغ نظر کو دیکھتے ہیں
ہم اُن کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں

نہ خیر و شر کو نہ عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
جدھر کو آپ نہ ہوں ہم اُدھر کو دیکھتے ہیں

میں چپکا دیکھ رہا ہوں جگر کے داغوں کو
کہ چارہ گر انھیں وہ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

اُن آہوؤں سے کہو دیکھیں میری آنکھوں کو
جو آب جو میں گل نیلوفر کو دیکھتے ہیں

ہے اُن کی چشم کی گردش پہ گردشِ عالم
جدھر ہوا اُن کی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں

ہماری وصل کی شب ہے و یا شبِ محشر
کہ اُٹھ کے صبح قیامت سحر کو دیکھتے ہیں

ہوا کے گھوڑے پہ کس برق وش کو دیکھا تھا
کہ طمطراق پہ ہم کرّ و فر کو دیکھتے ہیں

بڑے گا سایۂ زلف اُس پہ بھی ضرور کبھی
کہ پیچ و تاب تمھاری کمر کو دیکھتے ہیں

ہم اُن کے کوٹھے پہ چڑھ کر ہیں ڈھونڈتے مہ عید
کدھر کو چاند ہے اور ہم کدھر کو دیکھتے ہیں

خدا کا بندہ ہو زاہد خدا کو دیکھ ذرا
کہ زر کے بندے زمانہ میں زر کو دیکھتے ہیں

اُدھر شفق میں ہے شام اور ادھر ہیں دیکھو
ابھی سے دمبدم اُٹھ کر سحر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھو شغل اسیری میں ہم غریبوں کا
کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

وہ دن تو عید کا ہوتا ہے دن ہمارے لئے
تمھارا اُٹھ کے جو منہ ہم سحر کو دیکھتے ہیں

یہ کس کو دیکھ فلک سے گرا ہے غش کھا کر
پڑا زمیں پہ جو نور قمر کو دیکھتے ہیں

سوال جوہر آئینہ ہے بہ چشم پُر آب
کہ مُنہ پہ خاک ملے کیوں ہنر کو دیکھتے ہیں

بہار کو ہیں دکھلاتے ستارۂ سحری
تمھارے کان میں جب ہم گہر کو دیکھتے ہیں

فنا کی راہ میں بیٹھے جو بن کے بیٹھے ہیں
اُنہی کو دیکھ کے ہنستے شرر کو دیکھتے ہیں

وہ خاک اُڑائیں گی بازار عشق میں آکر
کہ پہلے آن کے سود و ضرر کو دیکھتے ہیں

+ جب اپنے سامنے ہم سوز جگر کو دیکھتے ہیں ۔ دھوئیں پہ اُڑتا ہوا اختلاف سوز جگر کو دیکھتے ہیں

بناکے چشم کے دنبالہ پر وہ خالِ سیاہ
سنان ترک نظر پر سپر کو دیکھتے ہیں

عرق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اُس رُخ پر
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں

الٰہی آگ یہ سینہ میں ہے کہ آفت ہے
عرق کی جا پہ نکلتے شرر کو دیکھتے ہیں

بناکے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر
ہنرور اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

زیادہ سر ہو جو دشمن تو ہم سمجھتے ہیں
تڑپتا خاک پہ مار دو سر کو دیکھتے ہیں

نگیں کو دیکھ لیں چاہیں جو نام عالم میں
کہ سینہ کاوی ہیں یاں نامور کو دیکھتے ہیں

خراش ناخن وحشت سے چارہ گر میرے
شکستہ بخیۂ زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اُٹھائی آنسوؤں نے کس پہ آج ہے تسبیح
سفر ہے جاں کا جو فالِ سفر کو دیکھتے ہیں

کسی کی کاوشِ مژگاں سے بر سرِ مژگاں
ٹپکتا قطرۂ خونِ جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں کے آئینہ سے دل کا آئینہ ہے جُدا
اس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

دکھادو تم لبِ میگوں پہ خندۂ نمکیں
کہ یاں تو ساغرِ مے میں شکر کو دیکھتے ہیں

عیار نقدِ محبت کا دیکھ سختی پر
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

کسی دوست نے فرمائش کی کہ زمین مرقوم الذیل آج کل طرح ہوئی ہے آپ بھی غزل کہئے۔ آغاز شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق۔ غزل کہی۔ اس کا جا بجا چرچا ہوا۔ یہاں تک کہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ اُن دنوں بادشاہ تھے۔ اُنھوں نے فرمائش فرمائی کہ میاں ابراہیم سے کہو۔ ہمیں خود آکر وہ غزل سُنائیں۔ یہ ولیعہد یعنی مرزا ابوظفر کے ملازم خدمت تھے۔ لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے ایک قصیدہ اُن کی مدح میں کہکر شامل کر دیا۔

مے ملاکر ساقیان سامری فن آب میں
کرلتے ہیں جادو سے اپنے آگ دشمن آب میں

زُلفِ افعی وش کو دھوئے گر وہ پُرفن آب میں
ہوں بجلئے مور پیدا مار رہزن آب میں

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا۔ پائے نگاہ
اس طرح جاتے ہیں دیکھا! پاک دامن آب میں

پھر تلے سیلِ حوادث سے کوئی مردوں کا مُنہ
شیر سید صا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

صحبتِ اہلِ صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں
زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

اب بھی گریہ سے مجھے فرصت نہیں فوارہ وار
گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں

طاس قلیاں میں رکھا ہے اُس نے ابرِ مردہ کو
ڈوب مر رو رو کے تو اے ابرِ بہمن آب میں

دیکھنا آبی دوپٹہ مُنہ پہ اُس کے وقت خواب
بُرج آبی میں ہے مہ۔ یا مہر روشن آب میں

میں ہوں وہ تفتیدہ دل کر جائے اک دریا کو جذب
گر پڑے گر ذرّہ میری خاک مدفن آب میں

یوں رہا میں زندگی بھر تشنۂ دیدارِ یار
جیسے مستقی کا دم ہوتا بہ مردن آب میں

سایۂ سرو چمن نے کیا ڈرایا ہے سب مجھے
اژدہا بن بن کے شب اے رشکِ گلشن آب میں

وعدہ ہے آنے کا اُسکے ابر کھل جائے تو آئے
ڈالتا ہوں دمبدم اُٹھ اُٹھ کے روغن آب میں

شب جو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے اُمڈے یہ اشک
بہہ گیا خط لکھتے لکھتے مشفق من آب میں

ذوق تو اس بحر میں لیسے گل مضموں بہا
جابجا لگ جائے اک پھولوں کا خرمن آب میں

ہووے تو اے مہروش جب پرتو افگن آب میں
ہو سراپا فلس ماہی ماہ روشن آب میں

عکس زلفِ یار اور آئینۂ رخسار یار
کھینچے ہیں شام و سحر تصویر سوسن آب میں

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو نیساں شرم سے
پانی پانی ہو گیا اے شوخ پرفن آب میں

مردم دیدہ ہیں اپنے زندہ آب اشک سے
مردم آبی ہیں ان کا ہے نشیمن آب میں

بھول مت علم کتابی پر کہ آخر کب تلک
ناؤ کاغذ کی بہے اے طفل کودن آب میں

تو لبِ دریا ہنسے آکر جو اے رشکِ بہار
ڈالے بھر بھر کر صبا پھولوں کے دامن آب میں

لے تو اپنے روئے سیمیں پر ذرا آبی نقاب
نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں

کیا ہوا کیا سبزہ ہے کیا گل ہے کیا ابر بہار
لطف ہے گر ہو دے فیض ربِ ذو المن آب میں

مدح کر اُس شاہ دریا دل کی اے دل جسکا فیض
لعل و گوہر ہے بہاتا وقت گفتن آب میں

شاہ اکبر خسرو غازی کہ آب تیغ سے
رکھے حاسد کو ہمیشہ تا بگردن آب میں

پڑھ کے بسم اللہ مجریہا و مرسیٰہا دلا — جوں شناور بحر ہو امیں دست و بازن آب میں
مطلع روشن لکھا جس سے کہ بحر نظم میں — صورت اختر دُرِ معنی ہیں روشن آب میں

ڈالے جوں روح القدس تو حبکہ توسن آب میں
نور حق ہو اہل برہاں پر ہبر من آب میں

اے شہ الیاس رتبت۔ اے شہ خضر احترام — خشک و تر کو ہے سہارا تیرا دامن آب میں
نام حق لیکر جو بارے تیغ راہ حق میں تو — غرق جوں فرعونیاں ہو فوج دشمن آب میں
تو شہ دریا نوال۔ اور دل ترا موج کرم — ہے سخاوت سے تری دست قلزن آب میں
تیرا نیسان عطا جب دم گہر باری کرے — گوہر ترسے بھریں موجوں کے دامن آب میں
حکم تیرا جستجو چاہے تو گم ہونے نہ پائے — مثل ابراہیم ادہم ایک سوزن آب میں
تیرے حکم شرع سے جب کفر دریا برد ہو — غرق ہووے تا بہ نشانئے برہمن آب میں
ہو ترے سینہ میں جب بحر معانی موج زن — قطرہ سے روشن ہو صد معنیٔ روشن آب میں
ہو ترا فیض سخن گر معنیٔ نطق فصیح — بلبلے مانند بلبل ہوں نوازن آب میں
تیرے آگے گر کریں اعدا سر عصیاں بلند — مثل قوم نوح ہووے سب کا مدفن آب میں
تو صف آرا ہو جو دریا میں تو اک کرم آب — ہو عدو کے قتل کو سو سو تہمتن آب میں
روئے دریا پر بناتے ہیں بہم موج و حباب — بھر سر بازان لشکر خود و جوشن آب میں
نور و ظلمت ہمدگر دشمن ہیں پر حیراں ہیں میں — تیرے خنجر میں ہے کیوں آتش بہ آہن آب میں
باد پا تیرا ہے یوں آتش قدم بر روئے خاک — ق — ہووے جوں برق درخشاں سایہ افگن آب میں
عکس بھی دریا میں ہے۔ اور ہن سے اُڑ جاتا ہے یوں — روح گویا اُڑ گئی اور رہ گیا تن آب میں
تیرا فیل کوہ پیکر بسکہ دریا سیر ہے — ڈالے وہ کوہ رواں جب بنا دامن آب میں
مثل ابر آئے و لیکن سرعتِ رفتار سے — اوپر اوپر جائے مثل ابر بہمن آب میں
نسر طائر نسر واقع چرخ پر تا ہوں شہا — اور زمیں پر ہووے تا ماہی کا مسکن آب میں
ہو ہوائے شوق میں سر پہ ہما اقبال کا — ماہیٔ دولت کا ہو تیرے نشیمن آب میں

طرح مشاعرہ کی غزل ہے۔ جس کاغذ سے میں نے نقل کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ کو چلتے وقت صاف کیا تھا۔ بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ پوری ایک رات کی نشست اس پر صرف ہوئی۔

غمنامہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں
ہے شور الغیاث صریرِ قلم نہیں

وہ دن ہے کونسا کہ ستم پر ستم نہیں
گریہ ستم ہیں روز تو اک روز ہم نہیں

مضموں کے پیچ و تاب سے تابِ رقم نہیں
ہے زلفِ یار ہاتھ میں میرے قلم نہیں

بعد از فنا بھی جوشِ جنوں میرا کم نہیں
کس وقت زلزلہ سرِ دشتِ عدم نہیں

گو اضطراب دل کو عیاں کرتے ہم نہیں
پر جونگاہ ہے رگِ بسمل سے کم نہیں

جوشِ شگفتگی ہے محبت کا غم نہیں
یہ خوں خراشِ دل میں تبسم سے کم نہیں

آتش میں آپڑا تو ہے میری طرح سپند
لیکن نکل بھی جائے گا ثابت قدم نہیں

یہ دل مجھے ڈبو کے رہیگا کہ سینہ میں
وہ کونسا ہے داغ جو گردابِ غم نہیں

منظور دل کو کاوشِ غم کی ہے مشق اگر
بہتر مژہ سے یار کی کوئی قلم نہیں

ہیں آمدِ بہار سے بھر لائے منہ میں خوں
یہ زخمِ دل تبسمِ غنچہ سے کم نہیں

ہم کافرانِ عشق کو ہے یہ بڑا عذاب
دوزخ میں آتشِ آتشِ سنگِ صنم نہیں

مجھ روسیہ سے کب نہ ہوا سجدہ سرفرو
کب گردنِ خجالتِ محراب خم نہیں

مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اے بے وفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اہلِ صفا کا دیکھا نہ دامن کسی نے تر
گوہر ہے اپنی آب میں غرق اور نم نہیں

وحشی کو تیرے دشت بھی ہے عرصۂ بہشت
آہو کی شاخ شاخ سے طوبیٰ کے کم نہیں

اللہ رے ضبطِ دل کہ مری بر سرِ مزار
گیسوئے دودِ شمع میں بھی پیچ و خم نہیں

اے عہدِ یار ہے تو زمیں پر کہ اُٹھ گیا
ڈھونڈوں کدھر سراغ کہ نقشِ قدم نہیں

منصوبہ ہارنے کا مرے کرتے ہیں حریف
اور مجھ میں مثلِ بازیٔ شطرنج دم نہیں

تو نے جو ہاتھ قتل سے کھینچا تو کیا ہوا
رُکتی کسی طرح تری تیغِ ستم نہیں

ہے میکشوں کے واسطے میخانہ تختِ جم
یاں جامِ مے ہے سامنے گر جامِ جم نہیں

چمکا یہ آتشِ دلِ پروانہ کا ہے رنگ
اے شمع رو عیاں شفقِ صبحدم نہیں

ہے نوشِ حبّ زر سے یہ دامن ہمارا پاک
گر چھینٹ بھی پڑے تو تجدّدِ رم نہیں

گر آب دیدہ شربتِ کوثر بھی ہے تو کیا
جب تک کہ اس میں چاشنیٔ درد و غم نہیں

حالت ہے اب یہ زار ترے دل فگار کی
ہے چشمِ زخم منہ پہ کہ جو چشم نم نہیں

ہاتھ آئے کس طرح سے دل گم شدہ کا کھوج
ہے چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں

ہاتھوں سے چرخ تفرقہ پرداز کے کبھی
کر سکتے آہ دستِ تاسف بہم نہیں

سرباز عشق کے لئے دار الاماں کہاں
محفوظ قطع سے سرِ شمعِ حرم نہیں

جاتا ہے آنکھیں بند کئے ذوق تو کہاں
یہ راہ کوئے یار ہے راہِ عدم نہیں

عالمِ شباب کی غزل ہے۔ یہ بھی بادشاہ کو پسند آ گئی تھی (دیکھو صفحہ ۱۱۲) کشش کی مقناطیس بہت لگائی مگر اُستاد نے بھی نہیں ہی چھوڑی۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی تھے۔ اور بڑے مقرب تھے۔ انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں وہی دیوان ظفر ترتیب دیتے تھے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا۔ سخن کے جوہر شناس تھے۔ اُستاد کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے اُنھیں یہ غزل بہت پسند تھی۔ حضور کے سامنے انہی کی زبان سے نکل گئی تھی حکیم کلام کی محبّت سے اُستاد سے محبّت رکھتے تھے۔ مگر خلیفہ صاحب کے سبب سے کھٹکتے تھے۔ خیال تھا کہ حضور پھر انہیں خدمت سپرد نہ کر دیں۔ ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے۔ اسی لئے مرزا نوشہ (غالب مرحوم) کو حضور میں پہنچایا تھا۔ حالانکہ اُستاد نے ترقی تنزل خلیفہ کے کسی معاملہ میں کبھی دخل ہی نہیں دیا:۔

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اُس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

جیتے ہی جی کیا ملک فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے ادھر سے جبکہ چھٹے تو جا کے اُدھر کے جھگڑے ہیں

کیسا مومن کیسا کافر۔ کون ہے صوفی کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں

ایک ایک جور و ستم پر اُس کے سَو سَو داغِ دل ہیں گواہ
ہم جو اُس سے جھگڑے ہیں حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں

غم کہتا ہے دل میں رہوں میں! جلوۂ جاناں کہتا ہے میں!
کس کو نکالوں کس کو رکھوں! یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

بحر میں موتی پانی پانی۔ لعل کا دل خوں پتھر میں
دیکھو! لب و دنداں سے تمھارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں

دوست کے گھر میں دشمن ہو جب سنگ ہمارے سینہ پر
دل کا ذکر رہا کیا باقی۔ پھر تو سر کے جھگڑے ہیں

حضرت دل کا دیکھنا عالم ہاتھ اُٹھائے دُنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں۔ شکوہ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

جن دنوں شاہ نصیر مرحوم سے معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض[1] پارسا کی شاعری کو جوانی کے جنون نے چمکایا۔ لکھنؤ سے آکر مشاعرہ قایم کیا۔ وہ میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ اُنہی دنوں دلّی میں سرکاری مدرسہ جاری ہوا تھا۔ اُنھوں نے اُسے مدرسے کے سلسلہ میں لے لیا۔ اور انشائے اُردو کی ترقی کا جزو اعظم قرار دے کر

[1] منشی صاحب مغفور میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر دہلی کالج سابق میں مدرس سیاق ہو گئے تھے۔ میں نے بھی ابتدائی حساب اُن سے سیکھا تھا۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں مر گئے۔

صاحب پرنسپل سے مدد لی۔ مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ رات کے ۹ بجے شہر کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان صاحب سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن دروازہ ۲ بجے رات تک کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے ہوا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلّی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر اور علما موجود ہوتے تھے۔ مگر سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل پڑھی:-

ہم پھڑک کر توڑتے سارے قفس کی تیلیاں	پر نہیں اے ہمصفیر و اپنے بس کی تیلیاں

دوسرے مشاعرہ کے لئے یہی طرح ہو گئی۔ اُستاد مرحوم نے دو غزلہ لکھا۔ اس میں کچھ تکرار ہوئی۔ اس میں جوش میں آکر اُستاد نے فرمایا کہ برس دن تک علاوہ غزل طرحی کے ایک غزل اسی زمین میں اور ہوا کرے۔ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ تیسرے جلسہ میں اُنھوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں۔ اُستاد مرحوم کے طرفدار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادہ نے یہ شعر بھی پڑھا:-

گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا	ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر گفتگو زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند ہو گیا۔ اُستاد کی سب غزلیں اس زمین میں ملیں پہلے مشاعرہ کی غزل بہت خوب تھی۔ دو مسوّدے ساتھ آگئے ہیں۔ ایک پر کچھ شعر قصیدہ کے بھی ہیں۔ مگر سب پڑھے نہیں جاتے۔ غزل کے شعر لکھتا ہوں۔ ۶۰ برس گذرے اب تک اس مشاعرہ کی باتیں زباں بزباں یادگار چلی آتی ہیں:-

آفتِ جاں دل کو ہیں تن کے قفس کی تیلیاں	ورنہ ہیں یاں بال و پر تار نفس کی تیلیاں
استخواں ہیں اس تنِ لاغر میں خس کی تیلیاں	تیلیاں بھی وہ کہ جو ستر برس کی تیلیاں
رخصت پرواز گر دیویں قفس کی تیلیاں	جا کے دیکھ آئیں جو کچھ رکھی تھیں خس کی تیلیاں
دل کے شعلوں سے قفس کے پیش و پس کی تیلیاں	یوں جلیں اُڑ جائیں جیسے خار و خس کی تیلیاں

گر رسیلا بچی رکھتے ہو خس کی تیلیاں
لیجئے مژگاں کی مجھ بے دسترس کی تیلیاں

گر رگ گل سے ہوں بلبل کے قفس کی تیلیاں
کانٹے آنکھوں میں چبھوئیں اُسکے خس کی تیلیاں

طائرانِ رنگ گل کا فکر کیا اے باغباں
ہیں یہی رگہائے گل اُس کے قفس کی تیلیاں

اے مہندس مرغ ساعت کو اگر کرتا ہے بند
لے ہوا میں اُڑکے آواز جرس کی تیلیاں

میں ہوں دیوانہ کسی کے سبزۂ رخسار کا
مارو پھولوں کی جگہ تم مجھ کو خس کی تیلیاں

سوز غم سے ہیں سُلگتے جسم و جانِ ناتواں
کب کا یہ کوڑا تھا یارب کئے برس کی تیلیاں

کشتہ مژگاں کے گنبد کا ہے مرقد اے صبا
جا لگا اس پہ عوض زریں کلس کی تیلیاں

طائر رنگِ حنا کا شوق اگر ہو اے پری
تیرے ہاتھوں کی لکیریں ہوں قفس کی تیلیاں

پنجۂ مژگاں جو یاروب سمند ناز ہے
تاب کب لائیں لگدکوبِ فرس کی تیلیاں؟

لے چلا دنیا سے دل یا کاسۂ روغن حریص
اس میں کیوں رکھتا ہے جاروب ہوس کی تیلیاں

چشم گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
سبز ہو جائینگی سب میرے قفس کی تیلیاں

شیخ کی ڈاڑھی تو حاضر ہے لگا دے ساقیا
گر خس شیشہ کو ہے درکار خس کی تیلیاں

ہے دوائی اِس شجر کے واسطے تازہ خزاں
پتّے سُنجکر رہ گئیں خالی سرس کی تیلیاں

ہوئے مژگاں ہیں کہ رکھتے ہیں ترے شہباز چشم
آشیاں کے واسطے چن چن کے خس کی تیلیاں

ہے پئے مرغ دلِ بلبل رگ گل کا قفس
اس سے نازک اور کیا ہونگی قفس کی تیلیاں

ق گر ہے اے صیاد ناداں تجکو آرائش کا شوق
مت بنا پیتل کے تاروں سے قفس کی تیلیاں

جو ہیں مرغ تر دماغ اُن کے قفس کے واسطے
چاہئیں صندل کی چوبیں اور خس کی تیلیاں

اُڑکے جا پہنچے ہوائے شوق میں تنکے کی طرح
تھیں جو ٹانگیں قاصدانِ زودرس کی تیلیاں

طرز نالہ مجھ سے گر سیکھیں۔ جلا دیویں ابھی
صوت ققنس بن کے آوازیں جرس کی تیلیاں

شیخ تل شکری جو لائے لعلِ لب کے سامنے
گل کا دونا تھا مگر شاخ عدس کی تیلیاں

آگے ان نالوں کے ہیں یوں خار و خس ہوتے رقیب
جوں ہوں روکش اژدرِ آتش نفس کی تیلیاں

کارواں حیرت کا تھا شب تنکا تنکا دشت میں
رہ گئیں بن بن کے آواز جرس کی تیلیاں

سلسلہ وابستہ تھا کچھ عالمِ معنی سے ذوق
ورنہ تھیں یہ تیلیاں کب اپنے بس کی تیلیاں

اس غزل کے ۵ شعر لڑکپن سے یاد تھے۔ ایک دن میں نے پوری غزل مانگی فرمایا عالمِ شباب تھا۔ ایک مکان ہمسایہ میں بکنے لگا۔ ہم نے لے لیا۔ بعض اشخاص جارج تھے۔ انھوں نے نالش کر دی۔ مولوی فضل حق عدالت میں سررشتہ دار تھے۔ بڑے بااختیار تھے۔ ہماری مشاعرہ کی شناسائی تھی۔ ضرورت لے گئی کہ مقدمہ کا حال سُنا دیں۔ خیال ہوا کہ وہ شعر کی فرمائش کریں گے کچھ اُنہی کے رنگ میں کہنا چاہئے اللہ اللہ وہ زمانہ ان کی فضیلت فلسفہ کا شہرہ۔ اور ہم بھی اُن دنوں یہی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ عجب ولولہ طبیعت میں پیدا ہوا۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ عربی شعر کہا کرتے تھے۔ اُن کا گھرانا شاعر تھا۔ بلکہ خیرآباد کے بہت لوگ شاعر تھے۔ اُردو فارسی سب کہتے تھے۔ ان دنوں بہت لوگ دلّی میں آ گئے تھے۔ مولوی فضل حق کا بھی شباب تھا مرزا نوشہ اُن کے بڑے یار تھے۔ غرض جبھی یہ غزل لکھی تھی۔ خدا جانے اب کہاں پڑی ہو گی۔ شکر ہے کہ آزاد کے لئے اللہ نے دو دو تین تین شعر کر کے ۱۵ شعر کر دیئے:۔

آج اُن سے مدّعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں
پر نہیں معلوم کیا کہوینگے کیا کہنے کو ہیں

وصفِ چشم و وصف لب اس یار کا کہتے کو ہیں
آج ہم درس اشارات و شفا کہنے کو ہیں

ہیں دہن غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اُس کو دیکھکر صلِّ علیٰ کہنے کو ہیں

کہدے شبنم سے نہ بھر سیماب گل کے کان میں
بلبلیں احوال دل کچھ لے صبا کہنے کو ہیں

دیکھے آئینے بہت بن خاک ہیں ناصاف سب
ہیں کہاں اہل صفا اہل صفا کہنے کو ہیں

وہ مبدم رُک رُک کے ہے مُنہ سے نکل پڑتی زباں
وصف اُسکا کہہ چکے تو آرے یا کہنے کو ہیں

اب تو رات آخر ہوئی میری طرف دیکھو ذرا
مسجدوں میں لوگ اذاں اے مہ لقا کہنے کو ہیں

ہیں ترے ہاتھوں کے قرباں واہ کیا ناوک ہیں تیر
سب دہانِ زخم منہ سے مرحبا کہنے کو ہیں

میرے دل کے آبلے دیکھے تو منہ فق ہو گئے
زردیوں ہی دانہائے کہربا کہنے کو ہیں

دیکھ تو لے پہنچے کس عالم سے کس عالم میں ہیں
نالہائے دل ہمارے نارسا کہنے کو ہیں

گاہ دامنگیر باد و گہ بیاباں گرد خاک
اب تو تیرے عاشقوں کے دست و پا کہنے کو ہیں

وہ جنازہ پر مرے کس وقت آئے۔ دیکھنا
جبکہ اذن عام میرے اقربا کہنے کو ہیں

ہے جہاں مانند مجمر اور ہم مثل سپند
اب چلے جائینگے آئے اک صدا کہنے کو ہیں

پوچھو قاتل سے کریگا قتل آخر کب تلک
اپنی تاریخ آج ہم مثل از قضا کہنے کو ہیں

میرے سودا کا اطبا کر نہیں سکتے علاج
یونہی خبطی خبط و مالیخولیا کہنے کو ہیں

مٹ گئے جوہر وفا کے اُٹھ گئے سب اہل ل
اب وفا ہے نام کو اور باوفا کہنے کو ہیں

ہے صفائے دل وہی جس میں عیاں ہو شکل یار
یوں تو آئینوں کے دل بھی باصفا کہنے کو ہیں

کیا تماشا ہے کہ اُنکے کان میں اُٹھا ہے درد
ہم جو آئے درد دل اپنا ذرا کہنے کو ہیں

بے سبب سوفار اُن کے منہ نہیں کھولے ہیں ذوق
آئے پیک مرگ پیغام قضا کہنے کو ہیں

گر ترا نور نہیں چشم میں کیا ہے اس میں
کہنا فِیْہِ نَظَرٌ عین خطا ہے اس میں

دل کو کیا دیکھیگا تو چیر کے کیا ہے اس میں
اب تو قطرہ بھی نہیں خوں کا رہا ہے اس میں

رسن انداز ہے چاہِ ذقنِ یار میں زلف
نہیں معلوم کہ دل کس کا گرا ہے اس میں

عشق کی تلخی حسرت کے جو لے لے کے مزے
بے مزہ رہتے ہیں ہم کچھ تو مزا ہے اس میں

تو نگیں توڑ نہ دل کا کہ بڑی کاوش سے
اسم کو میں نے ترے کندہ کیا ہے اس میں

کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبط فغاں
نہیں معلوم وہ خوش اس میں ہے یا ہے اس میں

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں۔ گر جانوں
کہ نہیں جام میں مے آب بقا ہے اس میں

دے چکے عشق میں جاں وامق و قیس و فرہاد
اور ابھی دیکھئے کس کس کی قضا ہے اس میں

اُس جفا کیش کے نامہ کو پڑھوں کیا قاصد
جو کہ قسمت کا لکھا تھا وہ لکھا ہے اس میں

شیشۂ سبز فلک سے نہ طلب کر مئے عیش
مے کہاں اس میں ہے زہر آب بھرا ہے اس میں

جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ
سرد ہونے پہ بھی گرمیٔ وفا ہے اس میں

کیا بگولے کی طرح خاک کا پُتلا اے ذوق
اُڑتا پھرتا ہے بھری جب سے ہوا ہے اس میں

کرے وحشت بیاں چشمِ سخنگو اس کو کہتے ہیں
یہ سچ کہتے ہیں۔ سر چڑھ بولے جادو اس کو کہتے ہیں

سوالِ بوسہ کو ٹالا۔ جوابِ چینِ ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اس کو کہتے ہیں

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا۔ ٹل گیا سارا
نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اس کو کہتے ہیں

عدوئے نیش زن ہر دم ہے میرے درپئے ایذا
یہ موذی زہر کی ہے گانٹھ۔ بچھو اس کو کہتے ہیں

گوارا تلخیٔ مے کیوں نہ ہو ہم خستہ جانوں کو
کہ دارو تلخ ہی بہتر ہے۔ دارو اس کو کہتے ہیں

گرہ کھولی ذرا اُس نے جو اپنی زلفِ مشکیں کی
معطر ہو گیا آفاق۔ خوشبو اس کو کہتے ہیں

جو پوچھے عقل یہ دل سے بتا کیا نام ہے تیرا
کہوں۔ دیوانۂ چشمِ پریرو اس کو کہتے ہیں

کبھی شیریں نہ دل سے۔ کوہ کن نے کوہ کو کاٹا
محبت یہ نہیں ہے زورِ بازو اس کو کہتے ہیں

اجل سو بار آئی ذوق پر جب تک وہ آئے
نہ پایا دم نکلنے میرا۔ قابو اس کو کہتے ہیں

عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں
ہوں اس طرح جہاں میں۔ کہ گویا نہیں ہوں میں

میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں
میں ہوں تمھارا سایہ۔ جہاں تم۔ وہیں ہوں میں

اُس در پہ شوقِ سجدہ سے فرشِ زمیں ہوں میں
مانندِ سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں

ہوں طائرِ خیال۔ نہ پر ہیں نہ میرے بال
پر اُڑ کے جا پہنچتا کہیں سے کہیں ہوں میں

سرگشتگیٔ بخت نہ دے مجھ کو اتنے پیچ
کچھ چینِ زلف ؟ کچھ شکنِ آستیں ہوں میں

یارب کو میں کا تارا ہوں یا آسماں کا ہوں
نام آسماں پہ میرا ہے زیرِ زمیں ہوں میں

قصد جب تیری زیارت کا کبھو کرتے ہیں
چشمِ پُر آب سے آئینے وضو کرتے ہیں

کرتے اظہار ہیں در پردہ عداوت اپنی
کیوں مرے آگے جو تعریفِ عدو کرتے ہیں

دل کا یہ حال ہے پھٹ جائے ہے سو جگہ سے اور
اگر اک جائے سے ہم اس کو رفو کرتے ہیں

توڑیں اک نالہ سے اُس کاسۂ گردوں کو مگر
قدر دیجو کو تمہارے نہیں دیکھا شاید

نوش ہم اس میں کبھی دل کا لہو کرتے ہیں
سرکشی اتنی جو سرو لبِ جُو کرتے ہیں

ایک دن حافظ ویران اور میں اُستاد کے ہاں بیٹھے تھے۔ اور بعض شعرائے عصر کے ہندی مضمونوں کے باب میں گفتگو کر رہے تھے۔ ع

ہے کاٹنے کو دوڑتا کُتا تفنگ کا

اور۔ ع

مینڈھا حلال کرتے ہیں دریائے نیل کا

اُستاد نے سنکر فرمایا کہ ایسے مضامین کو استعارہ و تشبیہ میں اتنا زیادہ زور دینے سے کلام بدمزہ ہو جاتا ہے بعد اس کے غزل مرقومۃ الذیل کے اشعار سُنائے :۔

رکھتا ز بسکہ جیفۂ دنیا سے ننگ ہوں پارس بھی ہو تو جانتا مردار سنگ ہوں
ہوں وہ شگفتہ دل کہ نہ دوزخ میں تنگ ہوں آہن تو آگ میں ہوں مگر لالہ رنگ ہوں
ہیں سب سے پہلے میرے اُٹھانے کی فکر میں محفل میں اُن کی میں کسی چوسر کا رنگ ہوں
دل بیٹھا محو ضبط ہے اور مجھ کو اضطراب دل میرا مجھ سے تنگ ہے میں اس سے تنگ ہوں
پروانہ گر نہیں تو نہیں۔ پر ہوں شعلہ دوست مکھی بھی ہوں تو خال دہان تفنگ ہوں

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب و داماں میں نفس اک تار ہے۔ سینہ میں سمجھو یا گریباں میں
کہاں ڈھونڈے کوئی دل کو ہجوم داغ سوزاں میں ملے کھوج ایک پروانہ کا کیا گنج چراغاں میں
نہ بھولے گی کبھی ہمدم شکایت تشنہ کامی کی رہے آبِ جو سکے جب تک تیغ میں خنجر میں پیکاں میں
تمہارے تیر میں شاداب کرتے دل کے زخموں کو ہمیشہ آب پیکاں ہے شبنم اس گلستاں میں
جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر تو وہ بھی نہ پیتا آب حیواں ڈوب مرتا آب حیواں میں

مرے نالے کہیں اس گنبد بے در سے اوپر ہیں ہوا کیوں باندھتے بادل یہ میں اوپر سے اوپر ہیں
گذر جاتے ہمارے نالے اُنکے سر سے اوپر ہیں وہ اک سنتے نہیں دیتے اُڑا اوپر سے اوپر ہیں

عجب عالم ہے اب دل کا کہ اُن کے اک اشارہ پر
کھٹک جاتے ہمارے دل میں سو نشتر سے او پر ہیں
پسِ دیوار گلشن ہم پڑے ہیں ناتوانی سے
ابھی طاقت کرے یاری تو اُڑ کر فرسے او پر ہیں

ستم وہ غضب کہ ہوتے بھی کم ایسے شخص ہیں
اور ہم بھی یہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں
صاحب دلوں نے کعبۂ دل پر کیا مقام
کب کرتے قصد دیر و حرم ایسے شخص ہیں
دیوانے تیرے دشت میں رکھیں گے جب قدم
مجنوں بھی لے گا آکے قدم ایسے شخص ہیں
دین کیا ہے بلکہ دیجئے ایمان بھی اُنہیں
زاہد یہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

چاروں شعر مرقوم الذیل لڑکپن کا کلام ہیں۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ بتاں کا لفظ بے اضافت محاورہ میں عام تھا۔ میر و سوداؔ کے دیکھنے والے موجود تھے۔ دلی کی زبان یہی تھی۔ اُسی محاورہ میں اُنھوں نے شعر کہا۔ بگی کی سواری اور فرنگی زاد کا مضمون اس وقت نیا معلوم ہوتا تھا۔ فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی فرنگی دلی میں نظر آتا تو ایک عجیب صنعتِ الٰہی سمجھ کر ہم باہم دکھایا کرتے تھے۔ کہ دیکھو وہ فرنگی جاتا ہے۔ زمانہ کا مزاج اور اُس کی طبیعت کا ایک عالم ہے کہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ جو لفظ آج سماعت کو ناگوار ہے اُس وقت خوشگوار تھا۔ ورنہ آسان ہے۔ کہدیتے۔ مصرع

ہیں صنم محو خود نمائی میں

ہیں بتاں محو خود نمائی میں
بیر ہے پر خودی خدائی میں
ہو کے اک بوسہ پر ترش ابرو
بات کو ڈالنا کھٹائی میں؟
نہیں بگی میں وہ فرنگی زاد
ماہ ہے منزل ہوائی میں

ذوق ہے ایک رند شاہد باز
اس کو کیا دخل پارسائی میں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھکر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھدیا اُنھیں کیا اضطراب میں

بے بادہ غور گی میں ہوا ذوق جوں مویز
کی توبہ بے وقوف نے ناحق شباب میں

سے نے رنگ کفک ہوں۔ نہ ترا فندق پا ہوں — میں کچھ نہیں۔ لیکن ترے قدموں سے لگا ہوں
مجنوں نے مجھے سمجھا چراغِ رہِ مقصود — ہیں ناقۂ لیلےٰ کا سراغِ کفِ پا ہوں
وہ مہر تو میں تاب۔ وہ گوہر ہے تو میں آب — مجھ سے نہ جدا وہ ہے نہ میں اُس سے جدا ہوں

کھائے پیہم یہ ترے ناوکِ مژگاں دل میں — اتنے مو۔ تن پہ نہیں جتنے ہیں پیکاں دل میں
گھر ہی کر بیٹھا ہمارے غمِ ہجراں دل میں — ہم نے جانا تھا کوئی دن ہے یہ مہماں دل میں
خانقاہ میں بھی وہی ہے۔ جو خرابات میں ہے — فرق پر یہ ہے۔ یہاں منہ پہ ہے اور واں دل میں

تیرے آفت زدہ جن دشتوں میں اُڑ جاتے ہیں — صبر و طاقت کے وہاں پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں
اتنے بگڑے ہیں وہ مجھ سے کہ اگر نام اُن کا — خط میں لکھتا ہوں تو سب حرف بگڑ جاتے ہیں
کیوں نہ لڑوائیں اُنھیں غیر کہ کرتے ہیں یہی — ہمنشیں جن کے نصیبے کہیں لڑ جاتے ہیں

مر گیا ہوں بسکہ وصلِ سیمتن کی فکر میں — چادرِ مہتاب ہے میرے کفن کی فکر میں
ہائے گل سب آشنا تیرے مریضِ عشق کے — ق — تھے علاجِ ضعفِ دل۔ اور ضعفِ تن کی فکر میں
آج گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں باچشمِ پر آب — گاہ تدبیرِ لحد میں۔ گہ کفن کی فکر میں

اب کے دل لے لوں تو پھر اُس بت قاتل کو نہ دوں — جان دوں مال دوں ایمان دوں پر دل کو نہ دوں
چار ٹکڑے کروں دل کے۔ کہ نہیں ہو سکتا — لب کو دوں رُخ کو نہ دوں زلف کو دوں تل کو نہ دوں

نہ ڈال آبلے اے گرمیِ فغاں منہ میں — کہ چپکا بیٹھ رہوں بھر کے گھنگنیاں منہ میں

ہمار اپی کے لہو۔ تیرے تیر کا سوفار
یہ چُپ ہوا ہے کہ گویا نہیں زباں منہ میں

اسیر رنج وغم میں ہوں۔ مریض جاں بلب میں ہوں
اور اس پر اب تلک جیتا ہوں میں کوئی عجب میں ہوں
جو مانگوں موت دردِ ہجر سے۔ مجکو نہیں زیبا
کہ نام عشق لوں! اور اسقدر راحت طلب میں ہوں

ہر بُنِ مو سے نکلتے ہیں شرارِ آتشیں
بن گیا ہوں میں سراپا اک انارِ آتشیں
واہ رے سوزِ جگر۔ اُٹھتے ہیں میری خاک سے
دودِ گلخن کی طرح اب تک غبارِ آتشیں

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں
ہُوںلے پابند علائق نہیں وارستے ہیں
نگہت گل کے نکل جانے کو سورستے ہیں

میں ہوں وہ جگر خوں کہ مسامات بدن سے
جوں اشک عرق بھی شفقی رنگ نکالوں
ہے جی میں کہ غنچہ کو کروں تنگ چمن میں
پھر یار کا ذکر دہن تنگ نکالوں

دُنبالے سے سرمہ کے دھواں ہیں تری آنکھیں
کہہ بیٹھیں نہ کچھ۔ سیف زباں ہیں تری آنکھیں

مرے نالوں سے چُپ ہیں مرغ خوش الحان زمانہ میں
صدا طوطی کی سُنتا کون ہے نقار خانہ میں

ہوا ہے اور نہ ہوویگا کوئی پیدا خدائی میں
وفا میں کوئی مجھ سا۔ اور تم سا بے وفائی میں

اسیری عشق کو منظور تھی میری لڑکپن میں
بہانہ کر کے منت کا پنہایا طوق گردن میں

ہیں وہ دیوانے کہ جن کو بیڑیاں درکار ہیں	ہم اسیر زلف ہیں۔ کافی ہمیں دو تار ہیں
کمندیں اور بھی یوں تو کمند انداز رکھتے ہیں	تری زُلفوں کے خم کچھ اور ہی انداز رکھتے ہیں
کیا صوفی و کیا میکش۔ قائل مرے دونوں ہیں	پر مذہب و مشرب سے۔ غافل مرے دونوں ہیں
مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں	بے وفا پوچھے ہے۔ کیا دیر ہے لیجانے میں
جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اُٹھے ہیں	آج کس شخص کا مُنہ دیکھکے ہم اُٹھے ہیں
کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسوں	ہوئے برسوں۔ نہ ہوئی پر وہ تمھاری پرسوں
یہ طوق اس واسطے چھوٹا ہوا قمری کی گردن ہیں	کہ تھا بلبل کی گردن کا۔ پڑا قمری کی گردن ہیں
رخصت جو ہو کے ہم سے جاتے وہ اپنے گھر ہیں	گھبرا کے پہنچتے واں۔ ہم اُن سے پیشتر ہیں
زاہد گمراہ کے میں کس طرح ہمراہ ہوں	وہ کہے اللہ ہو۔ اور میں کہوں اللہ ہوں

شعر مرقوم الذیل ایک مسدس کا ترجیع بند ہے کہ جناب سید الشہدائ کے مرثیہ میں لکھا تھا۔ کئی بند اس کے بندۂ آزاد کو یاد ہیں اپنی جگہ پر وہ بھی درج ہوں گے۔

کرلتے اپنے سر کو جو نوک سناں پر تاج ہیں	عشق میں وہ کرتے حاصل رتبۂ معراج ہیں
کٹا کر اپنا سر نوک سناں پر تاج کرتے ہیں	حصول اس طرح عاشق رتبۂ معراج کرتے ہیں

کہتی ہے ماہیِ بریاں کہ دبیران قضا | داغ دیتے ہیں اُسے جس کو درم دیتے ہیں

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے | یاد میں تیری اجل سے بھی فراموش ہوں میں

سمجھو نہ سہل تم خفقاں کو حکیم جی | حضرت اسے بھی جانیے ہمزادہ جنوں

واو

شاہ نصیر مرحوم جب تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قایم ہوا۔اس میں یہی طرح تھی۔اُستاد نے یہ دو غزلہ پڑھا تھا۔جوانی کا عالم تھا۔اور شاعری بھی جوان تھی قافیہ پیمائی سے دق ہو کر مقطع دوم میں آسانی طرح کا اظہار کیا ہے۔جس شعر پر ۵ ہے اُس میں شاہ نصیر کی برکت اور پیرانہ سالی کا اشارہ ہے۔اور بعض اشخاص بھی اس مشاعرہ میں شامل تھے جو دلوں میں خلش رکھتے تھے۔کہیں کہیں اُن کی طرف بھی اشارے ہیں۔ ہرایک کی شرحِ طولانی ہے۔اور فائدہ کچھ نہیں۔قلم انداز کرتا ہوں۔برسر معرکہ واقفانِ حال موجود تھے۔اُنھوں نے مزے لیے۔

دانہ خرمن ہے ہمیں۔قطرہ ہے دریا ہم کو | آے ہے جزُ میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو | کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل اپنا ہے صحرا ہم کو | اور جوں خیمۂ لیلےٰ ہے سویدا ہم کو

اُس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو | لکھا امیائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

رکھ مکدر نہ بس اے چرخ تو اتنا ہم کو | ہم نے جانا کہ کیا خاک سے پیدا ہم کو

شوق مستی میں ہے گلگشتِ چمن کا ہم کو | چاہیئے جائے عصا گردنِ مینا ہم کو

ہو و یگا کشتیٔ طوفاں زدہ تابوت اپنا | آگیا اپنے اگر مرنے پہ رونا ہم کو

بستگی دل کو ہے کیوں اُس گرہ زلف کے ساتھ | کیا کہیں کچھ نہیں کھلتا یہ معمّا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ گرد رم آہو کی طرح
بھاگتے ہے دُور ہی سے دیکھ کے صحرا ہم کو

کس سے تدبیر درستی ہو ہماری جوں زلف
کہ شکستوں سے بنایا ہے سراپا ہم کو

جا بجا نام تو جوں نقشِ قدم چھوڑ گیا
خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈنے عنقا ہم کو

اور ہمدرد کہاں۔ ہو نہ ہو اے حضرتِ دل
درد اب تم کو ہمارا ہو تمہارا ہم کو

پھینک کر شیشۂ دل ہاتھ سے کہتا ہے وہ مست
کیا بنانا تھا ہتھیلی کا پھپھولا ہم کو

اثر کفر ہے طاعت سے بھی اپنی پیدا
نقشِ سجدہ کا ہے پیشانی کا ٹیکا ہم کو

نخلِ خرما کی طرح باغِ محبت میں ملا
کثرتِ زخم سے اک خلعتِ زیبا ہم کو

ایک دم تنگ وہ آئے تھے بغل میں اس پر
غم دوری سے کیا تنگ ہے کیا کیا ہم کو

دم میں اب دم نہ رہا اپنے جو ٹھیریں کوئی دم
ہاں مگر ہو ترے آنے کا بھروسا ہم کو

آن پہنچی سرِ گردابِ فنا کشتیٔ عمر
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھوکا ہم کو

ہو سکے لاغری و ضعف کہاں مانعِ شوق
تیری جانب پر پرواز ہیں اعضا ہم کو

ہم گئے جس کی طرف۔ جو گل بازی اُس نے
پاس آنے نہ دیا دُور ہی پھینکا ہم کو

رشک تھا اپنے نوشتہ پہ کہ اُس نو خط نے
خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو

ہر قدم پاؤں میں سر رکھتے ہیں خارِ سرِ دشت
اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو

کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت ۴
پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو

اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گوہرِ دل
طوف گرداب صفت چاہئے اپنا ہم کو

لگ گئی آنکھ جو سودے میں تری زلفوں کی
شب سیاہی نے کئی بار دبایا ہم کو

حرف تلخ اُس لبِ شیریں سے ہر اک بات پہ آہ
ناصحا سنتے ہیں ہم کچھ تو ہے میٹھا ہم کو

خاک سے کیونکہ ہماری گلِ رعنا نہ اُگے
کہ کبھی گل کی دورنگی نے ہے مارا ہم کو

ایک دم عمرِ طبیعی ہے یہاں مثلِ حباب
فکرِ امروز ہے سینے ہے غمِ فردا ہم کو

جتنے عاشق ہیں بہم۔ ایک کا ہے ایک عزیز
شمع سے چاہئے ہے خون کا دعوےٰ ہم کو

کیا ستم ہے کہ پئے قطعِ رہِ عشق فلک
آرہ ساں دیتا ہے دنداں عوض پا ہم کو

دل میں تھے قطرۂ خوں چند۔ سو مانند انار
نہ رہے وہ بھی جب اُلفت نے نچوڑا ہم کو

مل گئیں خاک میں جو صورتیں ہے اُنکا خیال
کیوں نہ فانوسِ خیالی ہو بگولا ہم کو

ہم وہ ہیں وحشیٔ لاغر کہ چھپا لیتی ہے
زیرِ دامن نگہِ آہوئے صحرا ہم کو

ہم نہ کہتے تھے کہ ذوقؔ اُسکی تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا ہم کو

آسماں اور وہ انسان بناتا ہم کو
خاک میں تھا مگر اس ڈھب سے ملانا ہم کو

ذبح کیوں کرتے ہی فتراک سے باندھا ہم کو
چھوڑ۔ ہونے دے تڑپکر ابھی ٹھنڈا ہم کو

دل شکستہ مگر اُس یار نے سمجھا ہم کو
خط بھی جو خطِ شکستہ ہی سے لکھا ہم کو

باعثِ رشک ہوا۔ عشق ہمارا ہم کو
تجھ پہ بن دیکھے ہے عشق جس نے کہ دیکھا ہم کو

کر دیا گریہ نے آخر سبک ایسا ہم کو
لے گئے اشک بہا جوں کفِ دریا ہم کو

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اُس کو ہوئی۔ تھی جو تمنا ہم کو

ہے وہی جنبشِ لبہائے جراحت بس قتل
کس لبِ تیغ کے بوسہ کا ہے لپکا ہم کو

ہم وہ ہیں گرم روِ راہِ وفا جوں خورشید
سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

ٹپکا مژگاں سے لہو ہو کے جگر آخرکار
ایک مدت سے اسی ٹپکے کا ڈر تھا ہم کو

خالِ سرمہ کا تمھیں چاہیئے زیبائش کو
اختر سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو

یہ تو یوں مضطرب۔ اور سینہ میں لاکھوں روزن
دل کا رہنا نظر آتا نہیں اصلا ہم کو

خطِ توام سے لکھو گور پہ تاریخِ وفات
کہ رہی وصل کی تا مرگ تمنا ہم کو

کون غلطیدہ تھا خاکِ سرِ کو پر تیری
خواب شب بسترِ مخمل پہ نہ آیا ہم کو

جس کی آواز سے ہوں رونگٹے سو ہاں کے کھڑے
وہ محبت نے دیا سلسلۂ پا ہم کو

اک حلاوت ہے عداوت میں بھی اُس ظالم کے
کہ دیا زہر بھی گر اُس نے تو میٹھا ہم کو

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو ۴

ٹپکے ہے جائے عرق ہر بُنِ مو سے پیکاں
یہ ہدف کس نے کیا تیرِ بلا کا ہم کو

ہم سفر ہو نہ سکا کوئی بھی اپنا۔ لیکن
جادہ پہنچانے گیا تا لب دریا ہم کو

ہم وہ ہیں رند کہ اس عالم پیری میں بھی ہے
اُلٹی میخانہ سے جوں پنبۂ مینا ہم کو

سنگدل۔ تین دن اب گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سوم میں جو ترے آنے کا دھڑکا ہم کو

تو ہنسی سے یہ نہ کہہ مرتے ہیں ہم بھی تم پر
مار ہی ڈالے گا بس رشک ہمارا ہم کو

پھرتے ہی آنکھ کے پھیرینگے گلے پر خنجر
ہو چکا آپ کا معلوم ہے ایسا ہم کو

گرمیٔ تپ سے ہوا سوز دروں جو افشا
آگیا مارے خجالت کے پسینا ہم کو

حسرت اے خواری و وحشت کہ گریباں کا تار
ہو گیا ضعف سے تارِ رگِ خارا ہم کو

کھانے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہم نے
ورنہ ہے زہر تو ہر طرح گوارا ہم کو

نہ اُٹھیں شور قیامت سے بھی وہ مست ہیں ہم
کہے جب تک کہ نہ قم قم لب مینا ہم کو

۴ ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو

وصل کا اُس کے تصور جو بندھا رہتا ہے
تو مزے ہجر میں بھی آلے ہیں کیا کیا ہم کو

واہ قسام ازل۔ صدقہ ہم اس قسمت کے
جام عشرت اُسے۔ اور داغ تمنا ہم کو

دل میں نشتر نگہِ یار کا آہی کھٹکا،
وہی پیش آیا جو مدت سے تھا کھٹکا ہم کو

کشتہ ہی ہوتا ہے اکسیر کہ مثلِ سیماب
کچھ کُشندہ سے نہیں خون کا دعوےٰ ہم کو

ق

رہی ہر طرح سے صیدی کے کبوتر کی طرح
ہاتھ سے اُس بت بیدرد کے ایذا ہم کو

صید ہی میں نہ فقط ذبح کا کچھ قصد رہا
صلح بھی ٹھیری تو پھڑکا ہی کے چھوڑا ہم کو

ذوق بازیچۂ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اُلفت کا گر ہے نخل تو سرسبز ہوئیگا
سو بار جڑ سے پھینکدے اسکو اُکھیڑ تو

عمرِ رواں کا توسنِ چالاک اس لئے
تجھ کو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو

[illegible]

اے زاہد دورنگ نہ پیرآپ کو بنا — مانند صبح کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اس صید مضطرب کو تامل سے ذبح کر — داماں وآستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

جوسوتی بھیڑ اپنے شروشور سے جگائے — دروازہ گھر کا اُس سگِ دُنیا سے بھیڑ تو

چھٹتا ہے کوئی مر کے گرفتارِ دامِ زلف — تربت پہ اُس کی جال کا پائے گا پیڑ تو

یہ تنگنائے دہر نہیں منزلِ فراغ — غافل نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت کے ہاتھ اُٹھا
اے ذوق یہ اُٹھا نہ سکے گا کھکیڑ تو

[illegible]

موت ہی سے کچھ علاج دردِ فرقت ہو تو ہو — غسلِ میّت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

بعد مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو — یاں کہاں راحت جراحت پر جراحت ہو تو ہو

ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل — عشق غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

کہتے ہیں شور قیامت جس کو وہ اے چشم یار — تیرے مستوں کی صفیرِ خوابِ غفلت ہو تو ہو

آگ میں جل مرتا ہے پروانہ سا کرم ضعیف — آدمی سے کیا نہ ہو۔ لیکن محبت ہو تو ہو

انتظار یار میں جو چشم ہو جائے سفید — مردمک اس میں کہاں ہو داغِ حسرت ہو تو ہو

دستِ ہمت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ — پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

تلخ کامی ہی میں گذری زندگانی عمر بھر — جانِ شیریں کے دیئے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں لُغت کا نام — اگلے مکتوبوں میں کچھ اُس سے کتابت ہو تو ہو

رات اک پگڑی ہوئی رکھی میکدہ میں رہن سے
ذوق وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

غزل مرقوم الذیل اور اُس کے بعد کی غزل ابتدائی مشق کی تحریریں ہیں جب ان میں سے پہلی غزل لکھی اور دوستوں کو سُنائی تو خاص و عام کے کانوں میں نئے وزن کی آواز گئی۔ سب خوش ہوئے اور تعریفوں نے جوانی کا دل بڑھایا۔ فرماتے تھے کہ ابتدائے عمر طبیعت کی اُمنگ۔ دل باغ باغ تھا کہ آج ہم نے وہ غزل لکھی جو اب تک

کسی نے نہ لکھی تھی۔ اللہ تیرا شکر کہ تو نے یہ نعمت دی۔ ساتھ ہی دوسری غزل اور بحر میں لکھی۔ زمانہ کے ناموروں کو پہلی تعریف اور شہرت بھی خوش نہ آئی تھی۔ دوسری غزل پر ناخوشی پھوٹ ہی۔ اور کہا کہ اس بحر میں پہلے کسی نے غزل نہیں لکھی۔ یہ جائز نہیں ✣

آغاز عمر۔ ابتدائے مشق۔ کوئی تقویت دینے والا ساتھ نہیں۔ گھبرا گئے۔ مولوی شاہ عبد العزیز صاحب اُن دنوں زندہ تھے۔ ان سے جاکر حال بیان کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ معترض بے خبر ہیں۔ فارسی میں مرزا بیدل نے اکثر غزلیں نئی بحروں میں لکھی ہیں۔ اور خوش آئندہ بحر کا نکالنا حسن طبع ہے نہ کہ عیب۔ اُستاد نے کلیات بیدل دیکھا تو بہت غزلیں نئی نئی بحروں میں نکلیں۔ اُنھیں دیکھکر دل قوی ہوا ✣

وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اُس وقت کی باتیں نئی روشنی والوں کو عجیب معلوم ہوتی ہیں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح بند تھی۔ مگر آمد و رفت اُسی آداب و تعظیم کے ساتھ جاری تھی جوکہ اہل سعادت کی عادت ہے۔ اور وہ بھی شفقت بزرگانہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ بموجب معمول کے ایک دن اُن کی خدمت میں گئے۔ اور سب حالات سُناکر دونوں غزلیں سُنائیں۔ اُنھوں نے بھی کہا کہ خوب غزلیں لکھیں۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ دوسری غزل بہت خوب ہے اسے مشاعرہ میں پڑھنا ✣

اُستاد مشاعرہ میں گئے تو تعمیل فرمائش کا خیال کرکے اُس غزل کو بھی لے گئے اور غزل طرح کے بعد شاہ صاحب مرحوم سے کہا کہ اجازت ہو فرمائش کی تعمیل کروں۔ اُنھوں نے فرمایا۔ ہاں بھئی سُناؤ۔ جگہ تو یہی ہے۔ اب کچھ تو ابتدائی مشق۔ کچھ بحر نئی۔ غرض اتفاق یہ کہ غزل دوم کے مطلع میں مصرع دوم پر پھر کا لفظ نہ تھا۔ جب اُستاد نے مطلع پڑھا تو شاہ صاحب نے اُس کی تعریف معمول سے کچھ زیادہ کی۔ اور کہا کہ بھئی! اس مطلع کو پھر پڑھنا۔ اُستاد مرحوم

رُکے کہ یہ بات کیا ہے؟ ساتھ ہی خدا نے آگاہ کیا۔ اور لفظ بھی دیدیا۔ یعنے پہلے کہا تھا۔ ع۔ زلف بنے وہ دستِ موسےٰ۔ اب پڑھا۔ ع

پھر زلف بنے وہ دستِ موسےٰ جس میں اخگرِ آتش ہو

شاہ مرحوم خوش ہو گئے اور یہ ترمیم ایسی بدائۃً ہوئی کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ نوجوان کی شوخیِ طبع تھی۔ عمداً پہلے پھر کا لفظ نہ سُنایا تھا۔ یہاں آپ ہی چوٹ کھائی۔ آپ ہی اُس کا توڑ کیا +

غزل اوّل

تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مزدِ قلق ہو
یہی حق ہے قاتل اگر حق دلا دے۔ یہ بسمل ترے پاؤں پر جاں بحق ہو
جو مَے نوش وہ شوخ رشکِ قمر ہو۔ تو سُرخی نہ کیوں اُسکے رخسار پر ہو
غروب آفتاب درخشاں اگر ہو تو کس وجہ پیدا نہ رنگِ شفق ہو
کتاب محبت میں اے حضرت دل بتاؤ کہ تم لینے کتنا سبق ہو
کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہی۔ لیئے دستِ افسوس کے دو ورق ہو
کرو دونوں آنکھوں کے طبقے یہ روشن۔ کہ ہوجاؤ رشکِ مہ چار دہ تم
سُنا ہے کہ تم نور سے اپنے کرلے۔ منوّر یہ یک جلوہ چودہ طبق ہو
یہ کشتوں کا اُس مانگ کے اک پتا ہے کہ اُن تیرہ بختوں کی تربت پہ کوئی
اگر سنگ موسےٰ کا تعویذ رکھدے۔ تو رکھتے ہی نبرد رمیاں سے وہ شق ہو
مری زندگی تھی ابھی اے ستمگر۔ مسیحائی جو کر گئی تیری ٹھوکر
کہ ٹھکرا یا تو نے تو یہ تھا سمجھ کر۔ نکل جائے جاں کچھ جو باقی رمق ہو
اگر رشک گلشن نہ ہو مجھ سے باہم۔ تو گلشن میں ہووے یہ وحشت کا عالم
چٹکنا ہو غنچوں کا آوازہ ضیغم۔ چمن مجھ کو اک وادیِ لق و دق ہو
اگر زخم سینہ سے بھاہا اُٹھاؤں۔ تو خورشید محشر کو میں تپ چڑھاؤں

اگر سینۂ داغ دل کو دکھاؤں ۔ تو صبح قیامت کا سینہ دم میں شق ہو

یہ بحر و قوافی غزل کے بدل کر۔ رقم اک غزل کر کہ اے ذوق جس میں
نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق۔ جو فی الجملہ کچھ ہو تو مضموں ادق ہو

غزل دوم

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے۔ گر اس میں زلف سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دست موسے جس میں اخگر آتش ہو
اے قاتل حلق بریدہ سے۔ اک شعلۂ دل گر سرکش ہو
تو روشن حلقہ جیب کا میری۔ مثل تنور آتش ہو
ہو تیرا سیہ رو صبح ہجراں ۔ رخصت مجھ سے وہ مہ وش ہو
کیوں! کھینچوں آہ کہ خود بھی پنہاں زیر دود آتش ہو
لبریز شراب ناز دکھا تو ساغر چشم کافر کو
تا زاہد پاک ملوث ہو۔ یا صوفی دم کش میکش ہو
تم وہ وہ زخم دل پر میرے کرتے ہو دکھلانے کو
پر پرش تیغ ناز سے اپنے دل میں کرے غش غش ہو
دل نخل میں قد کے جوں ذکر آیا چھپکر چشم کافر سے
اب اشارۂ جنبش ابرو سے کیونکر نہ بزیر کشاکش ہو
لبیک و اذاں۔ ناقوس و جرس۔ یا قلقل مے۔ یا نالۂ نے
دل کھینچنے کو اے ہمنفسو! کوئی تو نوائے دلکش ہو
بن تیرے گھر کی آرائش۔ جب دشمن جاں ہو عاشق کی
محراب طاق کمان بن جائے۔ دستۂ نرگس ترکش ہو
مانند نمکداں چرخ پہ انجم حق نے بنائے اپنے لئے
تا ہر لب زخم حسرت میرا ہجر کی رات نمک چش ہو

گر کلکِ آہ کو گردش دوں تو دودۂ شمع دل سے مرے
طاؤس فلک کا سینہ ابھی۔ جوں سینۂ باز منقش ہو
جب ضعف سے مجھ کو غش آیا تو طنز سے وہ کیا کہتا ہے
بس غش نہ کرو ہم جان گئے تم مرنے پر از حد غش ہو
کیا خون کے دریا جذب گئے ہیں خاکِ کوچۂ قاتل نے
مدفن کو بھی اُس کے ستمکش کے ایسی ہی زمین دلکش ہو
بس چھوڑ دو دامن قاتل کا لو ہاتھ بہائے خوں سے اُٹھا
جب اپنا بہا خوں پاؤں پہ اُس کے دل کیوں اُسکا مشوش ہو

کیا رجز کو کر مقطوع و مرفل تم نے یہ غزل لکھی ہے
ذوق اس کی بحر کو سُن کر شاداں روحِ خلیل و اخفش ہو

دن کٹا جائیے اب رات کدھر کاٹنے کو
ہائے صیاد! تو آیا مرے پر کاٹنے کو
اپنے عاشق کو نہ کھلواؤ کنی ہیرے کی
دانت انجم سے نکالے ہوئے تجھ بن مجھ پر
وہ شجر ہوں نہ گل و بار نہ سایہ مجھ میں
سر و گردن۔ جگر و دل ہیں یہ چاروں حاضر

جب سے وہ گھر میں نہیں دوڑے ہے گھر کاٹنے کو
میں تو خوش تھا کہ چھری لایا ہے سر کاٹنے کو
اُس کے آنسو ہی کفایت ہیں جگر کاٹنے کو
مُنہ فلک کھولے ہے اے رشک قمر کاٹنے کو
باغباں سے نہ ہے لگا رکھا مگر کاٹنے کو
چاہے دل یار کا چورنگ اگر کاٹنے کو

شام ہی سے دلِ بیتاب کا ہے ذوق یہ حال
ہے ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

چرخ ضدی ہے کوئی ضد نہ دلاوے اسکو
دیکھیں تم کیسے بھلکڑ ہو جسے کرتے ہو یاد
قالبِ خاکیٔ انساں کو بنا کر کچا
آبرو خاک میں دی اُس نے ملا آئینہ کی

کہ سُنے عود کو غرقی تو جلاوے اسکو
بھول تو جاؤ بھلا میرے بھلاوے اسکو
عشق کی آگ میں ڈالا کہ پکا ہووے اسکو
مجھ سا ہو آئینہ تو مُنہ نہ دکھاوے اسکو

منہ ہے کیا شمع کا ہو بزم میں تجھ سے روشن / چٹکیوں میں ابھی گلگیر اڑا دوے اس کو
آئے تصویر ہی اس کی وہ نہ آئے تو نہ آئے / پر مرے پاس کوئی کھینچ ہی لاوے اس کو
پیار کی بات یہ مجھ سے نہیں اک اور سے ہے / یہ تری یہ خو ہے کہے مجھ کو سناوے اس کو
وہ عیادت کو مری آئے تو کیونکر آئے / مر بھی جاؤں تو ذرا رحم نہ آوے اس کو

مشت خاک اپنی ہم اس کوچہ میں کل پھینک آئے
اب وہ ذوق آپ اٹھائے نہ اٹھاوے اس کو

سگِ دنیا پس از مردن بھی دامنگیرِ دنیا ہو / کہ اس کتے کی ہٹی سے بھی کتا گھانس پیدا ہو
ہجوم آور جو آنکھوں میں ترا شوق تماشا ہو / تو شاخ ہر مژہ سے چشم نرگس وار پیدا ہو
ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو / فلک پر سن کے ہنستے ہنستے شادی مرگ عیسیٰ ہو
نہ ہووے دسترس دامان وصل یار تک ہرگز / اگرچہ سر سے عاشق پاؤں تک دست تمنا ہو
مجھے کیا چاہئے عقدہ کشا سوزِ محبت میں / گرہ میری سپند آسا مری فریاد سے وا ہو
درازی میں شب غم کی اگر بہلائے دل مجنوں / خیال زلف لیلےٰ اس کے حق میں الف لیلہ ہو
کرے پرواز مرغ جاں اگرچہ شاخ طوبےٰ تک / پر اس تارِ نظر سے مثل مرغِ رشتہ برپا ہو
حلاوت یاں کہاں جب بیچ ہے آبِ شور کا دریا / زلالِ خضر کا اک چشمہ سو بھی سب سے اخفا ہو
تصور یوں کبھی غفلت میں آ جاتا ہے مرنے کا / کہ جیسے عالمِ رویا میں چشم کور بینا ہو
مجھے بلوہ میں مارا ہے نگاہ و ناز و مژگاں کے / بتاؤں کس کو قاتل کس سے میرے خوں کا دعویٰ ہو
یہ شہرت نام کی بھی وہ بلا ہے پیچ ہستی کا / کہ صحرائے عدم میں گردن عنقا کا پھندا ہو
مرے صحرا میں وہ وحشت پرستی ہے کہ مجنوں کے / گرے گر سر پہ قطرہ آبلہ زیر کفِ پا ہو
کہیں کیا دل کی وسعت اپنی ہم اللہ رے وسعت / اگر نہ آسماں ہوں جمع اک خال سویدا ہو
اکیلا رہ گیا یاروں سے یوں ہوں ناتوانی میں / کہیں شاخِ خزاں دیدہ پہ جیسے زرد پتا ہو

جو ذکر اللہ کو ہو ذوق مانع مایۂ عشرت
تو کیوں حق حق کرے وہ شیشہ جس شیشہ میں صہبا ہو

سرد مہری سے تری گر خوں دل یخ بستہ ہو
پھر نہ ٹپکے۔ کو ترہ دل گرچہ سب بشکستہ ہو

کیونکہ قابو میں فلک کے عاشق وارستہ ہو
یہ تو جب ہو گر کماں کے بس میں تیر جستہ ہو

ہر قدم پہ ہے خراش پائے مجنوں گل فشاں
تاکہ اک اک خار صحرائے جنوں گلدستہ ہو

کیا ہوا داغ محبت سے ہوا دل سر بمہر
یہ نہیں ممکن کہ میرا راز دل سر بستہ ہو

کیا نکالے سوزنِ الماس دل سے غم کی پھانس
جتنی یہ کاوش کرے اُتنی ہی یہ پیوستہ ہو

مُنہ سے جو نکلے مزا جب ہو کہ ہووے دلنشیں
آہ موزوں ہے کہ نالہ مصرعۂ برجستہ ہو

جانے کیا بیدرد انداز کلام درد مند
ذوق میرا ہم سخن گر ہو کوئی دل خستہ ہو

ایک دن عرفی کے قصیدہ نعتیہ کے اشعار پڑھ کر طبیعت میں ذوق و شوق پیدا ہوا۔

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لاو نعم را

فرمایا کہ بڑے بڑے اُستادوں کے قصیدے اس زمین میں ہیں۔ اُس مرحوم نے بھی معرکہ میں لکھا تھا۔ اور عقیدت سے لکھا تھا۔ ہم اپنی زبان میں عرض حال کریں گے۔ چنانچہ اُسی دن شروع کیا۔ اور قلم برداشتہ یہ اشعار لکھے۔ پھر فرصت نہ ہوئی کہ تمام کرتے۔ اب یہ ردیف واو کے ۱۲ شعر ہیں۔ باب قصائد میں لے جانا کیا ضرور ہے یہیں لکھ دیتا ہوں۔

پتھرا دیا جلوہ نے ترے چشم صنم کو
چکرا دیا غمزہ نے ترے طوف حرم کو

جب سے کہ لکھا ہے ترا وصفِ رُخِ زیبا
چومے ہے قلم لوح کو اور لوح قلم کو

رونق ہے بہار گل رخسار سے تیری
گلزار حدوث و چمنستان قدم کو

جائے نہ کجی طبع جفا پیشہ سے ہرگز
کس طرح نکالے کوئی شمشیر کے خم کو

کیا ڈھونڈتا ہے تو عمل بغض و محبت
چلتا ہوا تعویذ سمجھ نقش درم کو

ہیں اشک کباب اشک ترے سوختہ جاں کے
پر کرتے ہیں خوں شبنم گلزار ارم کو

دیوانہ ترا قید سے ہستی کے جو چھوٹا
جڑھ جائے گا اک زلزلہ صحرائے عدم کو

جس دن سے زمیں پہ ہے فلک خاک ہے اُڑاتی
دیتے تھے یہاں راہ نہ اس سنر قدم کو

خوبی سے نہیں رونقِ بازار کہ یوسف
اس شکل و شمائل پہ بکا چند درم کو

کیا دے گا دم آ کر کسی بے دم کو مسیحا
اللہ سلامت رکھے اس تیغ کے دم کو

دے جام مجھے چشمِ عنایت سے جو ساقی
دکھلاؤں تماشا ابھی کیخسرو و جم کو

بد ہو کوئی یا نیک رقم کام ہے اس کا
احوالِ بد و نیک سے کیا کام قلم کو

منزلِ گم گشتگاں بالکل الگ دنیا سے ہو
آسماں بھی ہو اگر واں بیضۂ عنقا سے ہو

سایہ افگن جب تو اپنے قدِ رعنا سے ہو
گرد باد اُس خاک پر ہمسر قدِ طوبیٰ سے ہو

گر کرے معجز نمائی جلوۂ رخسارِ یار
وہ کفِ آئینہ سے ہو جو یدِ بیضا سے ہو

میں وہ مجنونِ بیاباں مرگ ہوں جسکے لئے
جو ہو چادر یا کفن وہ دامنِ صحرا سے ہو

سبحہ صد دانہ بھی پڑ جائے اگر میرے گلے
دانۂ انگور تارِ پنبۂ مینا سے ہو

دشت کو سیراب کر دے آبلہ پائی مری
ہر قدم پر چشمہ جاری چشمِ نقشِ پا سے ہو

ثابت اک ٹانکا نہ چھوڑے دلکا میرِ اضطراب
چاکِ سینہ گر رفو تارِ رگِ خارا سے ہو

تشنہ کامی گر مری دیوے جھکا شوراب اشک
ذوق شور العطش پیدا لب دریا سے ہو

صفا میں رُخ سے تیرے آئینہ کیا خاک ہمسر ہو
نگاہِ چشم سرمہ آلود سے بھی جو مکدر ہو

مری تاثیر وحشت وہ ہے مضطر جس سے پتھر ہو
نگیں پر نام لکھدوں تو نکل کے گھر سے باہر ہو

ترا دیوانہ دل سوختہ آتش قدم گر ہو
جلا دے زیرِ پا گر خارِ مژگان سمندر ہو

قیامت کو بھی کیا انصاف اپنا اے ستمگر ہو
ابھی قصہ نہ ہو آخر کہ آخر روزِ محشر ہو

جو تو دریا میں دھوئے ناخنِ پا گلبدن اپنے
تو ہر اک فلسِ ماہی شکلِ برگِ گل معطر ہو

ڈبو دیں آشنا کو گر سبک دوش اپنی صحبت میں
تو آہن ساتھ کیوں لکڑی کے دریا میں شناور ہو

کھٹکتے ہی رہیں دل میں ترے مژگان برگشتہ
ہجومِ نیش کژدم سے اگر دل گنجِ نشتر ہو

کیا یہ سوختہ جاں تو نے مجھ کو سرد مہری سے
کہ آہ سرد میری شمع کافوری سے ہمسر ہو

حرم کو جائے زاہد ہم تو میخانہ کو چلتے ہیں
مبارک اس کو طوفِ کعبہ ہم کو دورِ ساغر ہو

نشہ ٹوٹے ترے ساغر کشِ وحشت کا کیا ممکن
اگر سو ٹکڑے سنگِ کودکاں سے کاسۂ سر ہو

بچائے حق تعالےٰ اُس یزیدی شمر مشرب سے
کہ خونِ سید کا جس بے رحم کو خونِ کبوتر ہو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ میں وابستۂ زنجیرِ جوہر ہو

مجھے صحنِ چمن بھی عرصہ گاہِ حشر ہو تجھ بن
گلِ خورشید میرے واسطے خورشیدِ محشر ہو

جو کھوئے آپ کو وہ منزلِ مقصود کو پہنچے،
تری گم گشتگی اس راہ میں اے ذوق رہبر ہو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

سمجھ تو کور سوادوں کو ہو جو علم نہ ہو
اگر سمجھ بھی نہ ہو کور بے عصا سمجھو

نہ سمجھو دشت شفا خانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک سی بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

پڑے کتاب کے قصوں میں کیا. کرو دل صاف
صفا ہو دل تو یہ از روضۃ الصفا سمجھو

زہے نصیب کہ ہنگامِ مشقِ تیرِ ستم
ہمارے ڈھیر کو تم تودہ خاک کا سمجھو

ہنسے وہ رونے پہ میرے تو پھر صفِ مژگاں
نہ سمجھو چشم پہ دیوارِ قہقہا سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

تمھاری راہ میں ملتے ہیں خاک میں لاکھوں
اس آرزو میں کہ تم اپنا خاکِ پا سمجھو

دعائیں دیتے ہیں ہم دل سے تیغِ قاتل کو
لبِ جراحتِ دل کو لبِ دعا سمجھو

بہا دیا مرا خوں اُس نے اپنے کوچہ میں
اسی کو یارو دیت سمجھو خوں بہا سمجھو

سمجھ ہے اور تمھاری کہوں میں تم سے کیا
تم اپنے دل میں خدا جانے سُن کے کیا سمجھو

تمھیں ہے نام سے کیا کام مثلِ آئینہ
جو روبرو ہو اُسے صورت آشنا سمجھو

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیِ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

یہ چار غزلیں مرحوم الذیل ابتدائی مشق کی ہیں۔ اور اُنھیں غزلوں میں سے ہیں جنھیں اُستاد مرحوم کہتے تھے کہ بعض مرشد زادوں کی فرمائش سے اُن کے مشغلہ موسیقی کے لئے لکھدی تھیں۔ باوجود اس کے اہل نظران کے مضامین کو۔ اور قوافی کے پہلو کو دیکھیں گے کہ کس رتبہ پر ہیں:۔

ہاتھ سینہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
اک نظر دل سے ادھر دیکھ لو گر دیکھتے ہو

ہے دمِ بازپسیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو
آئینہ مُنہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو

ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال
ہو مجھے دیکھتے یا اپنی کمر دیکھتے ہو

پر پروانہ پڑے ہیں شجر شمع کے گرد
برگ ریزیٔ محبت کا ثمر دیکھتے ہو

بید مجنوں کو ہو جب دیکھتے اے اہل نظر
کسی مجنوں کو بھی آشفتہ بسر دیکھتے ہو

شوق دیدار مری نعش پہ آ کر بولا
کس کی ہو دیکھتے راہ اور کدھر دیکھتے ہو

غزل

لذّتِ ناوکِ غم ذوق سے ہو پوچھتے کیا
لب پڑے چاٹتے ہیں زخم جگر دیکھتے ہو

دوم

عبث تم اپنی رُکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

لگا کے سُرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو
یہ ہمکو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو

چھپا کے پان یہ کس کے لئے بناتے ہو
ہمارے قتل کا بیڑا کہیں اُٹھاتے ہو

تم اپنے رُخ پہ یہ کاجل کا تل بناتے ہو؟
کہ میرا اخترِ بختِ سیہ دکھاتے ہو؟

اگر دباؤ کسی کا تمھارے دل پہ نہیں
تو ہم کو دیکھ کے تم کان کیوں دباتے ہو

ملاپ جانیں جبھی ہم کہ دے کے تم بوسہ
کہو کہ آؤ زباں سے زباں ملاتے ہو

مریض عشق کو تم پوچھکر طبیبوں سے
مدام شربت عناب کیا پلاتے ہو

ہوں خاک چاٹ کے کہتا ابھی شفا ہو جائے
جو شربت لب میگوں ذرا چٹاتے ہو

جگر کے آبلے جو پھوڑتے ہو حضرت عشق
ہماری چٹکیوں میں ہم کو تم اڑاتے ہو

گلو! یہ کہہ گئی کیا کان میں تمھارے صبا
کہ لوٹے جاتے ہو۔ پھولے نہیں سماتے ہو

جلن سے رشک کے ہیں ہڈیاں جسلی جاتیں ۔۔۔ کہ ہائے تم نئے قلیاں کو مُنہ لگاتے ہو

ق

ہماری لاش پہ آ و ا ز قم باذن اللہ ۔۔۔ تم آ کے حضرتِ عیسےٰ عبث سُناتے ہو

اُٹھیں گے یار کی ٹھوکر سے لے چلو تشریف ۔۔۔ نہیں تو پھر کوئی صلوات سُن کے جاتے ہو

جلا رہے ہیں سویدائے دل کو ہم اپنے ۔۔۔ نظر گذر کو تم اسپند کیا جلاتے ہو

ہو کرتے سبزۂ خط کی جو سیر آئینہ میں ۔۔۔ نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

نمک چھڑکتی ہے شبنم گلوں کے زخموں پر ۔۔۔ دکھلا کے تم لب و دنداں جو کھلکھلاتے ہو

ق

ہمیشہ صدقتہ اُس ابرو کے ہو کے حضرتِ دل ۔۔۔ یہ لب پہ نالۂ جانکاہ اپنے لاتے ہو

دیا طوافِ حرم میں ہے سامنے محراب ۔۔۔ اور اس میں نعرۂ لبیک تم سُناتے ہو

وہ آئے بام پہ ہیں ہمدمو نہ بیٹھو اب ۔۔۔ اُٹھاؤ میرا جنازہ اگر اُٹھاتے ہو

یہ صید بستۂ فتراک کھل پڑے نہ کہیں ۔۔۔ سمندِ ناز کو تیز اتنا کیوں اُڑاتے ہو

ق

مرے لئے تو ہر اک طرح سے قباحت ہے ۔۔۔ یہ تم جو دشمنوں کو دردِ سر بتاتے ہو

لگاؤں گھس کے جو صندل تو کہتے ہو کہ مجھے ۔۔۔ لگاوٹ اتنی بھلا کس لئے دکھاتے ہو

جو پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کروں تو کہو ۔۔۔ کہ دے کے دم مجھے اخلاص کیا جتاتے ہو

یہ ایسا کونسا اندازِ گفتگو ہے ذوق
کہ جس پہ زورِ طبیعت تم آزماتے ہو

جو کہوے قدِ یار کی تصویر دکھا دو ۔۔۔ تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھا دو

دیکھو! سرِ مقتل نہ کہیں چھوڑ دے بسمل ۔۔۔ پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھا دو

حالتِ طپشِ دل کی مرے پوچھیں اگر وہ ۔۔۔ تم اُن کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھا دو

گر دیکھ لے زاہد تو پھر ایمان ہی لائے ۔۔۔ تم مصحفِ رُخ اُس کو بہ تدبیر دکھا دو

گر جا ہو ثریا ہو نہاں پردۂ شب میں ۔۔۔ جھمکوں کو تہِ زلفِ گرہ گیر دکھا دو

اُس چشم کو ہے ناز بڑا تیرِ نگہ پہ ۔۔۔ اے حضرتِ دل! آہ کی تاثیر دکھا دو

وہ برق نگہ اپنا ہے دکھلا رہی عالم ۔۔۔ اس نالۂ جانسوز کا اک تیر دکھا دو

ن ایسا نہ ہو مقتل میں کہیں چھوڑ دے بسمل

گرو وہ نہیں آ سکتے یہاں تنگ تو بلا سے دیتے ہیں خبر غیب کی گر شیخ جی صاحب اک جان ہے۔ اک دل ہے سو ہیں یک رُخ و یک رنگ	لا کر کوئی اُن کی مجھے تصویر دکھادو کہدو کہ ہمیں تم خطِ تقدیر دکھادو تم چاہو تو ہر رنگ میں تاثیر دکھادو

لطف و کرم یار کے تم پر جو ہیں منکر
ذوق آج اُنھیں تم یار کی تحریر دکھادو

مجھے ابتدا سے سن رسیدہ لوگوں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ ایک بڈھے نے ایک دن کہا کہ ہمیں تمھارے اُستاد کی ایک غزل یاد ہے۔ اُن کے لڑکپن کی ہے وہ بیچارہ بے علم تھا۔ اور طول عمر نے بدحواس کر دیا تھا۔ غلط سلط جو کہتا گیا میں نے لکھ لیا۔ اُستاد کو لاکر سُنائی تو ہنسے اور فرمایا۔ بہت لڑکپن کی غزل ہے کہاں سے ہاتھ آ گئی۔ سرسری طور پر درست کر کے لکھوا دی۔ اور کہا کہ رکھ چھوڑو کبھی فرصت میں بنائیں گے۔ (بندۂ آزاد کہتا ہے) کہ کچھ ہو مگر اس کے قافیوں کو دیکھو کہ کیا کیا برجستہ پہلو سے بیٹھے ہیں۔ اور مضمون بھی صاف بچپن کے معلوم ہوتے ہیں +

دمِ ذبح تیغ جفا میں جب تری بہتا آب حیات ہو
تو شہید ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعد ممات ہو
جو مذاق شعر کو اے پری میں چکھاؤں تیری شکر لبی
قلم اُنگلیوں میں جو ہے مری ابھی رشک شاخ نبات ہو
جو ہیں کرتے میرے لئے دُعا کہ ہو دام عشق سے دل رہا
تو ہے دل یہ کہتا کہ اے خدا انھیں اس جنوں سے نجات ہو
مجھے سب ہیں کہتے کہ صبر کر جو نہیں تو صبر سے در گذر
سرِ حسن و عشق پری میں پر۔ نہ وہ بات ہو نہ یہ بات ہو
سرِ راہ کشتۂ ناز کا۔ وہ مزار ہے نظر آ رہا

پڑھو آج اسپہ بھی فاتحہ چلو داخل حسنات ہو
ترا حسن وہ بت مہ جبیں کہ ہے صدقہ جسپہ زماں زمیں
جو دکھائے رُخ تو ہو دن وہیں جو چھپائے مُنہ ابھی رات ہو

جو ہیں مرے محسن صفات ہیں وہ رہیں گے اپنی ہی بات میں
تو فنا ہو ذوق اُسی ذات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو	کہ نہیں جائے سر اُٹھانے کو
قصد کعبہ کا تھا پھرے اُلٹے	چُوم کر اُس کے آستانے کو
تو مکدر نہ ہو تو عشق میں ہم	اک آندھی ہیں خاک اُڑانے کو
یہاں تک لاغری ہے اس ترے بیمار کے تن کو	عجب کیا ہے جو سمجھے طوق گردن چشم سوزن کو
زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفس امارہ	یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار رہزن کو
کمند نام وشہرت کھینچ لاتی ہے عدم سے بھی	لپٹ کر مثل طوق فاختہ عنقا کی گردن کو
تصور کس طرح بھولے ترا اس چشم گریاں کو	نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو
نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیر جاناں کو	نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو
رکھا مہماں بہانہ سے ترے اُس ماہ تاباں کو	بڑے ہی وقت کام آیا مرے۔ رحمت ہے باراں کو
دیکھا دم نزع دل آرام کو	عید ہوئی ذوق وہے شام کو
تم مسی مل کر نہ غرفہ سے نکالا مُنہ کرو	اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا مُنہ کرو
اشکباری مری مژگاں کی ذرا دیکھیں تو	کتنے پانی میں ہیں فوارے بھلا دیکھیں تو

یا تو پا ہِن دو بستی تجھ کو بت بیباک ہو — یا مجھی کو موت آجائے کہ قصہ پاک ہو

غیر نے ایسا پڑھایا کچھ مرے محبوب کو — لاکھ ہجوں سے پڑھا اُس نے مرے مکتوب کو

پوشاک تنبی آپ کو گر دل پسند ہو — دریا پری حباب کے شیشہ میں بند ہو

(پوشاک تنبی ان کو اگر دل پسند ہو)

خبر کر جنگ نوفل کی۔ تو مجنوں اہل ہاموں کو — کبا وہ تا صبا کھچوائے شاخ بید مجنوں کو

جاتے ہیں اب تو کوئے بت لالہ فام کو — اپنا تو بس سلام ہے دار السلام کو

فرماتے تھے کہ یہ ہم نے امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ کرتے ہیں تو اسطرح کیا کرتے ہیں۔

حق نے تجھ کو اک زباں دی اور دئے ہیں کان دو — اس کے یہ معنی کہے اک اور سُنے انسان دو

کہے ایک جب سُن لے انسان دو — کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

نہ شبنم کو کہو بلبل کے آنسو — یہ ہنستے ہنستے نکلے گُل کے آنسو

ایک دن کئی اُستادوں کے مطلع سنائے اور فرمایا ان کے جواب نہیں۔ لاثانی ہے۔ انہی میں جُرأت کا مطلع پڑھا۔

رُتبہ گل بازی[ل] کا دلا کاش تو پاتا — ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اُٹھاتا

ل ہندوستان کے نوجوانوں میں یہ بھی ایک کھیل ہے کہ دو یار آمنے سامنے ایک گلاب یا گیندے کا پھول لیکر چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو جاتے تھے یہ اُس پر پھینکتا ہے وہ اس پر۔ ۱۰۔ ۱۵ دفعہ برابر ردو بدل رہتی تھی جس کے ہاتھ سے پھول گرتا وہ ہار جاتا۔ ہارنے کی سزا یہ تھی کہ اُٹھاؤ آنکھوں سے۔ جرأت کے شعر میں لطف یہ ہے کہ کہتا ہے۔ کاش میرا دل یار کی گلبازی کے کام آتا۔ اگرچہ بہت سی چوٹیں کھانی پڑتیں۔ اور گرتا۔ لیکن اسکے ہاتھوں۔ اور ہاتھوں سے آنکھوں تک تو جا پہنچتا۔

پھر فرمایا کہ لڑکپن میں یہ مطلع سُنکر ہم نے بھی ایک مطلع کہا تھا۔ بھلا یہ کجا وہ کجا۔ وہ اور یہی بات ہے۔ پھر اپنا مطلع پڑھا:۔

جتنا[۱] ہے نمک۔ سب مرے زخموں میں کھپاؤ ‖ پلکوں سے اُٹھاؤ گے نہ ہاتھوں سے گراؤ

اللہ مغفرت کرے کیا باانصاف طبیعت۔ اور نیک دل لائے تھے۔ دیکھ لو۔ ویسا ہی حسن قبول بھی اللہ نے اُن کے کلام کو دیدیا ہے۔

انہی میں بقا کا بھی مطلع پڑھا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ دیکھو اس کا بھی جواب نہیں ہوا۔

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں ‖ اُس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

ایک دن نئے اور پُرانے الفاظ کے استعمال پر کچھ فرما رہے تھے۔ ایک اپنا مطلع پڑھا اور کہا کہ بچپن میں ہم ٹک اکثر بزرگوں سے سنتے تھے۔ خود بھی کہدیتے تھے۔

ٹک دیکھیو اُس لذت پیکاں کے اثر کو ‖ جنبش مرے اب تک ہے لب زخم جگر کو

(آزاد) دوسرے مصرع کو دیکھو کیا چستی سے لفظوں کو بٹھایا ہے کہ ایک کو جنبش نہیں ہو سکتی +

مطلع مرقوم الذیل لڑکپن کا کہا ہوا ہے:۔

دریا میں ترے حسن کے بالے ہیں بھنور دو ‖ اور اس پہ غضب یہ کہ پڑے اس میں مگر دو

ہائے ہوز

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ ‖ تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ
دیں کیونکہ نہ وہ داغ الم اور زیادہ ‖ قیمت میں بڑھے دل کی درہم اور زیادہ
ساتھ اپنے ہے اب فوج الم اور زیادہ ‖ کرتو بھی بلند آہ علم اور زیادہ
تیز اُس نے جو کی تیغ ستم اور زیادہ ‖ مشتاق شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

[۱] ایک مسئلہ لوگوں میں عام زباں زد ہے کہ نمک کو پھینکنا یا بے پروائی سے گرانا منع ہے۔ استاد کہتے ہیں کہ جتنا نمک ہے سب میرے زخموں میں کھپاؤ گراؤ گے تو آنکھوں سے اُٹھانا پڑے گا +

سر کٹ کے سرافراز ہیں ہم اور زیادہ
جوں شاخ بڑھے ہو کے قلم اور زیادہ

گر شرح جنوں کیجے رقم اور زیادہ
ہو چاک ابھی جیب قلم اور زیادہ

دیتا ہے وہ دم باز جو دم اور زیادہ
شیشہ کی طرح پھولے ہیں ہم اور زیادہ

گھبراتا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش
گھبرانے لگا سینہ میں دم اور زیادہ

کچھ کی رم شوق نے تاثیر جو پیدا
اُٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

لذّت سے محبّت کی ہے ہر زخم جگر کو
ذوق نمکِ درد و الم اور زیادہ

کرنے کو سیہ نہ ورق چرخ کو اے دل
نالہ سے نہیں کوئی قلم اور زیادہ

کیا ہووے گا دو چار قدح سے مجھے ساقی
میں لونگا ترے سر کی قسم اور زیادہ

گر میری طرح دوش پہ ہو بار محبّت
ہو پشت فلک میں ابھی خم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہو جس کو پس از مرگ بھی یاد دہنِ تنگ
تنگ اُس کو کرے کنجِ عدم اور زیادہ

اُس زلف کے مارے کی اگر خاک کو چاٹے
پیدا دہن افعی میں ہو سم اور زیادہ

اُس شوخ ستمگر کو مری مرگ ہے منظور
ہے زہر نہ کھانا مجھے سم اور زیادہ

ہستیٔ تنک مایہ جو پھونکے گی اسی طرح
ابھرے کا حباب لب یم اور زیادہ

وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا ان پہ بھرم اور زیادہ

کرتی ہے مری خاک جلا کر مجھے پامال
کیونکر نہ اُٹھاوے وہ قدم اور زیادہ

دکھلائے جو وہ صید فگن چشم کی شوخی
ہو آہوئے رم دیدہ کو رم اور زیادہ

آخر مئے عشق آنکھوں سے ٹپکائی کسی نے
بھڑکے ہے جو یوں آتش غم اور زیادہ

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کب اُن سے
روکیں تو ابھر جائے شکم اور زیادہ

مہمیز سر خار سے نکلا سرِ صحرا
کچھ توسن وحشت کا قدم اور زیادہ

صیدِ دل عاشق میں ہے مصروف وہ کافر
بے خوف ہے اب صید حرم اور زیادہ

گر سرمہ کرے خاکِ خرابات کو صوفی
سوجھیں اُسے پھر لوح و قلم اور زیادہ

اے ابروئے خمدار نہ پرسش میں کمی کر
ہاں تجھکو مرے سر کی قسم اور زیادہ

کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے رُکے ہے
اُتنا ہی اُسے چاہے ہیں ہم اور زیادہ

جاتا ہے شہیدانِ محبت کا جنازہ
دو تم بھی اُٹھا چند قدم اور زیادہ

یارب یہ مری نبض ہے یا موجِ رمِ برق
کیا ہوگا جو ہوگی تپ غم اور زیادہ

کہتا ہے مرا شوق جراحت کہ صد افسوس
اس تیغ دودم میں نہیں دم اور زیادہ

کیوں میں نے کہا تجھ سا خدائی میں نہیں اور
مغرور ہوا اب وہ صنم اور زیادہ

کہتا ہے گلے لگ کے مرے وہ دمِ خنجر
لو عشق کا بھر لو کوئی دم اور زیادہ

ق

اس عاشقِ بیچارہ کا ہے آج یہ کیا حال
گریہ سے ہے آنکھوں پہ ورم اور زیادہ

بیٹھے سرِ بستر پہ پڑا پاؤں کہاں تک
بس پاؤں نہ پھیلا شبِ غم اور زیادہ

ہے باغِ جہاں میں تجھے گر ہمتِ عالی
کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر اُنھیں کم اور زیادہ

اے ذوق وقتِ نالہ کے رکھ لے جگر پہ ہاتھ
ورنہ جگر کو روئیگا تو دھر کے سر پہ ہاتھ

میں ناتواں ہوں خاک کا پروانہ کی غبار
اُٹھتا ہوں رکھ کے دوشِ نسیمِ سحر پہ ہاتھ

خط دیکے دل میں تھا کہ زبانی بھی کچھ کہے
رکھا مگر کسی نے دلِ نامہ بر پہ ہاتھ

کھاتا ہے اس مزہ سے غمِ عشق میرا دل
جیسے گرسنہ مارے ہے حلوائے تر پہ ہاتھ

جوں پنجۂ شاخہ تو نہ جلا اُنگلیاں طبیب
رکھ رکھ کے نبضِ عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ

اے شمع دیکھ بزمِ فنا میں سنبھل کے بیٹھ
ماریگی دم میں صبح ترے تاجِ زر پہ ہاتھ

چھوڑا نہ دل میں صبر نہ آرام نے شکیب
تیری نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

قاتل ہے کیا ستم کہ اُٹھاتا نہیں کوئی
آ کر مزارِ کشتۂ تیغِ نظر پہ ہاتھ

اے ذوق میں تو بیٹھ گیا دل کو تھام کر
اس ناز سے کھڑے تھے وہ رکھے کمر پہ ہاتھ

روز آفتیں نئی ہیں دلِ پُرمحن کے ساتھ
اک زخم تازہ رونہ ہے زخم کہن کے ساتھ

ہوش و خرد گئے نگہ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

ہے اُن کا سادہ پن بھی تو کس بھبن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

یاد آگیا ترا قد رعنا جو باغ میں
کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

وحشی کو ہم نے دیکھا اُس آہو نگاہ کے
جنگل میں پھر رہا تھا قلانچیں ہرن کے ساتھ

دست جنوں نہ دے تجھے ناخن خدا کہ تو
ٹکڑے اڑا دے تن کے مرے پیرہن کے ساتھ

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

پایا درا اثر نہ کہیں شب کو آہ نے
سر مارتی پھری ہے سپہر کہن کے ساتھ

بزم صنم میں حضرتِ دل ذکر کعبہ کیا؟
تھی جس چمن کی بات گئی اس چمن کے ساتھ

ان ناتوانیوں میں بھی یا ننگ ہے شوق دل
گویا چمن میں اُڑ کے نسیم چمن کے ساتھ

دوزخ میں بھی پڑیں تو نہ سیدھے ہوں کج سرشت
آتش میں پیچ و خم ہیں رسن کے رسن کے ساتھ

گندم ہے سینہ چاک فراق بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہو گی محبّت وطن کے ساتھ

لب پر ترے پسینہ کی بوند اے عقیق لب
چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ

وحشت تو دیکھو بعد فنا بھی مرا غبار
باتیں کرے ہے سقف سپہر کہن کے ساتھ

دل وہ بلا ہے اژدرِ دوزخ کو کھینچ لے
مارے اگر کمند دم شعلہ زن کے ساتھ

چشم و دہانِ حرص سیئے کون غیر مرگ
بخیہ کا تار اُن کے ہے تار کفن کے ساتھ

آخر چمن سے نکہت گل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں اُلفت وطن کے ساتھ

ہوں زلف عنبریں کا جو کشتہ تو کیا ہوا
لکھدو کفن سیاہی مشک ختن کے ساتھ

منظور تجھ کو کب ہے یہ اے میرے آفتاب
ہو کوئی تیرہ بخت ترا سایہ بن کے ساتھ

داغِ دل فسردہ پہ پھایا نہ ہو نہ ہو
کام اس چراغ مردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

جلد آ کہ مرنہ جائے کوئی خانماں خراب | ٹکرا کے اپنا سر در بیت الحزن کے ساتھ

مشکل ہے ذوق دام علائق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو ہے علاقہ بدن کے ساتھ

جنوں کے جب دسی پر ہیں خوب چلتے ہاتھ | سلوک سینہ سے بھی کچھ تو کر لے چلتے ہاتھ
ملا جو غیر نے عطر اس کو واں تو یاں میری | لکیریں مٹ گئیں ہاتھوں کی ملتے ملتے ہاتھ
نہ آیا گور پہ میری وہ بے وفا ورنہ | گلے لگانے کو تربت سے بھی نکلتے ہاتھ
جو چھیڑے برق کو یہ تفتہ جاں تو کہتی ہے | کہ دیکھو مجکو لگانا نہ جلتے جلتے ہاتھ
اُٹھائے وجد میں جب ہاتھ ہمنے عالم سے | تو پہنچے عرش فلک کو دنے اُچھلتے ہاتھ
مریض سوز محبت کی دیکھتا گر نبض | تو پھر طبیب کے بھی آبلوں سے پھلتے ہاتھ

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوق
نہ اب ہیں پاوں سنبھلتے نہیں سنبھلتے ہاتھ

رقعہ ہے چوری کا اور بھیجا ہے انجان کے ہاتھ | یا الٰہی کہیں پڑ جائے نہ دربان کے ہاتھ

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ | ایمان کی کہینگے ایمان ہے تو سب کچھ

لے نگاہ مہر سے دل مست بچشم قہر دیکھ | گر دُئے سے جو مرے تو دے نہ اُسکو زہر دیکھ

کرد عا میرے لئے شیخ مناجات میں یہ | کہ خراب اور زیادہ ہو خرابات میں یہ

نگہ وہ ترک کہ جس کی نہیں جفا کی پناہ | اور اس کی آنکھ وہ کافر کہ بس خدا کی پناہ

زیادہ ہوگا توکّل سے بھی کہیں روزہ | کہ اس میں آیا تو روزی ہے اور نہیں روزہ

یاے تحتانی

بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی۔ ۶ والے شعر کو دیکھو۔ وارستگان جمع ہے اور بے اضافہ۔ بے صفۃ باندھ دیا ہے جب وقت کا محاورہ یہی تھا۔ اور آخر میں ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

ہیں ترے رشکِ خطِ رخسار سے
دل میں آئینہ کے جوہر خار سے

شرح فرطِ حسرت دیدار سے
جو نگہ ہے کم نہیں طومار سے

کھائے داغِ آتشیں رخسار سے
کم نہیں دل مرغِ آتش خوار سے

ہاتھ اُٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

اُنس ہے کیا دل کو تیر یار سے
ہے مشابہ زخم بھی سوفار سے

میرے طرزِ نالہ ہائے زار سے
ٹپکے بلبل کے لہو منقار سے

یوں نگہ نکلے ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمّار سے

فرشِ گل پر مجھ کو ہجر یار سے
کم نہیں تارِ رگ گل خار سے

آئینہ اُس شعلۂ رخسار سے
گرم ہے دُکان آتش کار سے

بے نصیبا سکے ہیں گر دیدار سے
سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

مارے گر سیلی وہ زلفِ پُرعرق
جھڑ پڑیں دنداں دہانِ مار سے

خنجرِ موجِ تبسم سے ترے
گل چمن میں ہیں جگر افگار سے

وائے قسمت تلخکامی ہو نصیب
ہم کو اُس کے لعل شکر بار سے

کرتا ہے دستِ جنوں جب کشمکش
جی اُلجھتا ہے نفس کے تار سے

سُن کے میری جانکنی کو کوہکن
جوں صدا اُلٹا پھرے کہسار سے

یہ بھی اُس نازک بدن کو بار ہو
گر کمر باندھے نظر کے تار سے

نقطۂ خال اُس کا سودا خیز ہے
پھرتے ہیں اک پاؤں ہم پرکار سے

اُٹھ چکا وہ ناتواں جب رہ گیا — دب کے تیرے سایۂ دیوار سے
توبہ توبہ کہتا استغفار ہے — وقت توبہ میری استغفار سے
اپنے دامن کو بچا کر جائیو — برق میرے وادیٔ پر خار سے
چاہئے بحرِ محبت میں ہمیں — کشتی اُس کی تیغ لنگردار سے
اب وہ آئے جب نگہ کو ضعف ہے — کم نہیں مژگاں کی صف دیوار سے
تیرے ہی پاؤں پہ آئے قاتل گرا — سر مرا اُڑ کر تری تلوار سے
اُس دہن کا نکتۂ موزوں بھی ایک — منتخب ہے مخزنِ اسرار سے
ابر ہے لیکن شفق آلودہ ہے — زلف اُسکی سُرخیٔ رخسار سے
خاک عاشق پر اُٹھے جائے غبار — فتنۂ محشر تری رفتار سے
۴ ناکسوں سے کیا رکیں وارستگاں — اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے
زُلف کی قینچی سے دل ڈرتا نہیں — بھوت بھاگے ہے وگرنہ مار سے
ق دل کے آئینہ کو گر کردے گداز — یار اپنی گرمیٔ رخسار سے
جوہر اُس سے یوں اُٹھالیں جس طرح — حرف قرطاس غلط بردار سے
بے تمیزوں کی ہے الفت نقص نام — لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

دل کو ہر دم عالم معنی سے ذوق
ہے خبر آتی نفس کے تار سے

دو برس ہوئے تھے کہ بہادر شاہ بادشاہ ہوئے تھے۔ اُدھر سے فرمائش زور پر۔ اور ادھر سے طبیعت شور پر۔ کہ شرفائے دہلی میں سے ایک شخص نے مشاعرہ کیا۔ سخن فہم و سخن شناس تھے۔ اہل سخن سے ارتباط رکھتے تھے۔ بڑے اشتہار و اعلام سے شہرت دی۔ اُستاد کے پاس آئے اور باصرار آنے کا اقرار لیا۔ (میاں صابر بخش کی سرا کے پاس ان کا مکان تھا وہیں مشاعرہ ہوا تھا)، اُستاد مع رفقا کے تشریف لے گئے۔ ہم بچے تھے۔ ایسے جلسوں میں جانے کے قابل نہ تھے۔

غالب آئے تو سلام و کلام ہوتے ہی بولے۔ اُستاد! آج تو جی چاہتا ہے آپ کو کچھ سُنایئے۔ اُستاد لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کے بادشاہ تھے۔ اور کم سخنی اس بڑھی ہوئی۔ اُن سے عمر میں بھی بڑے تھے اتنا کہا۔ خوب! بہت خوب!!

غرض مشاعرہ شروع ہوا۔ اور شمع گردش میں آئی۔ لطیفہ یہ ہوا کہ حکیم آغا جان عیش طبابت کا شغل رکھتے تھے۔ مگر خوش کلام اور شیریں سخن۔ شوخ طبع شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی غزل میں قطع پڑھا۔ (روئے سخن غالب مرحوم کی طرف تھا):-

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے زبانِ میر سمجھے۔ اور کلام میرزا سمجھے	مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ابھی اُستاد تک شمع نہ آئی تھی کہ حضور کا خواص[1] پہنچا۔ کہا حضور نے دعا فرمائی ہے یہ غزل دی ہے۔ اور فرمایا ہے۔ اسے ہمارے پاس آکر بنا دو۔ کچھ ہم زبانی بھی کہیں گے۔ اُستاد نے میر مشاعرہ کو پاس بلایا۔ اور حال سُنایا۔ اُنھوں نے کہا۔ آپ کی غزل نہ ہوئی تو مشاعرہ ہو چکا۔ آپ پڑھ کر جایئے۔ غرض جو غزل پیش تھی ختم ہوئی میر مشاعرہ نے اُستاد کے ایما سے خاص خاص اشخاص سے کہہ بھی دیا۔ اور شمع سامنے لاکر رکھدی کہ آپ غزل پڑھیے۔ اُستاد نے غزل پڑھی بڑی تعریفیں ہوئیں۔ یہ اُدھر رخصت ہو کر حضور میں گئے ادھر مشاعرہ برہم ہو گیا۔ ہر شخص یہ کہکر اُٹھ گیا جو سُنّا تھا سُن لیا اب چلو اور سو رہو۔ مگر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ میاں یہ تو ایک فقرہ تھا۔ وزن شعر کے لئے! بلانا کہاں تھا۔ اور جانا کہاں تھا؟

اتفاق تقدیر دیکھو کہ مشاعرہ کو سالہا سال گذر گئے۔ دلی تباہ ہو گئی اب ۱۸۸۲ء میں مجھے کار سرکار کے لئے راولپنڈی میں جاکر کئی مہینے رہنا ہوا۔ وہاں میر وصیت علی نام ایک پیر کہن سال سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے دلی کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی

[1] بادشاہی ملازم جو بطور خدمتگار کاروبار کرتے تھے۔ خواص کہلاتے تھے۔ دیکھو! جمع کا صیغہ ہے مگر اراکین دربار کی زبانوں اور دفتر کے کاغذوں میں بمعنے واحد مستعمل تھا۔

اور والد مرحوم سے بھی پڑھا ہوا تھا۔ اُنھیں جب وہاں میرا حال معلوم ہوا۔ تو بل کر بہت خوش ہوئے۔ اکثر آتے تھے۔ اور وقتوں کے حال کہانیوں کی طرح سُناتے تھے میں کسی حال میں ہوں کام سے کام تھا۔ اس مشاعرہ کا بھی ذکر آیا۔ انھوں نے ماجرائے مذکور من و عن بیان کیا۔ اور کہا کہ بھئی تمھارے والد مرحوم کے سبب سے ہم بھی ہمراہیوں میں تھے۔ حضور کا طلب فرمانا۔ اور اُستاد کا جانا واقعی سبب تھا اور اہل حسد نے اُس وقت کہا بھی تھا۔ مگر نہیں! بدگمانی تھی ہمیں خوب معلوم ہے ہم تو اہل راز میں تھے۔ اس وقت مجھے پھر تحقیق ہوا۔ کہ لوگ ان کی سیدھی بات کو بھی اُلٹا سمجھتے تھے۔ اور اُلٹا دکھاتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ وَارْحَمْ غزل مذکور یہ ہے :-

ترے کوچہ کو وہ بیمار غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیر قضا۔ اس کو پر تیر قضا سمجھے

غلط فہمی ہماری تھی جوان کو آشنا سمجھے
ہم انکو دیکھو کیا سمجھے تھے اور وہ ہم کو کیا سمجھے

شہیدان محبت خوب آئین وفا سمجھے
بہا خوں کوئے قاتل میں اسی کو خوں بہا سمجھے

وہی کچھ تلخکام اس زندگانی کا مزا سمجھے
کہ جو زہراب تیغ یار کو آب بقا سمجھے

ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے
فلک کو ہم کسی کافر کی چشم سرمہ سا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے۔ جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت سے خدا سمجھے

بُرائی میں ہماری گر وہ اپنا کچھ بھلا سمجھے
بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے

تجھے اے سنگدل آرام جان مبتلا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

وہ ہم سے خاکساروں کو گر اپنا خاک پا سمجھے
ہم اپنی خاکساری اپنے حق میں کیمیا سمجھے

جو کچھ دل پر گذرتی ہے سنائینگے ہم اس بت کو
خدا جانے کہیں کیا ہم وہ اپنے دل میں کیا سمجھے

ترے کشتے جو یوں خواب عدم سے یک بیک چونکے
مگر شور قیامت کو تری آواز پا سمجھے

نسیم صبح گلشن میں اگر ہو وے دم عیسے
ترا بیمار غم تجھ بن سموم جانگزا سمجھے

کہو بلبل سے چلتا کارواں ہے نگہتِ گل کا
چمن بادِ صبا سے سمجھے کہ آوازِ درا سمجھے

نگاہِ لطف اُن کی جب نہ باز آئی تغافل سے
ہم اُس کی نارسائی اپنا بختِ نارسا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

اگر دل کو نکالا چیر کر پیکاں تو رہنے دو
کہ عاشق اپنے پہلو میں اُسی کو دل کی جا سمجھے

کرے آہِ رسا میری جو سیرِ عالمِ بالا
تو سینہ کو فلک کے آبلہ سا زیرِ پا سمجھے

حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے
تمھیں سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

ہنسے ہے زخمِ دل تدبیر پہ جرّاح کی کہہ دو
انھیں ٹانکے نہ سمجھے خندۂ دنداں نما سمجھے

ہوا جب گرمیٔ الفت سے موم اُس دلشکن کا دل
تو اُسکے دل شکستہ اپنے حق میں مومیا سمجھے

عدو[1] آیا ہے بن کر نامہ بر لکھا نصیبوں کا
کریں گے لے کے خط کیا مدعی ہے مدّعا سمجھے

مجھے آتا ہے رشک اُس رندِ مے آشام پر ساقی!
نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے

نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا
مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے

خبر سنتے ہی قاصد سے ہوئے ہم بے خبر بالکل
ترے پیغام کو گویا کہ پیغامِ قضا سمجھے

نحوست بھی سعادت ہو گئی سودے میں لفظوں کے
گلیمِ تیرہ بختی سر پہ ہم ظلِ ہما سمجھے

کشادِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا
خرد کے تیز ناخن ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

بلا اُس زلف کے مصرع میں ہے مضمون پیچیدہ
اُسی سے یہ کھلے جو معنے ناز و ادا سمجھے

ہوا نے زلف کو چھیڑا۔ اور اپنا دم اُلجھتا ہے
کہیں ایسا نہ ہووے ہم سے وہ کافر ادا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اُسکی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

بجھاتا گریہ ہے گر سوزِ دل کو آب تو دے
اور آگ ہیں یونہی دینا ہے گر عذاب تو دے

[1] جب اس شعر پر پہنچے تو غالب مرحوم سے کہا۔ مرزا صاحب! یہ آپ کے مذاق کا شعر ہے۔ وہ بھی خوش ہوئے اور تعریف کی۔

الٰہی چشم کے چشمہ کو اتنا آب تو دے
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے

کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچۂ نرگس
ذرا دکھا اسے تو چشم نیمخواب تو دے

دل برشتہ کو میرے نہ چھوڑ اے میخوار
جو لذت اس میں ہے ایسا مزا شراب تو دے

کہاں کبھی ہے یہ خاک میری آتش دل
کہو ہوا سے ہلا دامنِ سحاب تو دے

ہمارے مطلع ابرو پہ خال کہتا ہے
کہ ایسا نقطہ کوئی وقت انتخاب تو دے

درِ قبول ہے وہاں نہ بند کر دربار
دعائے خیر ذرا ہونے مستجاب تو دے

صبا! بگولہ بنے کشتگان زلف کی خاک
کہ بعد مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا
ذرا ٹھہرنے یہ تیغ اضطراب تو دے

بلا سے آپ نہ آئیں پر آدمی اُن کا
تسلی آکے مجھے وقت اضطراب تو دے

شکار بستۂ فتراک کو ترے مقدور
ہوا نہ یہ بھی کہ بوسہ سر رکاب تو دے

نشہ میں ہوش کسے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہوں بوسے بلا حساب تو دے

زبان خنجر قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دل شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے

جواب نامہ نہیں گر تو رکھ دو نامۂ یار
جو پوچھیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے

ہماری آنکھ سے ہم چشم ہوگا کیا دریا
کسی کو بھر کے ذرا کاسۂ حباب تو دے

بلا سے کم نہ ہو گریہ سے میرا سوز جگر
بجھا پر اُن کی ذرا آتش عتاب تو دے

خنک دلوں کی اگر مشت خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی اک بار آگ داب تو دے

کریگا قتل وہ اے ذوق تجھ کو سرمہ سے
نگہ کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

پہنچ رہونگا سر منزل فنا اے ذوق
مثالِ نقش قدم کرنے پا تراب تو دے

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو
تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہے

جز زلف سُوجھتا نہیں اے مرغ دل تجھے
دولت کی رکھ نہ مار سرِ گنج سے اُمید
عنقا نشاں چھپا کے ہے بیٹھا برلئے نام

خفاش تو نہیں ہے کہ ظلمت پرست ہے
موذی وہ دیگا کیا کہ جو دولت پرست ہے
گم گشتہ کون کہتا ہے شہرت پرست ہے

یہ ذوق مے پرست ہے یا ہے صنم پرست
کچھ ہے بلا سے ۔ لیک محبت پرست ہے

زخم دل پر میرے کیوں مرہم کا استعمال ہے
قبر میں عاشق جو تیرا مضطرب احوال ہے
عشق کو گر امتحاں پر میرے قصد فال ہے
اب تو جاں ناتواں کا ضعف سے یہ حال ہے
ہم نے جانا تھا کفِ پا میں تمھارے خال ہے
ابر برسوں روچکا پر سوز غم سے اب تلک
میرے دودِ آہ سے یا نتک زمانہ ہے سیاہ
میں وہ مجنوں ہوں کہ میرا کاغذ تصویر بھی
جب سے ہے دل میں کسی کی نوک مژگاں کا خیال
جوش گریہ کا مرے تم کچھ نہ پوچھو ماجرا
دل یہ ہوں گر داغِ سوزاں عشق میں اے گلبدن
کھاؤں میں بیڑا جو اُس بن کیونکہ دل ٹکڑے نہو
ہیں جہاں مدفن تمھارے کشتگان زُلف کے
شوخیٔ قاتل کرے آلودہ کیوں منہ پان سے
فندقوں سے کس کی دل خوں تھا کہ میری خاک پَے
اُس کی ٹھوکر کا ہوں دیوانہ کہ جس کے پاؤں میں
آئے وہ شاید عیادت کو کہ باصد ضعف حال

مشک اگر مہنگا ہے تو کیا نون کا بھی کال ہے
لوح بالیں پر بھی لکھا سورۂ زلزال ہے
جوشِ داغِ دل ہجومِ نقطۂ رمال ہے
لب تلک بھی اس کو آجانا رہ صد سال ہے
لیکن اب دیکھا سویدائے دل پامال ہے
خاک میرے ڈھیر کی اُٹھتی ہیں جیسے رال ہے
آفتابِ آسماں زنگی کے مُنہ کا خال ہے
مثل عیدی باعثِ خوشنودیٔ اطفال ہے
نشترِ زنبور ہے تن پر مرے جو بال ہے
چادرِ آب رواں منہ پر مرے رومال ہے
پھر تو خسرو کا بھی گنج سوختہ کیا مال ہے
جو رگِ پاں ہے وہ مجھ کو شیر کا سا بال ہے
نخل کی جا بید مجنوں ہے وہاں یا جال ہے
خون اعجازِ مسیحا سے لب اُس کا لال ہے
نوک برگ سبزہ جوں منقارِ طوطی لال ہے
گردشِ رنگ پری سے حلقۂ خلخال ہے
آئی مژگاں پر نظر بھی بہر استقبال ہے

نہ وہ واں جھڑتے ہیں اور یاں ہجوم اشک ہے۔

وادیٔ وحشت میں بھی جا کر نہ دل اپنا کھلا
پنجۂ مژگان آہو شیر کا چنگال ہے

دل میں شکلِ یار کب آئے نظر بے اضطراب
دیکھ لو سیماب بن آئینہ بے تمثال ہے

بسکہ ہے نور روز اپنا آفتاب بادہ سے
دور ساغر ہمکو ساقی گردش یک سال ہے

پوچھتے کیا ہو شکست دل کو صورت دیکھ لو
نامہ ہے چین بر جبیں۔ قاصد شکستہ حال ہے

بار عشق اُس گل کا سر پر رکھ لیا جو ہو سو ہو
اب کسے پروا ہے سوسن ہے کہ اک مثقال ہے

غم نہیں صیاد کو ورنہ مری فریاد سے
ہے قفس تو سینہ چاک اور دل مشبک جال ہے

کھل گیا مضمون شکستِ دل کا بے خط کے کھلے
نامہ بر کا اسقدر اپنے شکستہ حال ہے

ہے اسیرانِ محبت کی بلا سینہ میں آگ
شعلۂ جوالہ ساں طوقِ گلو تک لال ہے

ہوتے ہیں اعضائے بوسیدہ تصور سے جدا
کھینچی تصویر مجنوں کی ترے اشکال ہے

روز محشر سے کئی دن دیکھنے کو چاہئیں
گر یہی اے ذوق طول نامۂ اعمال ہے

فرماتے تھے کہ جوانی کا عالم تھا اور طبیعت میں جوش۔ وہی دن تھے کہ مدرسۂ غازی الدین خاں کے وسیع کوٹھے پر مشاعرے ہوتے تھے۔ نواب امیر خاں سرکار انگریز سے عہد نامہ کے لئے دہلی میں آئے۔ شہر کے لوگ دیکھنے کو دوڑے کہ باہر پنڈارے کا لشکر پڑا ہے۔ ہم بھی مدرسہ میں گئے۔ ہمارے والد وہیں تھے۔ کوٹھے پر جا بیٹھے۔ دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ ہم نے حسب حال یہ غزل کہی۔ کئی دن کے بعد مشاعرہ ہوا۔ لشکر کے لوگ مسجد مدرسہ میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ انھیں بھی مشاعرہ کی خبر ہوئی کہ رات کو جلسہ ہے۔ سب آئے۔ دوستوں کی فرمائش سے ہم نے یہ غزل بھی پڑھی۔ بیچارے برسوں صحرا نوردی میں تھے۔ اور اسلام کے نام سے ہر کام کرتے تھے۔ اب خط صلح میں آکر اُسے چھوڑنا تھا۔ سب دل شکستہ تھے۔ اکثر اشعار غزل کے اُن کی صورت حال دکھاتے تھے۔ بڑی تعریفیں ہوئیں اور ۵ والے شعر پر تو اللہ اللہ خوب غلغلے اور ولولے ہوئے بات نہ سنائی دیتی تھی:۔

موئے سر ماران سیہ کا ایک سراسر لشکر ہے
مانگ جو ہے اک مار سفید اس لشکر کا سرلشکر ہے
آبلہ ہائے سینہ جو خیمہ سے دکھائی دیتے ہیں
مزرع دل پر میرے پڑا کیا غم کا آکر لشکر ہے
ہووے دل مظلوم ہمارا کیوں نہ شہید دشت بلا
درپے اس کے شامیوں کا وہ زلف معنبر لشکر ہے
دیویں موذی زحمت کش کو کیونکہ نہ ایذا جمع ضعیف
دشمن مار زخم رسیدہ مور کا اکثر لشکر ہے
کعبہ تو بہ خدا ہی رکھے آج۔ کہ جوشِ ابر نہیں
ایک اصحاب الفیل کا سایہ دوش ہوا پر لشکر ہے
ہیں وہ شاہ کشورِ غم ہوں یار جس کے ساتھ سدا
فوجیں اشک کی موجیں ہیں اور بہتا سمندر لشکر ہے
۴ گاہ ہجوم یاس میں ہے دل۔ گاہ ہجوم حسرت میں
ہے یہ مرد سپاہی پیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے
خالِ چشم جاناں کا مژگاں سے تجلی دیکھو تو
اترا سیتی یہ ماہی کی کیا لے کے سکندر لشکر ہے

ہووے امام برحق پیدا ذوق اگر تو دیکھ ابھی
ہوتا گرد اسلامیوں کا جوں سبحہ گوہر لشکر ہے

میری ہی خاکستر اڑی تھی اس سے گردوں سب بنے
دل کو رکھدوں اس دم شمشیر پر گرڈھب بنے
خال اے خورشید رو رخ پر تمھارے کب بنے
کیونکہ تعلیم نیاز و ناز ہو یکجا بہم

آہ میں کچھ اخگر بھی باقی تھے سو وہ کوکب بنے
تا یہ قربانی صراطِ عشق پر مرکب بنے
تیرہ روز آکر افق پر سوختہ کوکب بنے
گر نہ مجنوں آن کر لیلےٰ کا ہم مکتب بنے

غنچۂ تصویر بھی کھل کر جو عقدے وا نہ ہوں
ہائے قسمت وہ ہمارے عقدۂ مطلب بنے

ہے سیہ کاری سے نامہ یاں تلک اپنا سیاہ
روز محشر پر پڑے گر سایہ اس کا شب بنے

سرمۂ چشم کواکب کیوں بنا لے دود آہ
ایسا کاجل بن کہ جس سے اُسکا خال لب بنے

صحبتِ عیسےٰ بنائیں کیا گدھے کو آدمی
جس کے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب بنے

موذیوں کو حق نہ دے آنکھیں کہ تا لاویں بلا
عین حکمت تھی کہ معدوم البصر عقرب بنے

عشق ہے اے ذوق وہ کافر کہ جسکے ہاتھ سے
شیخ صنعا سا مسلماں رند بد مشرب بنے

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

تم چشم سرمگیں کو جو اپنی دکھا چلے
بیٹھے بٹھائے خاک میں ہم کو ملا چلے

دیوانہ آ کے اور بھی دل کو بنا چلے
اک دم تو ٹھیرو اور کہ کیا آئے کیا چلے

ہم لطف سیر باغ جہاں خاک اُڑا چلے
شوقِ وصال دل میں لئے یار کا چلے

غیروں کے ساتھ چھوڑ کے تم نقش پا چلے
کیا خوب پھول گور پہ میری چڑھا چلے

دکھلا کے مجھکو نرگس بیمار کیا چلے
آوارہ مثل آہوئے صحرا بنا چلے

اے غم! مجھے تمام شب ہجر میں نہ کھا
رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے

بل بے غرور حسن زمیں پر نہ رکھے پاؤں
مانند آفتاب وہ بے نقش پا چلے

کیا لے چلے گلی سے تری ہم۔ کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اُڑانے اُڑا چلے

افسوس ہے کہ سایۂ مرغ ہوا کی طرح
ہم جس کے ساتھ ساتھ چلے وہ جدا چلے

قاتل جو تیرے دل میں رکاوٹ نہ ہو۔ تو کیوں
رُک رُک کے میرے حلق پہ خنجر ترا چلے

ہے گل کا دل تو سنبل پیچاں کے دام میں
کیا اُڑ کے تجھ سے طائرِ نکہت بھلا چلے

ہو کر سوار توسن عمر رواں پہ آہ
ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے

لبریز ہو گیا مرا شاید کہ جامِ عمر
تم وقتِ نزع مجھ سے جو ہو کر خفا چلے

سلجھائیں زلفیں کیا لب دریا پہ آپ نے
ہر موج مثل مار سیہ تم بنا چلے

دُنیا میں جب سے آئے رہا عشق گل رخاں
قاتل سے دخل کیا ہے کہ جا تیر ہوا اپنا ہوش
فکر قناعت اُن کو میسر ہوئی کہاں
آلودہ سرمہ سے نہ ہوئی چشم میں نگاہ
کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
لے جائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر
اُس روئے آتشیں کے تصوّر میں یا وزلف

ہم اس جہاں میں مثل صبا خاک اُڑا چلے
گھر اُڑ کے مثل طائر رنگ حنا چلے
دُنیا سے دل میں لے کے جو حرص و ہوا چلے
دیکھا جہاں سے صاف ہی اہل صفا چلے
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے
ہے کیا غضب کہ آگ سے لگے اور ہوا چلے

اے ذوق ہے غضب نگہ یار الحفیظ
وہ کیا بچے کہ جس پہ یہ تیر قضا چلے

اُستاد کا قاعدہ تھا کہ وضو کے بعد ایک لوٹے پانی سے برابر کلیاں کرتے تھے۔ بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ تو ہنسی آتی تھی۔ جب بڑا ہوا تو ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ فرمایا۔ دیکھتے ہو زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے؟ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کیا۔ اور یہ مطلع پڑھا۔ میں نے لکھ لیا۔ اُس دن تو مطلع ہی طلوع ہوا پھر غزل ہو گئی۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے
جب بنی تیر حوادث کی کماں افلاک سے
جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغ اسیر
تیرے صید نیم جاں کی جان نکلے کس طرح
بیٹھا دوزخ میں بہاریں خلد کی دیکھا کروں
آفتاب حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم
چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
بیت ساقی نامہ کی لکھ کوئی جائے دُعا
عیب ذاتی کو چھپائے گا نہ حسن عارضی

کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے
خاک آلودہ بنا انساں کی مشت خاک سے
جھانکتا ہے دل تجھے یوں سینۂ صد چاک سے
یہ تو وابستہ ہے تیرے دامن فتراک سے
واں کی آتش ہو جو اُن کے روئے آتشناک سے
اشک خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے
کرتا وہ پردہ نشیں پردہ تو ہے ادراک سے
مے پرستوں کے کفن پہ کلک چوب تاک سے
زیب ہد اندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

الگ تا ہو نہ کھینچ کر مرا ہر تار دامن سے
خبر لوں جیب کی یا میں رہوں ہشیار دامن سے
لگی ہے اس تمنا میں مرے ہر خار دامن سے
لگے اس شعلہ خو کے کون مجھ سا زار دامن سے
کرے گرد ھوتے دھوتے تو جدا ہر تار دامن سے
کیا تو نے کنارہ ہم سے اور ہاتھوں سے وحشت کے
بھارسے جلوۂ رُخ کے جو بسمل خاک پر لوٹیں
ہوا بے پردہ وہ پردہ نشیں۔ تو یوں کیا پردہ
وہی زیبا ہے اُسکے واسطے جو قطع ہے اُس پہ
اب ان کوشش جہت میں ہے عنت دریا لوگ کہتے ہیں
مگدر ہو وہ گل کیا کیا جو نادانستہ لگ جاوے
جُدا گر سر ہو تن سے اور جُدا ہوں ہاتھ شانوں سے
ترا مجنون زار اتنا گراں جاں ہے نہ اُٹھنے دے
پھروں کھینچے ہوئے کوسوں میں اپنے زور وحشت میں
جلیں گے آتش رنگِ حنا سے پاسے گھر کتنے
دکھائے صدمۂ زنجیر نے یہ پاؤں مجنوں کے
عزیزا صلا نہیں سرمایہ ہمت کو کہ دریا نے
مربی بھی خلش گر کو نہیں دیتے ہیں آرائش
سرایت کوہکن کا خوں اگر کر جائے پتھر میں
فرشتے تیرے دامن کو بنائیں جا نماز اپنی
مرے پاؤں کے چھالے ہوتے ہیں کیا کیا شکستہ دل
مرا آنسو ہے وہ نہر آب۔ نیلا ہو بدن سارا

نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے
جنوں اُلجھے ہے ناخن جیب سے اور خار دامن سے
کروں نہ ستارہیں گرہ ہو عطا اک تار دامن سے
کہیں اُلجھا ہے ابتک برق کے بھی خار دامن سے
نہ چھوٹے خون میرا تیرے اے خونخوار دامن سے
گریباں ہمکنار آکر ہوا اے یار دامن سے
تو پریاں آ کے پونچھیں اے پری رخسار دامن سے
بنایا درمیاں اک پردۂ دیوار دامن سے
نکل سکتا ہے کوئی آستیں کا کار دامن سے
گرے تھے اشک کے قطرے مرے دو چار دامن سے
ذرا آکر نسیم دامنِ گلزار دامن سے
جُدا ہو پر نہ ہاتھ اپنا ترے اے یار دامن سے
لپٹ جائے اگر صرصر کے مثل خار دامن سے
فلاتم باندھ دیکھو دامن کہسار دامن سے
دکھائیں گے ادا جب گرمیٔ رفتار دامن سے
کہ صدمہ دل پہ ہوتا ہے دم رفتار دامن سے
گرہ ڈیکر نہ باندھا گوہر شہوار دامن سے
گلستاں پونچھتا ہے کب بنانِ خار دامن سے
نکالے لعل ہی پتھر کی جا کہسار دامن سے
اگر دھو ڈالے تو داغ مئے پندار دامن سے
جو کوئی ٹوٹ جاتا ہے اُلجھکر خار دامن سے
خدا نا کردہ لگ جائے گرا ئے غمخوار دامن سے

ترے مجنوں کو ہے وہ جامۂ عریاں تنِ زیبا — کہ جس کو آستیں سے ننگ ہے اور عار دامن سے

یہ تجھ بن اشکباری ہے کہ آنسو پونچھتا ہوں میں — کبھی تو آستیں سے اور کبھی اے یار دامن سے

کہاں وہ موسمِ طفلی کہ جب دامن سوار ہوں میں — بنتے ہم تیار کرتے توسن رہوار دامن سے

مرا وہ گریۂ غم خندۂ عشرت سے بہتر ہو — اگر آنسو مرے پونچھے وہ گل رخسار دامن سے

میں وہ آلودہ دامن ہوں بنائیں تار سبحہ کا — فرشتے پاک دامن لے کے میرے تار دامن سے

یہ صیدِ ناتواں مثل پرِ افتادہ اُڑ جائے — لگا لے گر نسیمِ دامنِ گلزار دامن سے

ہوا پنکھے کی خواب آور ہے پر وہ ایک جنبش میں — کریں سو فتنۂ خوابیدہ کو بیدار دامن سے

نگاہِ بوالہوس آندھی ہے تیرے خاک اُڑانے کو — چھپا لے اے پری رو شعلہ رخسار دامن سے

نہ ہو گی دل جلوں کی ذوق ہمسایوں سے دلداری — کہ کب فانوس پونچھے شمع کا رخسار دامن سے

ہوں یہ لاغر جھک گئے قامت ایک جس کے بوجھ سے — ہے کبادہ جو لچک جائے مگس کے بوجھ سے

تھا قدِ رعنا کبھی پر اب ہوس کے بوجھ سے — جھلملاتا سا ہے شعلہ اک نفس کے بوجھ سے

بدنصیبی سے مری اُس بام پر ٹوٹی کمند — ورنہ میں کیا۔ وہ نہ ٹوٹے مجھ سے دس کے بوجھ سے

شاخِ گل کیا مال ہے گر ہم گراں جانی پہ آئیں — توڑ دے لوہے کے حلقے کو قفس کے بوجھ سے

مت لگا اے عشق دل کے آبلہ پر نقش غم — ٹوٹ جائیگا یہ گنبد اس کلس کے بوجھ سے

سر جھکا لے ہیں وہ آزاد اپنا کب مانند سرو — ہے سبکساری جنھیں بارِ ہوس کے بوجھ سے

یہ اسیری میں گراں خاطر ہوں میں جاتا ہے ٹوٹ — آہنی قلاب بھی میرے قفس کے بوجھ سے

زندہ تو ڈوبے ہے اور تیرے ہے مردہ آب میں — بوجھ شاید جسم کا کم ہے نفس کے بوجھ سے

باندھ دے ناقہ کی گردن میں دلِ نالانِ قیس — لیلی۔ اس کا بوجھ ہلکا ہے جرس کے بوجھ سے

نکلے دُنیا سے کہاں احمق اُٹھا کر بارِ حرص — یہ گدھا تو رہ گیا دلدل میں پھنس کے بوجھ سے

اپنے دامن میں نہ لے میرے گلِ لختِ جگر — جی دھڑکتا ہے کہیں چولی نہ مسکے بوجھ سے

کیا ہوا دل نے لیا گر ایک کوہ غم اُٹھا — یہ نہیں اے ذوق تم بتلا ہیں دس کے بوجھ سے

سر وقتِ ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب۔ اللہ اکبر۔ لوٹنے کی جائے ہے

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

واہ وا شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس مزے سے کھائے ہے

دم کی ہے سینہ میں آکر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھیے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بس کرم سوز دروں۔ بھن جائیں گے دل اور جگر
رحم جوش گریہ۔ چھاتی پھر بھی بھر آئے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی۔ کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

زخمی ہوں ترے ناوک دزدیدہ نظر سے
جانے کا نہیں چور مرے زخم جگر سے

ہم خوب ہیں واقف ترے انداز کمر سے
یہ تار نکلتا ہے کوئی دل کے گہر سے

گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

لبریز مئے صاف سے ہو جام بلوریں
زمزم سے ہے مطلب۔ نہ صفا سے نہ حجر سے

سرمایۂ امید ہے کیا پاس ہمارے
اک آہ ہے سینہ میں سو نومید اثر سے

وہ خلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں
ہیں شاخ ثمردار میں گل پہلے ثمر سے

حاضر ہیں مرے توسن وحشت کے جلو میں
باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

فریاد ستمکش ہے وہ شمشیر کشیدہ
جس کا نہ رکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں جو ہیں بہہ کے چلے ہم بسوئے دوست
مقصود رہ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اللہ رے وحشت کہ مری ٹھوکروں ہی میں
پتھر ہیں پہاڑوں کے اُڑے جاتے شرر سے

کچھ رحمت باری سے نہیں دور کہ ساقی
رو میں جو ذرا مست تو مے ابر سے برسے

کشتہ ہوں میں کس چشم سیہ مست کا یارب
مستی ہے ٹپکتی مری تربت کے شجر سے

کھلتا نہیں دل۔ بند ہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجاتا ہے تو اس میں کدھر سے

نالوں کے اثر سے مرے پھوڑا سا ہے پکتا
کیوں ریم سندا نکلے نہ آہن کے جگر سے

اے ذوق رہ عشق میں ہے خضر و مسیحا
ہمدم جو نکل آئے کوئی گرد سفر سے

آیا نہ وہ مہ طلعت ۔ کیا دیر لگائی ہے
قاصد تو کب آتا ہے ۔ پر پیک اجل نے بھی
آنکھوں میں ہے دم تیرے ۔ بیمار محبت کا
آنا بھی کہیں تیرا ۔ آنا ہے قیامت کا
پروانہ سے کہتی ہے یہ شمع ۔ کہیں جل چک
کس فکر میں ہے ساقی ۔ دے بادہ جو ہے باقی
ہے تیغ بکف قاتل ۔ ہم مرنے پہ جانبازو!
گر قتل ہی کرنا ہے ۔ قاتل کہیں کر جلدی
یاں وعدہ بھی آ پہنچا ۔ تو اب تلک آتا ہے
بے بادہ گلستاں میں ۔ پیتے ہیں لہو میکش
دے پھونک کہیں دل کو ۔ مدت سے سلگتا ہے
بالیں پہ کہا میری ۔ ہنگامۂ محشر نے
اُس کے لب خنجر کا لینا ہے اگر بوسہ

کھینچ اے کشش الفت ۔ کیا دیر لگائی ہے
یاں آئے نہیں یا قسمت ۔ کیا دیر لگائی ہے
دکھلا دے کہیں صورت ۔ کیا دیر لگائی ہے
اے دلبر خوش قامت ۔ کیا دیر لگائی ہے
ہے تجھ میں اگر جرأت ۔ کیا دیر لگائی ہے
تھوڑی ہے یہاں فرصت ۔ کیا دیر لگائی ہے
باندھو کمر ہمت کیا دیر لگائی ہے
لاحول ولا قوت ۔ کیا دیر لگائی ہے
اللہ رے تری غفلت ۔ کیا دیر لگائی ہے
ساقی نے دم عشرت ۔ کیا دیر لگائی ہے
اے سوزِ غم فرقت کیا دیر لگائی ہے
لو اُٹھو کہیں حضرت ۔ کیا دیر لگائی ہے
تو اے دلِ پُرحسرت ۔ کیا دیر لگائی ہے

اے ذوق شہید اسکو ۔ کرتے ہیں کئی عاشق
کرتے ہو اگر سبقت ۔ کیا دیر لگائی ہے

خوب روکا شکایتوں سے مجھے
کیا کہوں کہہ رہیں کیا کیا کچھ
بات قسمت کی ہے کہ لکھتے ہیں
واجب القتل اُس نے ٹھیرایا
حال مہر و وفا کہوں تو کہیں

تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
غیر تیری حمایتوں سے مجھے
خط وہ کن کن کنایتوں سے مجھے
آیتوں سے روایتوں سے مجھے
نہیں شوق ان حکایتوں سے مجھے

ے حاشیہ دیکھو صفحہ ۱۸۷ پر

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
کیوں اشکوں سے کیوں نہ کرنے کمی
کمی گریہ نے جلا دیا دل

دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے
شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے
ہوا نقصاں کفایتوں سے مجھے

لے گئی عشق کی ہدایت ذوق
اُس سرے سب نہایتوں سے مجھے

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے،
کہ آج کوچے میں اُس کے شور بپا بِحَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ہے
غم جدائی میں تیری ظالم۔ کہوں میں کیا۔ مجھ پہ کیا بنی ہے
جگر گدازی ہے۔ سینہ کاوی ہے۔ دلخراشی ہے جانکنی ہے
زمیں پہ نور قمر کے گرنے میں صاف اظہار روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ اُن کی فروتنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا۔ یہ اُس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اُسی کے جلوہ کی روشنی ہے
ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے
ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے۔ ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے۔ نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے
لگا نہ اس بتکدہ میں تو دل۔ یہ ہے طلسم شکست غافل
کہ کیسا ہی کوئی خوش شمائل صنم ہے آخر شکستنی ہے

(حاشیہ صفحہ (۱۸۶) لہ مثنوی مہر و وفا۔ فارسی میں ایک عمدہ مثنوی ہے۔ پہلے زلیخا۔ بوستان۔ سکندر نامہ کی طرح تعلیم میں داخل تھی۔ اب اس کا رواج نہیں رہا۔ یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ کون سمجھتا ہے اب ان اشعار کو۔ خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر۔ وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانند کیمیا گر۔ ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے

کوئی ہے کافر۔ کوئی مسلماں۔ جدا ہر اک کی ہے راہ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے۔ وہ اُسکے نزدیک رہزنی ہے

تکلفِ منزلِ محبت نہ کر۔ چلا چل تو بے تکلف
کہ جا بجا خارزارِ وحشت سے بچھ رہا فرشِ سوزنی ہے

خدنگ مژگاں سے ذوق اسکے دل اپنا سینہ سپر ہے جب سے
مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوار آہنی ہے

آنکھ اُس پُر جفا سے لڑتی ہے
جان کشتی قضا سے لڑتی ہے

شعلہ بھڑکے گا کیا بھلا سر بزم
شمع تجھ بن ہوا سے لڑتی ہے

قسمت اُس بت سے جا لڑی اپنی
دیکھو احمق خدا سے لڑتی ہے

صفِ مژگاں تری خدا کی پناہ
اک بلا اک بلا سے لڑتی ہے

شور قلقل یہ کیوں ہے۔ دخترِ رز
کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے

نگہ ناز اُس کی عاشق سے
چھوٹ کس کس ادا سے لڑتی ہے

تیرے بیمار کے سرِ بالیں
موت کیا کیا شفا سے لڑتی ہے

آج کہتے ہو کیا طبیعت کو
عشق میں ابتدا سے لڑتی ہے

زالِ دنیا نے صلح کی کس دن
یہ لڑاکا سدا سے لڑتی ہے

تیری شمشیر خوں کی چھینٹوں سے
چھینٹے آبِ بقا سے لڑتی ہے

دیکھو اس چشم مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

ذوق دنیا ہے مکر کا میداں
نگہ اس کی دغا سے لڑتی ہے

دل کی معاش غم۔ اسے غم کی تلاش ہے
ڈرتا ہوں دل سے میں یہ بڑا بد معاش ہے

اس بتکدہ میں کون ہے کافر ترے سوا
تو بت پرست بت بھی ہے اور بت تراش ہے

ہوتی وہاں دوش نہیں عاشقوں کی خاک
اُڑ جاتی ٹھوکروں میں تری اُن کی لاش ہے

لبریز صد نشاط ہے مثلِ ہلالِ عید
سینہ میں وہ جو ناخنِ غم کی خراش ہے

کرلے یہ اشک و آہ میں تکلیف کیوں عبث
ہوجانا رازِ دل تو نگاہوں میں فاش ہے

دنبالہ پر جو سرمہ کے دانہ ہے خال کا
دیکھو! وہ دستِ چشمِ فسونگر میں ماش ہے

کیا شاد کو خفیف ہے کرتی زبانِ خلق
شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے

دُنیا سے بھی اُٹھے تو نہ بستر سے اُٹھ سکے
تیرا مریضِ عشق جو صاحب فراش ہے

ہے کس مزے سے عشق میں اپنی ہوئی بسر
افسوس لب پہ ہے۔ نہ کبھی دل میں کاوش ہے

پُرسش میں اب تو خنجرِ خمدار سے بھی تیز
اس شوخ کج ادا نے نکالی تراش ہے

مسکن پذیر آج سے دل میں نہیں ہے غم
روزِ ازل سے اس کی یہیں بود و باش ہے

اے ذوق جانتا ہے وہ ہمدرد میرا درد
دل جس کا پارہ پارہ جگر پاش پاش ہے

ہے بن ترے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پہ لگی ہوئی
اک پھانس ہے کلیجہ کے اندر لگی ہوئی

چاٹے بغیر خوں کوئی رہتی ہے تیری تیغ
بے ڈھب ہے اسکو چاٹ ستمگر لگی ہوئی

بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خُمِ مے کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مہر ہے مُنہ پر لگی ہوئی

میت کو غسل دیجو نہ اس خاکسار کی
ہے تن کو خاک کوچۂ دلبر لگی ہوئی

عیسےٰ بھی پاس ہے۔ نہیں ممکن مگر شفا
خورشید کو وہ تپ ہے فلک پر لگی ہوئی

میرا گُلِ اُمید شگفتہ ہو کس طرح
دل کی گرہ ہے اس کی گرہ پر لگی ہوئی

گل مہدھی کیوں نہ باغ میں ہو پامالِ رشک
پاؤں میں تیرے دیکھے حنا گر لگی ہوئی

کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع معتبر لگی ہوئی

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

مُنہ سے لگا ہوا ہے اگر جامِ مے تو کیا
ہے دل سے یادِ ساقیٔ کوثر لگی ہوئی

اے ذوق اتنا دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چُھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مجھ سے کچھ پوچھ نہ خونابۂ حسرت کے مزے
زہر کے گھونٹ ہیں پر رکھتے ہیں شربت کے مزے

تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلی وہ اُلفت کے مزے
بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

بے مبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

کھائے کوچہ میں ترے آکے جو سنگِ طفلاں
آئے مجنوں کو ترے میوۂ جنّت کے مزے

لگتی مرچیں سی کبابوں کو ہیں سُنکر کیا کیا
دل بریاں سے مرے سوزِ محبّت کے مزے

صرفِ ہر زخمِ جگر تا نہ ہو صد کانِ نمک
لُوٹے کیا عشق میں اس کانِ ملاحت کے مزے

ملّتِ عشق میں ہو۔ کاش تناسخ ہی سہی
کہ اڑائیں ترے سربازِ شہادت کے مزے

دیکھکر اس کو گیا عالمِ حیرت میں تو میں
پر بیاں کیا کروں اُس عالمِ حیرت کے مزے

سجدہ میں پائے خُمِ مے پہ ہیں کس لطف سے مست
یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

پھول گلشن میں ہنسے کر کے زر اپنا برباد
کہ اُڑا لے ہی میں دولت کے ہیں دولت کے مزے

جانِ شیریں بھی گئی اور نہ ملی شیریں بھی
پوچھو فرہاد سے اس تلخیٔ حسرت کے مزے

ابر و باراں کے مزے کیونکہ نہ لُوٹیں میخوار
کہ اُڑا لیتے ہیں گنہگار ہی رحمت کے مزے

ہے نمک پاش جو ہنس ہنس کے وہ لعلِ نمکیں
لے رہا ہے دلِ مجروح جراحت کے مزے

کچھ جتاؤں جو محبت تو ہے کہتا کہ تجھے
دیکھ تو کیسے چکھاتا ہوں محبت کے مزے

ذائقہ چاشنیٔ عشق کا کامل ہو تو دیں
شادیٔ وصل کی لذّت غمِ فرقت کے مزے

نہیں جز بے مزگی کوئی مزا دنیا میں
پر مزیدار بنا دیتے ہیں غفلت کے مزے

خنجرِ ناز نے کیا چاٹ لگائی دل کو
چاٹتا ہونٹ ہے لے لے کے جراحت کے مزے

بے مزہ جی کو کریں لاکھ ترے ظلم و ستم
پر نہیں بھولتے وہ پہلی عنایت کے مزے

پھر پھٹا زخم کا انگور مبارک اے ذوق
دلِ زخمی کو ترے بادۂ حسرت کے مزے

کب وہ گذرتے ہیں سرِ لاف و گزاف سے
جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کاف سے

ادل ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں یہ ناف سے

چل میکدہ میں شیخ بسر کر مہِ صیام
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے

نالوں نے دی چڑھا جو تپ لرزہ مہر کو
کھولی نہ آنکھ ابرِ سیہ کے لحاف سے

پھینکے ہے ایک جنبشِ مژگاں میں وہ پری
اس اپنے ناتواں کو پرے کوہِ قاف سے

ہو جو ہر کمال پہ ننگا جو خاکسار
اک تیغ ہے کہ تنگ ہے اسکو غلاف سے

گذری ہے مشقِ سینہ شگافی میں اے قلم
عاشق کی عمر نالۂ گردوں شگاف سے

گردش ہے اس کی چشم کی کیوں میرے دل کے گرد
کافر کو کام کعبہ کے ہے کیا طواف سے

لڑتے ہیں گہ نصیب سے گاہ ہے فلک سے ہم
فرقت کی رات کم نہیں روزِ مصاف سے

طوقِ سیاہ جنیۂ لیلےٰ ہوا نصیب
مجنوں سمجھیو کعبہ کے بہتر طواف سے

جوں تیغ خوش غلاف نگہ تیری اے پری
ہے دمبدم نکل کے چمکتی غلاف سے

لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدتِ وجود
لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

۱۸۵۰ء میں مرزا خدا بخش شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ کیا۔ اور دو مصرع طرح کئے۔

(۱) ع — کیا کیا مصیبتیں ہیں دلِ پُر محن کے ساتھ

دوسرا۔ ع

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

اُستاد نے دونوں طرحوں میں غزلیں لکھی تھیں۔ اور مشاعرہ میں بھی گئے تھے۔ غزل مرقوم الذیل کہہ رہے تھے کہ ایک دوست آئے۔ اور کہا کہ اس میں تو ساری غزل بے محاورہ ہو گئی۔ اس طرح میں نہ کہیئے۔ میں نے کہا بے محاورہ ہماری غزل نہ ہو گی۔ کہوانے والے بے محاورہ ہیں۔ ایسی طرح کہا سمجھ کر رکھی۔ اُستاد مرحوم نے تامل کر کے فرمایا

نہ کہیں؟ میں نے کہا حضرت ضرور کہنی چاہیئے۔ لوگ ہمیں کہیں گے کہ انھیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا۔ استاد کا ارادہ پھر مستقل ہو گیا۔ اور غزل تمام کی:۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندہ ہیں محبت والے

چاہیں گر چارہ جراحت کا محبت والے
بیچیں الماس و نمک سنگ جراحت والے

گئے جنت میں اگر سوز محبت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنت والے

سا قیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اُٹھیں نہ ترے متوالے

رہے مجوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونو
کبھی مل بھی سے گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لب جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزار محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہائے رے حسرت دیدار مری ہائے کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے

نہیں جز شمع مجاور مرے بالین مزار
نہیں جز کثرت پروانہ زیارت والے

نہ ستم کی ہے شکایت۔ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے کہ مثل مہ نو دے کے فروغ
خود نمائی کو ہیں چمکا رہے شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھسے ہے کچھ دل کہتا
دونو اک حال میں ہیں درد و مصیبت والے

بے نصیبوں کے نصیبوں میں کہاں یار کا وصل
ان کی قسمت میں ہے جو لوگ ہیں قسمت والے

تو جو آجائے تو اسے درد محبت کی دوا
میرے ہمدرد ہوں بیدرد نصیحت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلم آتش باز
لکھ کے میری تپش دل کو کتابت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دل بیمار رکھے ہیں وہی عیادت والے

تو مرے حال سے غافل ہے پرائے غفلت کیش
تیرے انداز تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

ن اُس نے دیکھے ہیں کہاں

مرزا انور الدین اور مرزا حید رشکوہ دو تیموری شاہزادے لکھنؤ میں عمدہ احترام و عزت

کے ساتھ رہتے تھے۔ مرزا سلیماں شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ کے پوتے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں دلّی میں آئے۔ ہر طرح صاحب لیاقت تھے اور شعر بھی کہتے تھے آتش کے شاگرد تھے۔ بادشاہ ان کی خوبیوں کے سبب سے خوب ہی متوجہ ہوئے اور اپنا سمجھ کر اُن پر اعتبار ظاہر کیئے۔ چاندنی چوک میں نواب رکن الدولہ کے مکان میں اُترے تھے۔ تسخیر کے اُستاد تھے۔ اُستاد سے بھی محبت اور تپاک سے اخلاص قایم کیا۔ بادشاہ کے حکم سے مشاعرہ شروع کیا۔ اُستاد سے وعدہ لے لیا کہ بادشاہ کی غزل لے کر اور آپ اپنی غزل کہکر مشاعرہ میں لائیں۔ پہلے جلسہ میں یہی طرح تھی۔ اِدہ غزل مرقوم الذیل اُستاد نے پڑھی تھی۔ بڑی دھوم دھام کا جلسہ تھا۔

کیا غمزہ ترا بر سر بیداد غضب ہے
جلاد فلک سے بھی یہ جلاد غضب ہے

ہر ناز میں کرتا ستم ایجاد غضب ہے
سر تا بقدم وہ بت بیداد غضب ہے

ناز آفت و چشم ستم ایجاد غضب ہے
شاگرد بھی ہے قہر جو اُستاد غضب ہے

اے بلبل نالاں تری فریاد غضب ہے
کر بات بھی آہستہ کہ صیاد غضب ہے

گلشن میں ابھی ہنس کے پریشاں ہوئے گل
اس باغ میں آنا بدل شاد غضب ہے

نکلے ہے صدا کوہ سے ہم آتش دہم آب
کیا سوز و گداز دل فرہاد غضب ہے

خاکستر پروانہ پہ روتی ہے بجا شمع
ہو خاک جگر سوختہ برباد غضب ہے

دل حسن کے یوسف سے جو ہونے لگے روشن
ہم سمجھے کہ اس چاہ کی اُفتاد غضب ہے

اُس بت کا سمجھ حسن خداداد نہ اس کو
یہ تجھ پہ خدا اسکا دل ناشاد غضب ہے

ہوتا ہے سپند ایک ہی آواز میں آخر
کیا سوختہ جانوں کی بھی فریاد غضب ہے

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے

اے شوخ تری چشم غضبناک کے ہوتے
ہم جانیں قضا سے اگر امداد غضب ہے

اللہ کرے خیر مرے شیشۂ دل کی
پھر آج وہ مست مئے بیداد غضب ہے

بھولا نہ مجھے قتل گہہ عام میں قاتل
اللہ رے ترا حافظہ کیا یاد غضب ہے

شیطاں بھی اماں مانگتا ہے اُن کے عمل سے
کیا حضرتِ آدمؑ کی بھی اولاد غضب ہے

پریوں پہ تری طرح سے مرتے نہیں ہیں ہم
ہم جبکہ ہیں عاشق وہ پریزاد غضب ہے

تارے یہ فلک پر ہیں کہ اُڑتے ہیں شرارے
عاشق کی ترے گرمیٔ فریاد غضب ہے

ہے سرو تو پابند غم بے ثمری میں
کہتے ہیں گرفتار کو آزاد غضب ہے

غصہ ہے ترا قہر۔ ترا قہر قیامت
رنجش تری بیداد ہے۔ بیداد غضب ہے

ہے غم سے ہنوز آئینہ با دیدۂ پُر آب
اسکندر رومی کی بھی روداد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے
اور اس پہ بھی دلکش یہ غم آباد غضب ہے

قامت تو ترا سرو کے سر پہ بپا قیامت
پر طرۂ سر طرۂ شمشاد غضب ہے

سو فتنے ہیں پنہاں نظر لطف میں اُسکی
یہ لطف نہیں اے دل ناشاد غضب ہے

دیں ہوش بھلا مردم ہشیار کے پل میں
آنکھوں کو تمھاری وہ فسوں یاد غضب ہے

یہ خانۂ ہستی ہے عجب خانۂ رنگیں
اے ذوق مگر سستیٔ بنیاد غضب ہے

ہوئے وہ کب قائل قیامت جو تیرا قامت نہ دیکھ لینگے
رہیں گے رویت سے بلکہ منکر۔ جو تیری صورت نہ دیکھ لینگے

ہمیں غرض کیا کہ جائینگے ہم۔ حرم کو اے شیخ بتکدہ سے
یہیں بتوں میں خدا کا اپنے ظہور قدرت نہ دیکھ لینگے

نہ دیکھ لی کیسی کیسی آفت۔ جہاں میں ہم نے تمھارے باعث
اور آگے کیا کیا غم و الم ہم۔ تمھاری دولت نہ دیکھ لینگے

دکھانا احوال انکو اپنا۔ یہ اُن کی اُلفت کا امتحاں ہے
کہ ہوگی اُلفت تو دیکھ لینگے۔ نہ ہوگی اُلفت تو دیکھ لینگے

کہوں یہ کیوں میں کہ حضرتِ دل۔ شکر لبوں پر نہ زہر کھاؤ
کہ آپ ہی تلخیٔ محبت کی وہ حلاوت نہ دیکھ لینگے

بلا سے گرد انیاں کا سا۔ نہیں ہے پاس اپنے فال نامہ
ہم اپنے نقطوں سے داغ دل ہی کے فال دولت نہ دیکھ لینگے

اگرچہ درد محبّت اپنا۔ کہا نہ میں نے زباں سے اپنی
وہ میری صورت نہ دیکھ لینگے۔ وہ میری حالت نہ دیکھ لینگے؟

ہلال کو دیکھیں کیا فلک پر۔ اگر ہے منظور عید ہم کو
تو اُس کی تیغ ستم کا دل میں۔ لب جراحت نہ دیکھ لینگے

بہار باراں کو کون دیکھے۔ بغیر یاراں ہے تیر باراں
اب اس کے بدلے سرشک مژگاں کی اپنے شدّت نہ دیکھ لینگے

گذر بھی جاؤں گر اپنے جی سے۔ کہیں گے جیتا ہے جی چُرایا
وہ جب تلک آ کے اپنے آستانے پہ میری تربت نہ دیکھ لینگے

مجھے یقیں ہے نہیں دکھائینگے اپنے رخسار لالہ گوں کو
رواں مری چشم تر سے جبتک وہ خونِ حسرت نہ دیکھ لینگے

تپ محبّت کا میرے دل کی یقیں نہ آئے گا ہرگز ان کو
طپاں وہ رگ رگ میں میری جبتک کہ برق سرعت نہ دیکھ لینگے

خط ان کو دے بھی دیا جو قاصد نے ذوق دیکر کسی کا دھوکا
وہ خط نہ پہچان لینگے میرا۔ مری عبارت نہ دیکھ لینگے

کیا مدِ نظر تم کو ہے یاروں سے تو کہیے
حال دل بیتاب کہا جائے جو ہم سے
کیا کہیے گا اب اور سرِ خاک شہیداں
پھر تم نہ کہیں حضرت عیسےٰ اگر اُن سے
کچھ سوز دل اپنا کسی دل سوز کے آگے
موقوف ہے گر دل کا شکار آن و ادا پر

گر مُنہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیے
گر کہیئے نہ لاکھوں سے ہزاروں سے تو کہیے
کچھ فتنے اُٹھائے ہوں مزاروں سے تو کہیے
کہیے۔ کہ یہ تم عشق کے ماروں سے تو کہیے
فرصت ہو تپ غم کے حراروں سے تو کہیے
تو پہلے کچھ اُن میر شکاروں سے تو کہیے

اُس گوہرِ دنداں پہ اگر سوجھے کوئی بات — موتی تو ہیں کیا مالِ ستاروں سے تو کہیے
جس راہ سے شانہ ہے گیا زلف رسا میں — اُس رشتہ کو ان سینہ نگاروں سے تو کہیے

کہیے نہ تنک ظرف سے اے ذوق کبھی راز
کہکر اُسے سُننا ہو ہزاروں سے تو کہیے

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
زالِ دنیا ہے عجب طرح کی علّامۂ دہر — مردِ دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے
تیرہ بختی مری کرتی ہے پریشاں مجھ کو — تہمت اُس زلفِ سیہ فام پہ دھر دیتی ہے
رات بھاری تھی سرِ شمع پہ سو ہو گذری — کیا طباشیر سفیدیٔ سحر دیتی ہے
ناز و انداز تو ہیں کر چکے سب مشقِ ستم — کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے
دیتی شربت ہے کسے زہر بھری آنکھ تری — عین احساں ہے مجھے زہر بھی گر دیتی ہے
کیا کرے حسرتِ دیدار کہ دم لینے کی — دل کو فرصت نہیں وہ تیغِ نظر دیتی ہے
شمع گھبرا نہ تپِ غم سے کہ اک دم میں ابھی — آ کے کافور سفیدیٔ سحر دیتی ہے
فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا — اب تو اکسیر بھی دیجے تو ضرر دیتی ہے
غنچہ ہنستا ترے آگے ہے جو گستاخی سے — چٹخنا منہ پہ وہیں بادِ سحر دیتی ہے
شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانہ سے — جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے
نخلِ مژگاں سے ہے کیا جانیے کیا چشمِ ثمر — چشم پانی کی جگہ خونِ جگر دیتی ہے
کہتے سنتے نہیں کچھ ہم تو شبِ ہجر میں پر — نالۂ دل کا جواب آہِ جگر دیتی ہے

ز حسن بھی کم نہیں کچھ عشق سے جانبازی میں ۔ جان پروانہ جو دے شمع بھی سر دیتی ہے ۱

کوئی غمّاز نہیں میری طرف سے لے ذوق
کان اس کے مری فریاد ہی بھر دیتی ہے

مزا تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے — کہ گل تمھاری بہار دل میں آرزو کرتے
مرے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے — مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے — گر نہ پاریٔ دل کیونکہ پہلے وضو کرتے

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بُو کرتے

یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اُٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

سمجھیو دار و رسن۔ تار و سوزن اے منصور
کہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

نہ رہتی یوسف کنعاں کی خوبیٔ بازار
مقابلہ میں جو ہم تجھ کو رو برو کرتے

چمن بھی دیکھتے گلزار آرزو کی بہار
تمھاری بادِ بہاری میں آرزو کرتے

عجب نہ تھا کہ زمانہ کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمرِ گذشتہ کا لیجئے گر ذوق
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

اُس سنگِ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے
وہ اپنی جا نماز ہے اور یہ نماز ہے

ناساز ہم سے جو ہے اسی سے بِیاز ہے
کیا خوب دل ہے واہ ہمیں جس پہ ناز ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

خانہ خرابیاں دلِ بیمار غم کی ہائے
ہے وہ دوا خراب کہ جو خانہ ساز ہے

خنجر کہیں نہ یار کا بہہ جائے ہو کے آب
میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

پہنچا ہے شب کمند لگا کر کہاں رقیب
دیکھو حرامزادہ کی رسّی دراز ہے

اُس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک
ہر چند جانتا ہوں کہ وہ بے نیاز ہے

نقطہ پہ خالِ روئے بتاں کے مجھے خدا
بخشے تو کیا عجب کہ وہ نکتہ نواز ہے

ہر برگِ گل کے لب سے ٹپکتا ہے خوں پڑا
گلشن میں کس کی خاک شہیدانِ ناز ہے

اے ذوق کیوں نہ سب پہ کھلے تیرا رازِ عشق
جو نالہ ہے کلیدِ درِ گنجِ راز ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ پیاسے ہیں مے آشام مہینہ بھر کے

آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم
تو ڈبو دو انھیں دریا میں سفینہ بھر کے

عقد پروین یہ نہیں حقّہ پروین ہیں فلک
لائے ہیں اس رُخِ روشن کا پسینہ بھر کے

روز اُس گلشنِ رخسار سے لیجائے ہیں
اپنے دامانِ نظر مردمِ بینا بھر کے

دل ہے آئینہ۔ صفا چاہیئے رکھنا اس کا
زنگ سے بھرتا ہے کیوں اس میں تو کینہ بھر کے

خُمِ پُرجوش کی مانند چھلکتا ہے پڑا
خونِ حسرت سے لبوں تک مرا سینہ بھر کے

جام خالی بھی لگا منہ سے نہ کم ظرف کے ساتھ
ذوق کے ساتھ قدح ذوق سے مینا بھر کے

جو تھے مژگانِ پُرخوں سب وہ خارِ دلنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نشتر تھے۔ کہیں دل تھے کہیں نکلے

عدوئے نیش زن کے گھر سے کب وہ مہ جبیں نکلے؟
الٰہی برجِ عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

چھٹے کیا ہم سے شوقِ حسنِ گندم گوں۔ کہ گندم پر
ہمارے جدِ امجد چھوڑ کر خلدِ بریں نکلے

ترے انداز سے سو سو طرح کے ناز ہوں پیدا
ترے ہر ناز پر سو سو کا دم اے نازنیں نکلے

پرے جاکر نئی دنیا سے بھی گر دیکھو دنیا میں
تو خالی خاکِ آدم سے نہ چپّا بھر زمیں نکلے

خدا دے دوربینی اور اُس چشمِ تصور کو
کہ لاکھوں کام اس سے دور کے لے دوربیں نکلے

نہ لائے گر تصوّر اُس لبِ شیریں کا آنکھوں کو
تو آنسو بہہ کے شربت۔ خون ہو کر انگبیں، نکلے

قلم کی دیکھ گلکاری دمِ تحریرِ حالِ دل
کہ جلئے حرفِ گلہائے انارِ آتشیں نکلے

زیادہ جان کے جلنے سے غم ہے تیرے جانے کا
الٰہی جانے سے پہلے مری جانِ حزیں نکلے

نہ ہو غربت میں گر قدرِ صفا پاکیزہ گوہر کی
تو کیوں دریا سے یکتا ہو کے پھر دُرِّ ثمیں نکلے

سیاہی میں ہے موذی کی حلاوت اہلِ عالم کی
کہ ویراں خانۂ زنبور ہو جب انگبیں نکلے

ہوئے تم جیں برابر ہو کے میرے قتل کے درپے
چمکنے سے تمھارے جوہرِ شمشیرِ کیں نکلے

ہمارا بار و سیاہی گر ملے اُن نامداروں کو
ہوس دل سے نہ اُن کے نام کی مثلِ نگیں نکلے

فلک بھی خانۂ زنبور ہے کثرت سے انجم کی
بگر کیا دخل جز زہراب اس میں انگبیں نکلے

دلِ زخمی کی حالت پر دہانِ زخم کیا بولیں
زبانِ تیغ سے نکلے تو شاید آفریں نکلے

جو حسرت میر کے دل میں ہے نکالوں میں کہاں اُن کی
نہ وہ زیرِ فلک نکلے نہ وہ زیرِ زمیں نکلے

کیا کرتے تھے شہرہ ذوق جنکی پارسائی کا
وہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے ہمنشیں نکلے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہم تم سا عدو اپنا کسی کو نہیں پاتے
تم ہم کو جو پاؤ تو چھری کو نہیں پاتے

کیا وقت تھا وہ تجھ کو دیا دل تھا جو ہم نے
اے سنگدل اُس سخت گھڑی کو نہیں پاتے

وہ کونسی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں
لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے

لیتے ہیں شب وصل میں اُس لب کے یہ بوسے
ہم لب پہ سحر رنگِ مسی کو نہیں پاتے

میں ایسا ہوا گم کہ عزیزانِ عدم بھی
گم ہو گئے مری گم شدگی کو نہیں پاتے

رکھتے ہیں دم شعلہ فشاں اژدرِ دوزخ
لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے

وہ دن ہیں کہاں بہتے تھے جو چشم سے چشمے
اب نام کو بھی ان میں نمی کو نہیں پاتے

معلوم نہیں اس کے دہن ہے کہ نہیں ہے
اے ذوق ہم اس سرِ خفی کو نہیں پاتے

ابتدائے شباب کی غزل ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی ۔

نبض ملتی ہے کہاں میری فلاطوں چلتی
ہے یہ ضعف اب تو کہ چونٹی بھی نہیں یوں چلتی

پہنچے کیونکر جرس ناقۂ لیلےٰ کی صدا
آج آندھی تری قسمت سے ہے مجنوں چلتی

کھولدو آنکھوں سے پٹی نہیں دیکھوں گا تمھیں
پر چھری اپنی تو گردن پہ میں دیکھوں چلتی

جب میں دُنیا سے چلا سر پہ یہ بولی حسرت
تو اکیلا نہیں ہیں ساتھ ترے ہوں چلتی

دُور کر بالوں کو سر سے یہ ہے کہتی لیلےٰ
پر نہیں کان پہ مجنوں کے ذرا جوں چلتی

میں تو اُن آنکھوں کی گردش کا بلا گرداں ہوں
کہ نہیں تیری جہاں گردشِ گردوں چلتی

عمر ہے کر رہی ہر دم سفرِ بحرِ فنا
ق
جس کو تو سالک کہے ہے دلِ محزوں چلتی

سمجھے ہے راکب کشتی کہ ہے ساحل چلتا
پر حقیقت میں ہے کشتی سرِ جیحوں چلتی

ذوق گل اور کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے
کہ ہوا باغ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

۱۲۷۵ھ میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام سے

مشاعرہ کیا تھا۔ وہاں یہ غزل پڑھی گئی تھی۔ نواب موصوف۔ نواب عبداللہ خاں صدر الصدور میرٹھ کے بیٹے تھے (دیکھو صفحہ ۹۸)۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ اُنھیں ساتھ لیکر اُستاد مرحوم کے پاس آئے اور بڑے اصراروں سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا۔ اللہ اکبر۔ یاد ایام! استاد میرے والد مرحوم کے بغیر مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ ان کے پاس آئے۔ والد نے کہا۔ دل افسردہ ہو گیا۔ میں ادھر نہیں جاتا۔ تم جاؤ۔ مگر جاؤ گے تو سنو گے کیسے؟ اور سناؤ گے کیسے؟ اُستاد نے کہا۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ وہ دو تو آئے تھے میں نے بھی ان کے اصرار سے وعدہ کر لیا ہے۔ تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤں گا۔ بندۂ آزاد اُس وقت تک ایسے جلسوں میں نہ جا سکتا تھا جب تک کوئی ایسا ہی بزرگ ساتھ نہ ہو۔ اور مشاعرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ہمیشہ اگلے مشاعروں کی باتیں سُن سُنکر آرزو مند رہتا تھا۔ میں نے بھی والد مرحوم سے کہا۔ غرض کہ مشاعرہ میں گئے۔ ملاقات مذکورۂ بالا کی باتوں میں اُستاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا۔ کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنایئے۔ مدتیں گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سُنا۔ میں نے کہا۔ حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا پھر کہا۔ خیر میں نے دو شعر سُنا دیئے۔ انہیں دنوں میں ہوئے تھے

خط بڑھا۔ کاکل بڑھی۔ زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے	حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
بعد بخش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل	اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا۔ اُنھوں نے بھی کچھ سنایا؟ فرمایا۔ نہیں۔ یہی کہتے رہے۔ نجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا۔ دل نہیں لگتا۔ چرچہ جاتا رہا وغیرہ وغیرہ اس بیان سے بندۂ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے۔ بے شک ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہوں گے۔ مگر سخن سنج نکتہ شناس تھے۔

ساتھ اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو۔ اور اُس میں اثبات مضمون بہم گواہوں سے قایم ہو۔ اس پر غزلیت کے اوصاف سے متصف ہو وغیرہ وغیرہ اُسے سُنکر جو پڑھتے تو اُسی رتبہ کا مطلع پڑھتے۔ وہ زبان پر نہ دھرا تھا۔ اور وہ اُن لوگوں میں نہ تھے۔ کہ شعر سُنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے۔ اور محل و مقام پہچانتے تھے۔

ثبات کب ہے زمانہ کے عزّ و شاں کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زباں کے لئے
یہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے
ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے
کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

صبا جو آئی خس و خارِ گلستاں کے لئے
قفس میں لوٹ رہا ہے دل آشیاں کے لئے

دمِ عروج ہے کیا فکر نردباں کے لئے
کمند آہ تو ہے بامِ آسماں کے لئے

سدا تپش پہ تپش ہے دلِ تپاں کے لئے
ہمیشہ غم یہ ہے غم جانِ ناتواں کے لئے

جو سنگ کعبہ کے بوسہ میں حج کعبہ ہے شیخ
تو بوسے ہم نے بھی اُس سنگِ آستاں کے لئے

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی۔ کہ عالم میں
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

دکان حسن میں رکھتے نہیں متاع وفا
وگرنہ لیتے ہم اک اپنے مہرباں کے لئے

خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن اے یار
یہ جان اُس ترے مجنون ناتواں کے لئے

الٰہی سوزِ محبت سے اُڑتا ہے تنِ زار
کہ لایا عشق ہے سیماب استخواں کے لئے

نگاہ ناز نے کی دیر ورنہ میں تیار
ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نُور
کہ جان دی ترے رُوئے عرق فشاں کے لئے

الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے[1]

قدِ خمیدہ پہ اپنے ہیں بال زیبِ وبال
اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

[1] کانوں پر ہاتھ رکھنا۔ انکار کرنا۔ مکر جانا۔ کان میں کچھ پھونکنا۔ کسی کو اندر ہی اندر بہکا دینا۔

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشم خوں فشاں کے لئے

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر
کہ یادگار زمانہ رہے نشاں کے لئے

امید ہو گئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس
بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لئے

نگاہ ناز نے دیکھے تھے جوہر آج اپنے
دل اپنا ہمکو بھی یاد آیا امتحاں کے لئے

تمھاری نرگس بیمار نے جو کی تھی نگاہ
وہی جواب ہوا طاقت و تواں کے لئے

مزاج اُن کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب
خطر جو ہے تو یہی ہے مزاجداں کے لئے

نہیں ہوں نے مگر اتنا مجھے بھی ہے معلوم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے

اُڑا کے آہ کا شعلہ کبھی بنائیں گے ہم
شب فراق میں خورشید آسماں کے لئے

چلیں ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم
شکست توبہ لئے ارمغاں۔ مغاں کے لئے

وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل
ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لئے

بنایا **ذوق** جو انساں کو اُس نے جزو ضعیف
تو اُس ضعیف سے کل کام دوجہاں کے لئے

بادشاہی خواجہ سراؤں میں محبوب ایک خواجہ تھا۔ بیگم کی اُس پر بڑی مہربانی تھی وہ بڑھتے بڑھتے میاں محبوب۔ اور میاں صاحب ہو گئے۔ جب بیگم ترقی کرتے کرتے وزارت کی مالک ہوئیں تو محل کے ساتھ مقدمات دربار کے اختیار بھی کل محبوب کو مل گئے۔ اور محبوب علی خاں نواب ہو گئے۔ سفید سیاہ موقوفی بحالی سب ایک خوجہ کی زبان پر تھی۔ بے علم۔ بے لیاقت۔ بیہودہ اُس پر یہ اقتدار۔ ضرورتیں تھیں کہ علما۔ شرفا۔ امرا کو اُس کے پاس ملتجی کر کے لے جاتی تھیں۔ اُس کمبخت مخنث کو جوئے کا مرض تھا۔ شہر کے نامی نامی جواری ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ایسے امن کی جگہ انھیں کہاں؟ حضور کبھی کبھی اِن سے

ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ناراضی بڑھ گئی۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ میں حج کو جاتا ہوں۔ بندہ آزاد اُستاد کی خدمت میں حاضر تھا۔ اُستاد کے کسی دوست نے کہا کہ میاں صاحب حج کو چلے۔ ایک اور صاحب بولے۔ جاتا ہے نہ آتا ہے باتیں سُنا کیجیے۔ اُستاد نے سُن سُن کر فرمایا:۔

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کئی مہینے کے بعد غزل پوری کی:۔

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کیا خط لکھوں اُنھیں کہ جو لکھنے کی بات ہے
پہلے ہی غیر داں ہیں اُنھیں سب پڑھا چکے

آنا بلا سے اُن کا قیامت سے کم نہیں
ہیں ہم تو مر چکے اُسے آنا ہو آ چکے

زہر آب یا شراب یہاں سب ہے نوش جاں
ساقی پیالہ منہ سے ہم اب تو لگا چکے

اچھا کیا وفا کے عوض تم نے کی جفا
جانے دو تم بھی اب کہ کیا اپنا پا چکے

یاد آیا یاں کے آنے کا وعدہ بھی خوب اُنھیں؟
جب رات کو وہ پاؤں میں مہدی لگا چکے

اے دل زمین بوجھ ہے یا آسماں کا بار
ہیں اب تو سر یہ بار محبت اُٹھا چکے

مدت سے موت و زیست پڑے ہیں گلے کا ہار
تیغ نگہ تری کہیں قصہ چکا چکے

اب ڈھیر گر خرابۂ دنیا میں ہیں تو کیا
پہلے تو ہم بھی خاک بہت سی اُڑا چکے

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل
سو بار آبلے اُسے آنکھیں دکھا چکے

حاجت نہیں ہے تیرے شہیدوں کو غسل کی
ہیں تیغ آبدار سے خوں میں نہا چکے

سب ہم سے قیمت دل و جاں پوچھتے ہیں آج
تار اُن کے اک نگاہ میں ہیں سب چکا چکے

ہو معرکے میں عشق کے قاضی نہ کیونکہ موت
جھگڑا یہ وہ نہیں ہے کہ جو لے قضا چکے

اپنا ہی دل نہ پھیر سکے رُخ سے یار کے
سر اپنا خوب حضرت ناصح پھرا چکے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی!!
ہم تو تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا نشاں
دشمن ہمارے نام کو کیا کیا مٹا چکے

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو میکدہ کو ذوق
اُٹھو کہیں۔ وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ابر کیا۔ آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — برق کیا ہے تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ذکرِ حسن شمع لانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — اُن کو در پردہ جلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جھوٹ موٹ افیوں کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — اُنکو کف لا کر ڈرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
لُطف اُٹھانا ہے اگر منظور اُس کے ناز کا — پہلے اُسکا ناز اُٹھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
کہدو قاصد سے کہ جائے کچھ بہانے سے وہاں — گر نہیں آتا بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
زخم تو سیتے ہیں سب پر سوزنِ الماس سے — چاکِ سینہ کا سلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
پوچھے ملا سے جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا — سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
تیر و پیکاں جتنے دل میں تھے دئیے اُس کو نکال — اپنے ہاتھوں گھر لُٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
دیکھکر قاتل کو بھر لائے خراشِ دل میں خوں — سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
خط میں لکھوا کر اُنھیں بھیجا تو مطلع درد کا — دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے — دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جب کہا مرتا ہوں وہ بولے مرا سر کاٹ کر — جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
واں ہلے ابرو۔ یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ — بات کا ایسا بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
سُن کے آمد اُن کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم — پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کرے گا ہم کو قتل — تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جو سکھایا اپنی قسمت نے۔ وگرنہ اس کو غیر — کیا سکھائیگا سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق ہیں جوں مردمک ہم روسیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو کچھ کہ ہے دُنیا میں وہ انساں کے لئے ہے ن — آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لئے ہے

ن جو خانہ ہستی میں ہے انساں کے لئے ہے

زلفیں تری کافر ہیں دل ہے مرے کیا کام
دل کعبہ ہے۔ اور کعبہ مسلماں کے لئے ہے

بیٹھا ہے سخنور جو گرفتار تفکّر
زیبا یہ قفس مُرغ خوش الحاں کے لئے ہے

ستوں کے لئے رحمت باری کے ہیں آثار
زاہد جو دعا مانگتا باراں کے لئے ہے

اپنوں سے نہ بل اپنے ہیں سب اپنوں کے دشمن
ہر نَے میں بھری آگ نیستاں کے لئے ہے

ہیں کس کی نگاہوں کا ہوں وحشی۔ کہ مری خاک
اک کحل بصر چشمِ غزالاں کے لئے ہے

کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی
باقی ہے تو میری شب ہجراں کے لئے ہے

عاشق کا جنوں طرفہ تماشا ہے کہ ہر بات
گویا سبق اطفالِ دبستاں کے لئے ہے

وہ زلف سیہ پھینکتی کیوں دام ہے دل پر
یہ صید کسی پنجۂ مژگاں کے لئے ہے

دل بھی ہے مرا جان ترے مشق ستم کی
جو تیر ہے اس تودۂ طوفاں کے لئے ہے

دل قید تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق
کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کے لئے ہے

(بکئے ضبطِ اشک)

چُھٹی تو لٹے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں ہیں کیا کیا چنان و چنیں ہے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
خبر بھی نہیں یاں کہ ہے یا نہیں ہے

یہی گر تری چشمِ سحر آفریں ہے
تو دل ہے۔ نہ جاں ہے۔ نہ ایماں نہ دیں ہے

صنم میرے دل کو خدائی کا تیری
یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے

ہر اک چاند دیکھے ہے اُنتیسویں کا
جہاں ناتواں ہیں و باریک بیں ہے

رُکے اشک اور آہ پہنچی فلک پر
مرا عشق کم خرج بالا نشیں ہے

تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو
یہاں منتظر لب پہ جاں حزیں ہے

پڑے تفرقے یہ جُدائی سے تیری
کہیں ہوں کہیں۔ دل کہیں۔ جاں کہیں ہے

شب غم میں دمساز و دلسوز اپنا
دم سرد ہے نالۂ آتشیں ہے

ہنسی ہے جو کچھ رنج آمیز اُن کی
تو موج تبسم بھی چیں بر جبیں ہے

نہ ہوئے اگر تجھ کو دم کا بھروسا
تو جو دم ہے غافل دمِ واپسیں ہے

وہ پہلو میں بیٹھے ہیں اور بد گمانی
لئے پھرتی مجھ کو کہیں کا کہیں ہے

ہنسی آتی ہے مجھ کو جب تیرے آگے
کوئی ماہ کنعاں کو کہتا حسیں ہے

جو تم عرش سے دور بیٹھے تو بیٹھو
لگائے ہوئے میرا دل دور ہیں ہے

نہیں وہ رہے ہم سے۔ تم تھے جو پہلے
زمانہ کو تو کچھ تغیر نہیں ہے

وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے
وہی آسماں اور وہی زمیں ہے

نہ کی آہ سوز غم دل پر اُٹھائے
تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے

مرقوم الذیل مشاعرہ کی طرحی غزل ہے۔ مرزا خدا بخش شاہزادہ کے ہاں پڑھی تھی۔ حکیم آغا جان عیش اُستاد کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے اپنی غزل میں پڑھا:۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

شعر کو دیکھو استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا۔ والد مرحوم اُستاد کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ ان سے اُستاد نے کہا کہ مضمون لڑ گیا۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ اُنھوں نے کہا ضرور پڑھنا چاہیے۔ طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک نقطہ پر دو فکر پہنچے۔ اور کس کس انداز سے پہنچے۔ حکیم صاحب کے بعد ہی انکے آگے شمع آئی۔ حکیم صاحب کو خدا مغفرت کرے کیا نیک نیت اور منصف مزاج تھے شعر مذکور سنکر خوش ہوئے۔ رسائی طبع کی تعریف کی اور کہا کہ آپ فی الواقع اُستاد ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۱۷۴)

چھلا نہیں تو چھلّے کا گل لے نگار دے
پر کچھ نشانی اپنی مجھے یادگار دے

تو چشم میں نہ سرمۂ دنبالہ دار دے
مفتونِ چشم کو یوں ہی اک تیر مار دے

ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں کب وہ نگار دے
جو اپنے ہاتھ کا نہ مجھے پشت خار دے

ٹانکے نہ زخم دل میں ترا دل فگار دے
تو جب نہ لاگ نہ گیسوئے مشکیں کا تار دے

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے
یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اُتار دے

گلشن کو آب گر مژۂ اشکبار دے
بلبل بجائے بیضہ دُرِ آبدار دے

کیا خاک تجھ پہ جان کوئی جاں نثار دے
مٹی بھی جس کو تیرے نہ دل کا غبار دے

وہ زلفِ مشکبار اگر ایک تار دے
پھر بیچ لوں اگر کوئی مشکِ تتار دے

جولاں سمندِ ناز کو اے شہسوار دے
تو سرمہ چشمِ ماہ میں میرا غبار دے

وہ ناتواں ہوں کہ نہ جنبش کروں کبھی
ہلنے اگر نہ مجھ کو دلِ بیقرار دے

عشق اُس پری کا ہے وہ بلا جائے لیکے جاں
یہ جن نہیں ہے جس کو سیانا اُتار دے

ایسا نہ ہو کہ آتے ہی لے لے جواب خط
قاصد جواب زندگیٔ مستعار دے

غم یار کا رہیگا مرے ساتھ تا بہ حشر
سچ ہے کہ ساتھ یار کا کیونکر نہ یار دے

کرتا ہے یوں فغاں دلِ امیدوارِ وصل
جیسے اذاں بلند کوئی روزہ دار دے

میں ہوں وہ گُل کہ پہنچوں نہ گلبن سے خاک تک
جنبش اگر نہ مجھ کو نسیمِ بہار دے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

میں ہوں وہ زندہ دل کہ مری جانِ بیقرار
برقِ جہاں کو آتشِ مردہ قرار دے

لے وام داغِ دل سے مرے سوزشِ آفتاب
وعدہ یہ روزِ حشر کے پر کون اُدھار دے

بے رحم ہے نہ پاسِ مروت نہ منصفی
پھر جان کس امید پہ یہ جاں نثار دے

ہو گرمیٔ وفا سے شگفتہ نہ گل کا دل
جاں اپنی اُس پہ بلبلِ شیدا ہزار دے

بے فیض چشمۂ آبِ مصفا کا ہے تو کیا
مانگوں تو ایک قطرہ نہ آئینہ دار دے

جانباز عشق جان تلک اپنی کھیل جائے
لیکن قمارِ عشق میں ہمت نہ ہار دے

جوں شمع مردہ کشتۂ زلفِ سیاہ کو
گر دے کفن تو دامنِ شبہائے تار دے

چھوڑے کمانِ چرخ نہ تیر اپنا چھوڑنا
یہ آہ تیر ناک میں اُس کی ہزار دے

عاشق نہ بدلے انجمِ گردوں سے اپنے اشک
کیوں کوڑیوں کے مول دُرِ شاہوار دے

بندہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب فصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

پُرانی غزل ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی تھی :۔

پوچھ مت راہ وفا اُس نگہِ پُرفن سے
رہنمائی کی نہ رکھ چشم دلا رہزن سے

خار نکلے عوضِ سبزہ مرے مدفن سے
بچ کے جانا کہ یہ اُلجھینگے ترے دامن سے

کافر عشق ہوں گر سر بھی جُدا ہو تن سے
نکلے زنار محبت نہ مری گردن سے

تار ہر ساز کے پردہ میں محبت کے سبب
ایک فریاد نکلتی ہے دل آہن سے

ہوں میں وہ سوختہ جوں شمع کہ مثل فانوس
پیراہن تن میرے جُدا ہے تن سے

تیغ غم سے ہو نہ کیوں سینہ سپر مرد وفا
کثرت زخم بدن پر نہیں کم جوشن سے

تیرہ بختوں کا ہے وہ کلبۂ تاریک بلا
ڈر کے خورشید بھی جھانکا نہ جہاں روزن سے

میں گرانبار محبت ہوں مرا خوں بھی گراں
جی دھڑکتا ہے ترے ناز کی گردن سے

خوں مرا داغ نہیں دھوتا ہے تو کیا قاتل
یہ نہ چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا ترے دامن سے

ہو گیا کاغذِ سوزن زدہ سینہ سارا
دل کی جو پھانس بھی نکلی نہ سر سوزن سے

گر جھکے تیغ تری سر ابھی حاضر ہے کہ ہم
اس پہ مرتے ہیں کہ تعظیم تو لی دشمن سے

چشمِ میگون و صراحی بہ بغل۔ جام بکف
دیکھنا آج وہ گل آتا ہے کس جوبن سے

چھوڑ کر گھر ترے ہاتھوں سے نکلجائیں کہاں
تنگ ہمسایوں کو اے ذوق نہ کر شیون سے

فلک تو ٹیڑھا ہی کی صبح سے تا شام چلتا ہے
مگر سیدھی نظر سے یہ تری اپنا کام چلتا ہے

بھرے جاؤں گا میں صیاد دم گلشن کے چلنے کا
مرے سینہ میں صبح تک دم بزیر دام چلتا ہے

ہمیشہ دور عشرت ہے جو تم ہو اہلِ کیفیت
کہ مہر و ماہ سے دن رات یاں اک جام چلتا ہے

چلا پہلو سے اُٹھ کر جبکہ وہ آرام جان و دل
کہا آرام نے ہم سے کہ لو آرام چلتا ہے

ترا تیر نگہ پیکِ قضا سے کم نہیں قاتل
جدھر چلتا ہے بن کر موت کا پیغام چلتا ہے

سمندِ[1] وحشت اپنا شاخ گل کے تازیانہ سے
جنوں کی شاہراہوں میں سدا اک گام چلتا ہے

[1] پہلے فرمایا تھا۔ سمند وحشت اپنا چوب گل کے تازیانہ سے۔ پھر فرمایا ہر شخص نہ سمجھے گا۔ عام لوگوں کو کیا خبر ہے کہ ایران میں جیسے موسم بہار میں جنوں ہوتا ہے اُس پر یہ ٹوٹکا کرتے ہیں تو اچھا ہو جاتا ہے۔ اور اسے چوب گل زدن کہتے ہیں۔

کیا پختہ مزاجوں کو مسخر تو نے دُنیا میں
یہ تیرا خوب جادو اے خیالِ خام چلتا ہے

عجب شطرنج گردوں ہے کہ جس میں اپنے گھوڑے کو
نئے منصوبہ سے روز ابلقِ ایّام چلتا ہے

کہو صیاد سے گر ذبح کرنا ہے تو جلدی کر
ابھی کچھ دم مرے سینہ میں زیرِ دام چلتا ہے

ارادہ گر کرے ناقص عُلُوِّ جاہِ کامل کا
تو یہ جانو کہ نابینا کنارِ بام چلتا ہے

خرد نے رازِ عالم کچھ نہ پایا ذوق اگر پایا
کہ بے آغاز آیا اور بے انجام چلتا ہے

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے
آتا یہ کس بھروسے پہ ہنستا چمن میں ہے

مہ میں کہاں جو تابِ رُخِ سیم تن میں ہے
پردہ سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

دم کو نہیں ہے سینہ میں آرام ایک دم
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے
اس درد سے عقیق کا دِل خوں یمن میں ہے

رنگیں ہے آج کل کے گُل نو بہار سے
اگلا جو برگِ زرد کوئی اس چمن میں ہے

وہ دل کہ لا نہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب
زیرِ شکنجہ زُلفِ شکن در شکن میں ہے

یاد آتا ہے جو آبِ دمِ تیغ کا مزا
بھر آتا میرے زخم کے پانی دہن میں ہے

ہیں روزنِ دہن میں جو کژدم لئے ہوئے
یہاں کام اُن کا نیش زنی ہر سخن میں ہے

دِکھلا دو پشتِ لب پہ تم اپنی دُرِ بلاق
دیکھیں سہیل کیونکہ چمکتا یمن میں ہے

ہوش و خرد کو دیکھ لیا دردِ سر میں ذوق
آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

غزل مذکورۂ ذیل ابتدائی مشق ہے اس وقت اُستاد کی ۱۶-۱۷ برس کی عمر تھی - مجھے یاد ہے - ایک دن والد مرحوم کو استاد نے کچھ پُرانے مسودے دیے میں اُن دنوں لڑکا تھا - وہ دیکھتے جاتے تھے اور ہر کاغذ پر حسبِ حال کچھ کچھ کہتے بھی جاتے تھے جب پرچہ پر غزل مرقومہ ذیل کے شعر لکھے تھے اُسے دیکھ کر والد نے افسوس کیا اور کہا اوہو - دیکھو جی ! یہ وہ غزل ہے بھئی کیا دن تھے وہ - اس مرحوم کا بھی افسوس ہی ہے - اُستاد نے کہا - افسوس !

پھر ایک دن میں نے والد سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ شاہ نصیر مرحوم کے بیٹے وجیہ الدین منیر تھے۔ اُن کی بھی اُس زمانہ میں ۱۶۔ ۱۷ برس کی عمر تھی۔ اور طبیعت بھی تیز تھی۔ اُستاد کے ساتھ اکثر شعروں اور غزلوں کے معرکے رہتے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے اُستاد سے کہا۔ مصرع طرح کرتے ہیں۔ آؤ غزل لکھو لڑکپن کا عالم تھا۔ اُستاد نے کہا۔ کہو۔ کہیں گے۔ مگر غزل کہی۔ اُستاد سے (شاہ صاحب) کہوالی۔ پھر کہا کیا؟ منیر نے کہا۔ اچھا پھر تم بتاؤ۔ اُستاد نے کہا ہم تم یہیں بیٹھکر کہیں۔ دونو بیٹھ گئے۔ اور طبع آزمائی ہونے لگی۔ اُستاد نے ڈیڑھ دو گھنٹہ میں غزل کہی۔ اور کہا۔ کیوں صاحب! اُنھوں نے بھی غزل کہی تھی۔ دونو غزلیں پڑھی گئیں۔ اُستاد نے اپنی غزل اُنھیں دی اور چلے آئے۔ دوسرے دن اُستاد گئے۔ تو اُنھوں نے کچھ اور شعر بھی سُنائے۔ بعض میں ترمیم تھی بعض اشعار پر اُستاد نے کہا۔ یہ شعر تمھارے ہیں؟ اُنھوں نے کہا۔ بے شک۔ اُستاد نے کہا۔ اب یہ شعر اُستاد (شاہ صاحب) کے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے کہا۔ واہ ہمارے ہیں۔ اس پر خوب گفتگوئیں رہیں۔ طرفین کے یاروں میں صلاح مشورے۔ اور مقابلے ہوتے رہے۔ خدا کی شان ہے۔ شاہ وجیہ الدین نوجوان دُنیا سے گئے۔ اُستاد بڈھے ہوئے تو کہا۔ آخر چلے ہی گئے۔ افسوس۔ وقت گذرتا ہے۔ باتیں یاد رہجاتی ہیں۔ الٰہی ہم سے نیکی اور راستی یادگار باقی رکھیو۔ غزل مذکور میں سے جو کچھ باقی ہے وہی لکھ دیتا ہوں۔

یہاں کے آنیکا مقرر قاصدا وہ دن کرے
کونسی شب آیگا وہ مہ منجم سے کہو

تو کرے قرباں ہمیں جس دن ہمارے واسطے
جب کہا قاصد نے دن وعدہ کا آیا تو کہا

جو تو مانگیگا وہی دونگا خدا وہ دن کرے
میرے سعد و نحس کا معلوم تا وہ دن کرے

عید قرباں سے شرف پیدا اسو اوہ دن کرے
اس سے کہدیوں ہی محشر تک گنا وہ دن کرے

تیغ قاتل سے رہے جو قتل کے دن بے نصیب
عید کے دن کو نہ کیوں عاشور کا وہ دن کرے

دن قیامت کا تو ہے پر میرا طومار عمل
ہائے اتنا ہے کہ امکاں کیا وفا وہ دن کرے

نیک و بد سب اُن غدا کے ہیں لکھی جس دن کی ہو
کچھ کرو لیکن فرائش کیا قضا وہ دن کرے

لاش دفنا کر مری بیٹھا ہے قاتل سوچ میں
یعنی میری فاتحہ کا کون سا وہ دن کرے

ذوق کہتا تھا کروں گا جمعہ کو حُب کا عمل
کوئی اُس کو جا کے بتلا دے ہُوا وہ دن کرے

یہ غزل بھی اسی عہد کی ہے۔ مسودات مذکور سے نقل کی ہے۔

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے
کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

مری حقیقتِ پُر درد کو کوئی اُس سے
یہ آہ و نالہ نہ کھوے یہ چشم تر تو کہے

یہ آرزو ہے جہنم کو بھی کہ آتش عشق
مجھے نہ شعلہ گر اپنا کہے شرر تو کہے

بقدر مایہ نہیں گر ہر اک کا رتبہ و نام
بھلا حباب کو دیکھیں کوئی گہر تو کہے

جو چپ لگا کے نہ بیٹھے تو کیا کرے ناصح
کہ جانتا ہے کہے کا ہو کچھ اثر تو کہے

جل اُٹھے شمع کی مانند قصہ خواں کی زباں
ہمارا قصۂ پر سوز لحظ بھر تو کہے

شہید عشق کا ہر قطرۂ خوں انا الحق ہے
کہے جو حق کوئی منصور اسقدر تو کہے

مجال کیا کہ ترے آگے فتنہ دم مارے
کہیگا اور تو کیا۔ پہلے الحذر تو کہے

بھرے گا بار محبت کی کیا فلک ہامی
یہ حوصلہ کوئی رکھے بجز بشر تو کہے

بلا سے ہو وے مرا مرغ نامہ بر بھو نرا
کہ اُس کو دیکھ کے وہ منہ سے خوشخبر تو کہے[1]

سرشک چشم مرے ہیں کہ ہو گئے موزوں
مری طرح سے کوئی ذوق شعر تر تو کہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

سامنے چشمِ گہر بار کے کہدو دریا
چڑھ کے گر آئے تو نظروں سے اتر جائیں گے

[1] دلی میں رسم تھی کہ جب بھونرا اڑتا ہوا پاس آتا تھا تو اُسے شگون نیک سمجھتے تھے اور کہتے تھے خوشخبر خوشخبر خاندان تباہ ہو گئے وہ لوگ اب نہ رہے کون کہے اور کون سُنے۔

تم نے ٹھہرائی اگر غیر کے گھر جانے کی
تو ارادے یہاں کچھ اور ٹھہر جائیں گے

خالی اے چارہ گرو ہونگے بہت مرہمداں
پر مرے زخم نہیں ایسے کہ بھر جائیں گے

لائے جو مست ہیں تربت پہ گلابی آنکھیں
اور اگر کچھ نہیں دو پھول تو دھر جائیں گے

پہنچیں گے رہ گذر یار تلک کیونکر ہم
پہلے جب تک نہ دو عالم سے گذر جائیں گے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائیگی پانی پانی
جب یہ عاصی عرق شرم سے تر جائیں گے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعوی تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

رخ روشن سے نقاب اپنے الٹ دیکھو تم
مہر و مہ نظروں سے یاروں کی اتر جائیں گے

شعلۂ آہ کو بجلی کی طرح چمکاؤں
پر یہی ڈر ہے کہ وہ دیکھ کے ڈر جائیں گے

ہم بھی دیکھیں گے کوئی اہل نظر ہے کہ نہیں
یہاں سے جب ہم روش تیر نظر جائیں گے

ذوق جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں ملا
ان کو میخانہ میں لے آؤ سنور جائیں گے

دل بچے کیونکر بتوں کی چشم شوخ و شنگ سے
اپنا گھر تو سوجھتا ہے سینکڑوں فرسنگ سے

اے تغافل کیش جلدی آ کہ تو واقف نہیں
اس دل بیتاب و جان مضطرب کے ڈھنگ سے

لب ہے باریکی کہ گویا ہر ترا تار سخن
جنتری میں کھنچ کے نکلے ہے دہان تنگ سے

ایک بھی نکلی نہ میری سی صدائے دلخراش
خون اگر ٹپکے نوائے مرغ خوش آہنگ سے

چھپ کے بیٹھیگا کہاں تو ہم سے اے رنگیں ادا
ہوگا تو جس رنگ میں ملجائیں گے اس رنگ سے

جوش گریہ سے رہی برسات برسوں پر کبھی
اسکی تیغ تیز کو دہ نہ دیکھی زنگ سے

پہلے یہ نیت وضو کی ہے نماز عشق میں
دل سے کہدیجے کہ دھو ہاتھ نام و ننگ سے

میرے رونے کے اثر سے ہو گئے پتھر بھی آب
جھڑتے ہیں جائے شرر پانی کے قطرے سنگ سے

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر
وسمہ آب بنگ سے مہندی مئے گلرنگ سے

کوئی ان تنگ دہانوں سے محبت نکرے
اور یہ تنگ کریں منہ تو شکایت نکرے

ہے جراحت کا مری سودۂ الماس علاج
فائدہ اس کو کبھی سنگ جراحت نکرے

عشق کے داغ کو دل مہرِ نبوت سمجھا
ڈر ہے کافر کہیں دعوائے نبوت نکرے

ہر قدم پر مرے اشکوں سے رواں ہے دریا
کیا کرے جادہ اگر ترک رفاقت نکرے

آج تک خوں سے مرے تر ہے زبانِ خنجر
پر کرے کیا جو طلب کوئی شہادت نکرے

مکتب صبح ازل کا ہے خلیفہ انساں
پھر کرے کون اگر یہ ہی خلافت نکرے

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نکرے

پھر چلا ہے بقتلِ عشاق کو قاتل اے ذوق
سر پہ برپا کہیں کشتوں کے قیامت نکرے

کہتے ہیں جھوٹ سب۔ کہ نہیں پاؤں چھوٹ کے
چھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پاؤں ٹوٹ کے

چلتا ہوں ذوق قید سے ہستی کے چھوٹ کے
یہ قید مار ڈالے گی دم گھوٹ گھوٹ کے

ڈھالا جو تجکو حسن کے سانچے میں لے صنم
آنکھوں کی جائے بھر دئیے موتی ہی کوٹ کے

بے درد سینہ کوٹنا خالی نہیں مرا
دل میں بھرا ہے درد مرے کوٹ کوٹ کے

کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

اُس شمع رو سے رات کو رخصت ہوئے جو ذوق
روئے ہیں دل کے آبلے کیا پھوٹ پھوٹ کے

ہر دم دل خوں گشتہ میں اک جوش فزوں ہے
جو آہ ہے سینہ میں وہ فوّارۂ خوں ہے

دنیا کی ہے رفعت کا سبب پستی ہمّت
گردوں کہ ہے اوج اس سے زمانہ میں کہ دوں ہے

پھر جاتی ہے سینہ کو مری آہ بھی اُلٹی
قسمت ہے جو برگشتہ ہوئی بخت نگوں ہے

میں درد سے ہوں عشق کے بیٹھا ہوا لبریز
پر دل یہی کہتا ہے کہ ہر گز نہ کہوں ہے

اک غمزہ تری چشم فسوں کار کا کافر
سو چشمِ پری کو سبق آموز فسوں ہے

دل کرتا ہے اس کوچہ کا جب قصد تو لیتا
طائر کے عوض رنگ پریدہ سے شگوں ہے

قایم ہے بنا درد کی فریاد سے میری
جو نالہ ہے ایوان محبّت کا ستوں ہے

جس دن سے ہوا عشق مرے درپئے تعلیم
ہر خارِ بیابانِ قلم مشق جنوں ہے

مرجاؤں مگر رازِ محبت نہ جتاؤں
کیا ہی اگر درد ہو دل میں نہ کہوں ہے

بیتابیٔ دل لفظوں میں کیا آئے کہ ہر حرف
دکھلا رہا گلہ ہے حرکت گاہ سکوں ہے

بیتابیٔ دل کا کوئی مضموں جو ہوا نظم
ہر حرف پہ میرے حرکت جائے سکوں ہے

تلخابۂ حسرت کو پیوں کیوں نہ مزے سے
میری یہی تبرید تپ سوز دروں ہے

ہے وصل میں غم ہجر کا اور ہجر بلا ہے
آرام محبت میں ہمیں یوں ہے نہ یوں ہے

آلودۂ اظہار نہ ہو رازِ محبت
دم ہونٹوں پہ آ جائے مگر میں نہ کہوں ہے

کھو آپ کو گر ڈھونڈتا ہے عشق کی منزل
گم گشتگی اس رہ میں تری راہنموں ہے

ہاروت سے واں لاکھوں ہیں شاگرد کہ جس جا
وہ چشم فسوں گر سبق آموز فسوں ہے

کیوں حال زبوں اپنا بیاں کرتا ہے ان سے
اے ذوق ترے واسطے یہ سخت زبوں ہے

کرے ہے کام تیغ یار کس کس آبداری سے
دکھائی اپنی گلکاری ہے کیا کیا زخم کاری سے

زباں کھولیں گے مجھ پہ بدزباں کیا بدشعاری سے
کہ میں نے خاک بھر دی اُن کے منہ میں خاکساری سے

گذرتی ہے مزے میں زندگی غفلت شعاری سے
مرے نزدیک بیہوشی ہے بہتر ہوشیاری سے

نہ ہوتا گر وہ شوخ خودنما سرگرم آرائش
اُٹھاتا ہاتھ خورشید فلک آئینہ داری سے

رواں ہے شمع کے اشکوں میں جزنی خاک گھل گھل کر
بہا جاتا ہے دل خوں ہو کے اپنا اشکباری سے

خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمار محبت کی
کہ نوبت دم شماری کی لگی شب اختر شماری سے

جو پوچھے زاہد خشک اپنی دارو کہہ دو مے پی لے
اگر پرہیز کو پوچھے کہو پرہیزگاری سے

قفس کو لے اڑیں صیاد اسیر مضطرب تیرے
خبر گل کی اگر اڑتی سنیں باد بہاری سے

کبھی گر سر اُٹھا اپنا تو جوں اشک سر مژگاں
زمیں کو جا لگا سر جھک کے اپنا شرمساری سے

اُٹھائے جاؤں کب تک داغ کاش انکے عوض تجکو
مری چھاتی پہ پتھر سنگدل دو چار بھاری سے

لگی بھی گر زمیں کو بیٹھ تیرے تفتہ جانوں کی
تو مثل برق اُٹھ بھاگے ہیں کس بیقراری سے

نہیں آتا نہ آسئے رحم اے ذوق اس ستمگر کو
بلا سے خوش تو ہو جاتا ہے میری آہ و زاری سے

یہ غزل بھی ایام شباب کی ہے شاہ نصیر کے عہد میں کہی تھی

یار ہنسنے حال پر ہم دل فگاروں کے لگے
کاشکے ایسے ہی یا رب دل کو یاروں کے لگے

اور بھی چمکا سمند وحشت اپنا دشت میں
تیز جوں مہمیز نشتر جبکہ خاروں کے لگے

کس کی کفش پا یہ دیکھے ہیں ستارے فلک
رہنے ہیں دیدے زمیں کو جو ستاروں کے لگے

بزم میں گر وہ الٹ دے روئے روشن سے نقاب
چھوٹنے مہتاب منہ پر ماہ پاروں کے لگے

اس طرح دیبے دلوں کے ہیں ترے چشم و نگاہ
جوں شکار افگن بھریں پیچھے شکاروں کے لگے

سرزمین باغ الفت میں ترے لے فتنہ گر
نخل قامت جب سے سینہ فگاروں کے لگے

ٹہنیاں تیروں کی نکلیں پھوٹے سوفاروں کے گل
خنجروں کے برگ نکلے پھل کٹاروں کے لگے

ہو اگر گرم فغاں مرغ چمن میری طرح
آگ دم میں آشیانوں کو ہزاروں کے لگے

آئے ہم اس بزم میں اک دم سو اس پر سینکڑوں
تیغ طعنوں کے لگے خنجر اشاروں کے لگے

اے خدنگ یار مرہم جائیں غیرت سے کیوں
مرہم آکر زخم پر سینہ فگاروں کے لگے

ذوق صحرائے جنوں میں ہو گیا ہے گرد باد
توسن وحشت کو ہیں مہمیز خاروں کے لگے

باغ عالم میں جہاں نخل حنا لگتا ہے
دل پر خوں کا وہاں ہاتھ پتا لگتا ہے

کیا تڑپنا دل بسمل کا بھلا لگتا ہے
جب اچھلتا ہے ترے سینہ سے جا لگتا ہے

دل کہاں سیر تماشے پہ مرا لگتا ہے
دل کے لگجانے سے جینا بھی برا لگتا ہے

جو حوادث سے زمانہ کے گرا کب اٹھا
نخل آندھی کا کہیں اکھڑا ہوا لگتا ہے

دل لگی کا ہے مزا یہ کہ گزک ہیں اے دل
سب کبابوں سے نمک تجھکو سوا لگتا ہے

نہ شب ہجر میں لگتی ہے زباں تالو سے
اور نہ پہلو مرا بستر سے ذرا لگتا ہے

ہائے محتاج ہوا مرہم زنگار کا تو
زخم دل! زہر مجھے ہنسنا ترا لگتا ہے

آبِ خنجر ہے جو زہر آب وفا داروں کو
ملک سرحد ہے وفا پانی ذرا لگتا ہے ؎

قد مجنوں ترے بھولوں کی چھڑی ہے لیلیٰ
جب ذرا جھکتا ہے سر پاؤں سے جا لگتا ہے

زر دزاہد ہے تو کیا۔ کھوٹ ابھی ہے دلمیں
ذوق اس زر کو کسوٹی یہ کسا لگتا ہے

اڑائی طرزِ نالہ کی بھی اکیدم تیرے محزوں سے
سو اب تک دیکھ لے منقار طوطی سُرخ ہے خوں سے

نہ شب آنکھوں میں خواب آیا خیالِ خالِ شبگوں سے
رہے بیدار ساری رات ہم اک حبِ افیوں سے

اُڑائیں یوں جادو گر بلا سے ہم نہیں ڈرتے
ہے اپنا دم ہوا ہوتا۔ تری چشمِ پُر افسوں سے

یہ دُنیا ہے وہ میخانہ کہ جس میں دورِ گردوں نے
گلِ حکمت کئے کتنے ہی خُمِ خاکِ فلاطوں سے

اثر ہو نالہ پُر درد کا اتنا تو اے بلبل
کہ ٹپکے جائے شبنم۔ اشکِ انجم چشمِ گردوں سے

شہید چشمِ میگوں ہوں۔ کہو تربت پہ سب میکش
کریں آ آکر چراغاں ساغرِ صہبائے گلگوں سے

ترے مجنوں کے تن پر لاغری کا قطع ہے جامہ
بنا تا پیرہن ہے ایک برگِ بیدِ مجنوں سے

خدا جانے ہوئے بخت اپنے وارون اُسکی زلفوں سے
ویا زلفیں ہیں اسکی واژگوں مجھ بخت واژوں سے

اُسی باغِ سخن میں ذوق جی اپنا بہلتا ہے
جہاں بوئے عشق کی آتی ہے کچھ گلہائے مضموں سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

ترا زباں سے ملا نا زباں جو یاد آیا
نہ ہائے ہائے میں تالو سے پھر زبان لگی

کسی کے دل کا سُنو حال۔ دل لگا کر تم
جو ہو وے دل کو تمھارے بھی مہربان لگی

تو وہ ہلالِ جبیں ہے کہ تارے بن بن کر
رہے ہے تیری طرف چشمِ یک جہان لگی

خدا کرے کہے تجھ سے یہ کچھ خدا لگتی
کہ زلف اے بتِ بدکیش تیرے کان لگی

اُڑائی حرص نے آکر جہاں میں سب کی خاک
نہیں ہے کس کو ہوا زیر آسمان لگی

تمھارے ہاتھوں ہمارے دل فگار ہیں آہ
سنانِ خنجر و پیکاں کی ہے دوکان لگی

؎ بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق ہوتا ہے کہ امراض مہلک میں گرفتار ہو کر مرجاتے ہیں۔ محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے۔ فلاں شخص فلاں سفر میں مرگیا پانی لگا تھا۔

کسی کی کاوشِ مژگاں سے آج ساری رات
نہیں پلک سے پلک میری ایک آن لگی

تباہ بحرِ جہاں میں تھی اپنی کشتیٔ عمر
سو لُوٹ پھوٹ کے بارے کنارے آن لگی

خدنگِ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے
کہ اُس کے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

وہ ہُوں میں پُر معاصی سوختہ سوزِ ندامت سے
حذر دوزخ کرے جسکے شرارِ سنگِ تربت سے

وہی ہے ایک سب میں دیکھ لو چشمِ حقیقت سے
بنا واحد کے کیوں توڑیگا ملّا جمع کثرت سے

نہ سوکھے دامنِ تر ذرّہ میرا۔ اور جوں اختر
رواں ہوں اشکِ خجلت چشمِ خورشیدِ قیامت سے

دمِ تکبیر اُٹھائے دو جہاں سے ہاتھ یکبا ری
نمازِ عشق کی ہم نے ادا کیا حسنِ نیت سے

اگر پُوچھے کوئی مجھ سے کہ کیوں دن رات نالاں ہے
تو میں کہدوں محبت ہے محبت سے محبت سے

برائے شوکتِ دنیا نہ لیجو عارِ دیں زاہد
سمجھیو شوکۃ العقرب کو بہتر ایسی شوکت سے

نمک ہو مشک ہو۔ یا سودۂ الماس تم چھڑکو
جراحت کو مرے کیا کام ہے سنگِ جراحت سے

پڑھو گر فاتحہ تم آکے مرقد پر شہیدوں کے
تو یاس اُٹھکر اشارہ کر دے انگشتِ شہادت سے

حریصوں کو نہیں جا۔ وسعت آبادِ قناعت میں
جو کھینچے ہاتھ کو وہ پاؤں پھیلائے فراغت سے

الف کو تیری قامت کے کیا استادِ قدرت نے
مزیّن صفحۂ ہستی پہ رعنائی کے خلعت سے

لبِ ہر زخم میرا ہے ہلالِ عید سے خوشتر
مجھے زخمی کیا ہے کس نے ابرو کی اشارت سے

بہت اچھا کیا مجھ کو کیا گر قتل قاتل نے
کہ ہو ویگانہ عاشق اب کوئی اُدر آ عبرت سے

علاجِ زخمِ حسرت ہے مرا تیزابِ تیغ اس کا
نہیں سنگِ فساں کچھ کم مجھے سنگِ جراحت سے

اگر آرائشِ ظاہر ہو بد باطن کو کیا حاصل
بھلا باطن میں تہ کیا ہے اسکو نیک طینت سے

ہوئی حرفوں میں گو یک نقطہ رحمت سے سوا زحمت
عدو میں ہے مگر رحمت زیادہ ہوتی زحمت سے

زبان ریختہ کر دی زباں اہلِ ولایت[1] کی،
محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

[1] حاشیہ کے لئے دیکھو صفحہ ۲۱۸ +

غزل مرقومۃ الذیل ابتدائی مشق کی ہے۔ ردیف کو دیکھو۔ عہد مذکور کا محاورہ سنائی ہے۔

ملنا ہمارا ان کا تو کب جائے جائے ہے
البتہ آدمی۔ سو کبھی آئے جائے ہے

جو اُس گلی میں مثلِ صبا آئے جائے ہے
فردوس میں کب اُسکو تمنائے جائے ہے

کہتے ہیں لوگ موت تو سب جائے جائے ہے
پر میرے پاس اسے بھی کوئی کھائے جائے ہے

ٹوٹا ہے کس پتنگ کا بازو کہ شمع بزم
یوں روغن اشک گرم سے ٹپکائے جائے ہے

لکھوا کے بھیج دیتا ہے اک پرچہ گاہ گاہ
دل کو ذرا ذرا مرے پرچائے جائے ہے

ابر مژہ برس کے اگر کھُل گیا تو کیا
نالہ تو وہ ہی آگ سی برسائے جائے ہے

فوارہ سے بجا ہے تواضع کا سیکھنا
اس سرکشی پہ سر کو وہ نہوڑائے جائے ہے

کیا حالِ جسمِ زار کہوں۔ سوزِ عشق سے
اک بال ہے۔ کہ آگ پہ بل کھائے جائے ہے

مضمونِ اضطراب کا ہے یہ بھی اک اثر
وہ مرغ نامہ بر کو جو پھڑکائے جائے ہے

تابوت تیرے کشتہ کو پینس سے کم نہیں
کیا پاؤں اپنے چین سے پھیلائے جائے ہے

سو کوس کیا نجا سکے مجنوں تو دو قدم
پر شوق مدعا ہے کہ دوڑائے جائے ہے

جبتک کہ جان تن سے نکل جائے گی نہ ذوق
دل میں جو درد ہے سو کوئی ہائے جائے ہے

کچھ نہیں چاہیے تجہیز کا اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورتِ سیماب مجھے

اُس نے مارا رُخِ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہیے جائے کفن چادرِ مہتاب مجھے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے

چمنِ دہر میں جوں سبزۂ شمشیر ہوں میں
آب کی جائے پلایا کرے ہیں زہراب مجھے

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا ہے القاب مجھے

سفرِ عمر ہے یا رب کہ ہے طوفانِ بلا
ہر قدم سیلِ حوادث کا ہے گرداب مجھے

۱ ۳۰۔۴۰ برس ہوئے کہ اہلِ ولایت مردِ تازہ ولایت۔ شمشیرِ ولایت۔ عناب ولایتی۔ مرد ولایتی۔ اور مرد ولایت زاد اور بلی ولایتی کہتے تھے۔ اور لوگ اس سے ولایت ایران سمجھتے تھے۔ اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں۔ دیکھو لفظ وہی ہے مفہوم بدل گیا۔ آزاد

جو مرے واقفِ جوہر ہیں وہ رکھتے ہیں عزیز
تیرہ بختی میں بھی جوں تیغِ سیہ تاب مجھے

کنجِ تنہائی میں دیتا ہوں دلاسے کیا کیا
دلِ بیتاب کو میں اور دلِ بیتاب مجھے

میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مدِّ نظر عشق کا آداب مجھے

ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہے سوا
لیوے اس طرح سے زانو کے تلے داب مجھے

ہو گیا جلوۂ انجم مری آنکھوں میں نمک
کیونکہ آئے شبِ ہجراں میں کہو خواب مجھے

گردشِ چرخ ہے اے ذوق مہندس کیلئے
آسماں اس کو نظر آتا ہے دولاب مجھے

تیر اُس نگہ کا گر دلِ مضطر میں گھر کرے
ناسورِ عشق زخم کے پھر گھر میں گھر کرے

کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے
انساں وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے

چشمِ سیہ تمہاری نظر بھر کے دیکھے جب
لالہ میں داغ دے گلِ عبہر میں گھر کرے

یوں میرے دل میں چبھتی ہے دنداں کی اُسکے تاب
ہیرے کی جوں کنی دلِ گوہر میں گھر کرے

گلگشتِ چمن نہیں کہ گئے صبح شام آئے
دل ہو کہ اُس کی زلفِ معنبر میں گھر کرے

دکھلائے جوشِ گریہ اگر میری چشمِ تر
مردم کے غرق سینکڑوں پل بھر میں گھر کرے

گنبد میں گردِ باد کے مجنوں نے گھر کیا
سرگشتہ ایسا کون کہ چکر میں گھر کرے

یوں رنگ رُخ پہ اُسکے جما ہے مرا خیال
جس طرح رنگ برگِ گلِ تر میں گھر کرے

خونِ شہیدِ ناز کو دھونا تھا کیا بھلا
یہ رنگ وہ نہیں ہے کہ خنجر میں گھر کرے

دُزدِ نگہ تو آنکھوں میں گھر کر رہے ہیں ذوق
دِل جس کا گم ہوا۔ کہو کس گھر میں گھر کرے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں۔ ابھی آئے ابھی چلے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں کھلاتا ذوق و شوق
سُن کر فغانِ قیس بجائے حدی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہی ہو،
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

لیا ایمان و دیں تو نے اگرچہ اک زمانے سے
نہیں اسپر بھی اے ظالم ترا ایماں ٹھکانے سے

مگر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کچھ بہانے سے

ڈھلیں گے شمع کے سانچے میں گذرے سر پہ جو گذرے
بہینگے آنسوؤں میں اُنکے آگے اِس بہانے سے

پڑے تسبیح زاہد پر نگاہ مست اگر تیری
تو ٹپکے بادۂ انگور اُسکے دانے دانے سے

تمھاری زُلف کے کوچوں میں پھرتا ہے وہ دیوانہ
پتا لینا ہو گر دل کا تو لینا اپنے شانہ سے

کہاں جاؤں گا اُڑ کر طائرِ بے بال و پر ہوں میں
قفس صیاد کا بہتر ہے مجھ کو آشیانے سے

نہ کیجو خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

جاں عشقِ لبِ جاں بخش پر۔ دل عشقِ خطِ مشکیں پہ ہے
عیسائی اپنے دیں پہ ہے۔ موسائی اپنے دیں پہ ہے

دے سین کی صُورت دکھا۔ تو ہنس کے دانت اپنے ذرا
یاسین کیا پڑھوا رہا۔ قاتل مرے بالیں پہ ہے

بُلبُل کا دل ہے خوں فشاں۔ ہیں عشق کی نیرنگیاں
سُرخیِ رنگِ گل کہاں۔ یہ دامنِ گلچیں پہ ہے

حرفِ زبانی ہو کہ خط۔ قول اُن کا سچ ہو یا غلط
میری تو اب تسکیں فقط۔ اے دل تری تسکیں پہ ہے

ہے خوشۂ انگور یا۔ کرتا ہے دل پر آبلہ ،

صد خندۂ دنداں نما۔ شب خوشۂ پرویں پہ ہے
دو جام مے بھر کر چڑھا۔ پھر دیکھ کیفیت ہے کیا
یہ خوب عینک حق نما۔ چشم حقیقت بیں پہ ہے
ہو کوہ کے چشموں سے وہاں۔ پانی نہ کیوں شیریں رواں
دی جان شیریں کھو جہاں۔ فرہاد نے شیریں پہ ہے
میں کیا کروں اظہار غم۔ ہے بار غم پر بار غم
دن رات اک انبارِ غم۔ میرے دلِ غمگیں پہ ہے
صیقل نہ ہو گر تیغ پر۔ جوہر یہ ہو کس کو نظر
اے ذوق یہاں قدر ہنر۔ آرائش و تزئیں پہ ہے

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے
تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے

لگے کیوں تم پہ مرنے ہم ابھی سے
لگایا جی کو اپنے غم ابھی سے

دلا ربط اُس سے رکھنا کم ابھی سے
جتا دیتے ہیں تم کو ہم ابھی سے

ترے بیمارِ غم کے ہیں جو غم خوار
برستا اُن پہ ہے ماتم ابھی سے

غضب آیا ہلیں گر اُس کی مژگاں
صفیں یاروں کی ہیں برہم ابھی سے

نہیں ہے دیر اگر جانے میں اُن کے
نہیں اپنے بھی دم میں دم ابھی سے

بہے آنسو تو دامن کیا کہیں گے
ہوئی ہے آستیں پُر نم ابھی سے

مرے لاشہ پہ بھی اُس بدگماں نے
کہا! کیوں جی! اُڑایا دم ابھی سے

تمھارا مجھ کو پاسِ آبرو تھا
وگرنہ اشک جاتے تھم ابھی سے

لگے سینہ جلانے مجھ کو آنسو
کہ ہو بنیادِ غم محکم ابھی سے

وہ شاید مینہ کھلے پر جائیں گے آج
کہ چھایا دل پہ ابرِ غم ابھی سے

نکلتے ہی دم اُٹھوا لیتے ہیں مجھ کو
ہوئے بیزار کیوں ہمدم ابھی سے

ابھی دل پر جراحت سو نہ دو سو
لے آئے دوست مرہم ابھی سے

کیا ہے وعدۂ دیدار کس لئے
کہ ہے مشتاق اک عالم ابھی سے

مُوا جانا مجھے غیروں نے اے ذوق
کہ پھرتے ہیں خوش و خرّم ابھی سے

حالت نشہ میں دیکھنا اس بے حجاب کی
ہر ناز سے ٹپکتی ہے مستی شراب کی

کوچہ میں آپڑے تھے ترے خاک ہو کے ہم
یہاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی

قاصد جواب جان مری دے چکی مجھے
پر منتظر ہے آنکھوں میں خط کے جواب کی

نکلے ہو میکدہ سے ابھی مُنہ چھُپا کے تم
دابے ہوئے بغل میں صُراحی شراب کی

اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقتِ مُوحق جناب کی

یہ دو غزلہ بھی آغازِ شباب کا ہے۔

قفلِ صد خانہ دِل آیا جو تو ٹوٹ گئے
جو طلسمات نہ ٹوٹے تھے کبھو ٹوٹ گئے

خارِ غم دل سے کسی طرح نہ نکلا اے عشق
ہو کے ناخن کئی سینہ میں فرو ٹوٹ گئے

چارہ گر سوزنِ تقدیر میں کچھ اور ہیں تار
جیب کے تار جو ہو ہو کے رفو ٹوٹ گئے

سینکڑوں کاسۂ سر دہر میں مانند حباب
کبھو اے چرخ بنے تجھ سے کبھو ٹوٹ گئے

تو جو کہتا ہے کہ دے غیر کو بھی ساغرِ مے
ہاتھ کیا اُسکے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے

دخترِ رز نے وہ انداز دکھائے سرِ بزم
رات یاروں کے وہاں غسل و وضو ٹوٹ گئے

کیونکہ بن کشتیٔ مے کیجے سیرِ دریا
میکشو زیرِ بغل اب تو کدو ٹوٹ گئے

دیکھکر سُرمہ کی تحریر تری آنکھوں میں
ہیں صنم خانوں میں زنّار گلو ٹوٹ گئے

تیرے ہاتھوں میں برنگِ گُل بازی آخر
بند بند اپنے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے

چشمِ مخمور کے اک جام میں سب یاروں کے
رات سر رشتۂ اعمالِ نِکو ٹوٹ گئے

تیر کھینچے بھی اگر چارہ گروں نے دل سے
تو کبھو چھوٹ گئے اور کبھو ٹوٹ گئے

کیا بیاں تم سے کروں زورِ شکستِ دل کا
کہ مری خاک سے بن بن کے سبو ٹوٹ گئے

مژۂ تر پہ اُمنڈ کر جو شب آئے آنسو
شدّت گریہ سے موئے سر مو ٹوٹ گئے

جذبِ عشق اپنا ہے کب چھوڑتا تیروں کو ترے
کھینچے بھی دل سے جو سوفار کبھو ٹوٹ گئے

گلشنِ عشق سے کیا بارور اللہ اللہ،
یہ ثمر لائے کہ سرو لبِ جو ٹوٹ گئے

کہہ یہ تبدیلِ قوافی غزل اک اور بھی ذوق
دیکھیں کس طرح سے ہٹلاتا ہے تو ٹوٹ گئے

کس کے موشانہ میں اے دستِ ہوس لُٹ گئے
تیرہ بختوں کے جو یاں تارِ نفس ٹوٹ گئے

رات جو شیشۂ مے تجھ سے عسس ٹوٹ گئے
ہائے نہ گنبدِ مینا کے کلس ٹوٹ گئے

دیدۂ آبلۂ پا یہ ہے مژگاں پیدا
پاؤں میں چبھ کے مرے خار زبس ٹوٹ گئے

ساقیا بادہ کشی میں کٹی ساری برسات
عہد و پیماں مرے سب اب کے برس ٹوٹ گئے

یاد آیا جو اسیرانِ قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے

رو نگئے یارب کے نبشتِ لبِ شیریں پہ نہیں
شہد پر بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے

تو گرفتارِ قفس گر یونہی تڑپے صیاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے

ذوق ہم ہو گئے گم ایسی ہوئی گم آوا نہ
آج کیا قافلہ کے سارے جرس ٹوٹ گئے

ہم اوّل ہی سے خود کو نابود سمجھے
کہ بانگِ ولادت کو مولود سمجھے

ہوا نالہ جب دودِ آلود سمجھے
کہ تھے عشق علوائے بے دود سمجھے

تری مانگ کی تیغ کا ہو جو زخمی
وہ بے زخم دل کو نمک سود سمجھے

خدا کی خدائی اگر آ گئے آئے
وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

جو کچھ آپ کو دل میں سمجھا وہ کافر
نہ فرعون سمجھے نہ نمرود سمجھے

ہمارا جو دل ہو گیا موم اُن پر
ہم اُلفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا دل کا بازارِ الفت میں سودا
زیاں کو ہم اے ذوق یہاں سود سمجھے

خط بڑھا۔ کاکل بڑھے۔ زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

تیرے جلوہ سے چمن میں رونق اے گلرو بڑھے
شاخ گلبن میں بڑھے گل۔ گل میں رنگ و بو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

ہاتھ ملنے کو جو مجنوں سے بڑھائے دشت میں
ضعف سے مدت میں جوں شاخِ سرِ آہو بڑھے

کہہ رہا ہے حسن کے دیواں میں خطِ پشت لب
ایک مطلع اور زیرِ مطلعِ ابرو بڑھے

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت دگرنہ پہلے آہ
ہاتھ کے ناخن بڑھے۔ سر کے ہمارے مو بڑھے

تجھ کو دشمن وہاں شرارت سے جو بھڑکاتے ہیں روز
چاہتے ہیں اور شرارے شوخِ آتش رو بڑھے

واہ ساقی کیا ہی دی ہے داروئے فرحت فزا
جس کے اک قطرہ سے پیریِ جسم میں لوہو بڑھے

یوں دمِ گریہ ہوا دل سے مرے نالہ بلند
جس روش پانی کے باعث سروِ آب جو بڑھے

حسن کیفیت سے ہو معمور اگر مینائے دل
پھر تو جامِ جم سے قدر کاسۂ زانو بڑھے

یہاں بڑھے دل کی طپش۔ اور وہ ہے غیروں کے ساتھ
گرمیِ صحبت تری اے شوخِ آتش خو بڑھے

چرخ پر نور قمر راتوں بڑھے راتوں گھٹے
حسن تیرا روز بر روز اے ہلال ابرو بڑھے

کچھ تپِ غم کو گھٹا کیا فائدہ اس سے طبیب
روز نسخہ میں اگر خرفہ گھٹے کا ہو بڑھے

چاہتا ہے دل بڑھے الفت کی اُن سے سمورا
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے

پیشوائی کو غمِ جاناں کی چشم و دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو اُن سے پیشتر آنسو بڑھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سُن نہ کیوں کر یہ تو بری سنائی

مجنون و کوہ کن کے سنتے تھے یار قصے
جبتک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی

جس بات پر تمھاری سب عشق میں ہم سے پوچھو
ہم کہویں آنکھوں دیکھی وہ سب سُنی سنائی

شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اُس سے
گالی کے ساتھ اُس نے اک اور بھی سنائی

کیا جانے کیا کہے گا کچھ کہنے کو ہے ناصح
دیتا نہیں مجھے تو اے بیخودی سنائی

کہنے نہ پائے اُس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کبھی سنائی آدھی کبھی سنائی

صورت دکھائے اپنی ۔ دیکھیں وہ کس طرح سے
آواز بھی نہ جس نے ہم کو کبھی سنائی

قیمت میں جنسِ دل کی مانگا جو ذوق بوسہ
کیا کیا پھر اُس نے ہم کو کھوٹی کھری سنائی

ہنگام بوسہ گرم جو وہ اک ذری ہوئے
شکر تو تھی ۔ پسینہ سے شکر تری ہوئے

بُت اِس بیاضِ چشم میں ہیں خطّ سرمہ سے
جو انتخاب نسخۂ افسوں گری ہوئے

دکھلائے ہم نے لیکے جو دامن پہ دُرِ اشک
قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے

اک حال زیرِ زلف سے ظاہر مرے لئے
اے یار سو طریقۂ بد اختری ہوئے

جل جائے خاکِ وحشیِ چشم بتاں پہ گھاس
لیکن ہرن[1] کھری نہ رہے بن ہری ہوئے

کچھ رہتے آدمیت اگر ہوسکے ۔ آدمی
یہ حور وش تو حور ہوئے یا پری ہوئے

ہم جیتے جی جہان سے معدوم ہو گئے
اتنے نظر سے گم بسبب لاغری ہوئے

رسوا نہ ہوتے کرتے نہ گر جیب و سینہ چاک
ہم آپ اپنی باعثِ پردہ دری ہوئے

مطلب نہ کفر سے ہے نہ اسلام سے ہے کام
دل دے کے اے صنم تجھے سب سے بری ہوئے

طالع ہوئے نہ اپنے سعادت سے ہم قریں
ہر چند سو قران مہ و مشتری ہوئے

اے ذوق آج سامنے اس چشم مست کے
باطل سب اپنے دعوئِ دانشوری ہوئے

غزل مرقوم الذیل پر نظر ثانی کی شماع نہیں پڑی ۔

اک صدمہ دردِ دل سے مری جان پر تو ہے
لیکن بلا سے یار کے زانو پہ سر تو ہے

آنا ہے اُن کا گرچہ قیامت پہ منحصر
ہم خوش ہیں یہ کہ آنے کی اُنکے خبر تو ہے

ہے سر شہیدِ عشق کا زیبِ سنانِ یار
صد شکر بارے نخلِ وفا بارور تو ہے

اے شمعِ دِل ہے رونے میں جلتا تو کیا ہوا
ہو جاتی رات اس میں بلا سے بسر تو ہے

[1] ہرن کھری ایک گھاس ہے اسکے پتے کی شکل ہرن کے سُم سے ملتی ہے اس لئے یہ نام پایا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشقِ چشم کے دل میں آگ لگ رہی ہے۔ قبر پر جو سبزہ اُگے گا جلجائے گا۔ ہاں ہرن کھری ضرور اُگے گی۔ کہ ہرن کی آنکھیں خوب ہوتی ہیں۔ اور یہ آنکھوں کے عاشق ہیں +

ہے دِل میں درد اگر نہیں ہمدرد میرے پاس
دلسوز اگر کوئی نہیں سوزِ جگر تو ہے

اسے دل ہجوم رنج و الم سے نہ تنگ ہو
خانہ خراب خوش ہو کہ آباد گھر تو ہے

اس بُت نے غائبانہ کہا یا نہیں کہا
چُپ ہوگیا وہ بارے مجھے دیکھکر تو ہے

تربت پہ دل جلوں کی نہیں گر چراغ و گل
سینہ میں سوزشِ دل و داغِ جگر تو ہے

کشتیٔ بحرِ غم مرے حق میں ہے تیغِ یار
کردیتی ایک دم میں ادھر سے اُدھر تو ہے

وہ دل کہ جس میں سوزِ محبت نہ ہووے ذوق
بہتر ہے اُس سے سنگ کہ جس میں شرر تو ہے

یہ غزل عنفوانِ شباب کی ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
بُتو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے

وہ خط جو لکھتے نہیں جز خطِ غبار مجھے
سمجھتے بارے کہیں اپنا خاکسار مجھے

نگہ نے اُس کی مجھے سخت بیقرار کیا
بلا سے مار دے آکر کوئی کٹار مجھے

جمالِ یار نے مُڑ کر بھی دیکھنے نہ دیا
پکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے

بھائے عشق میں ماہی سے تا بہ ماہِ فلک
دکھائی دیتے ہیں دہلائے داغدار مجھے

نظر جو لطف کی ہے روزِ حشر پر موقوف
تو کرنا کیا تھا نظر بند انتظار مجھے

عیاں ہے آئینہ رُخ پہ جب سے خطِ غبار
وہ خط ہیں لکھتے۔ مگر در خطِ غبار مجھے

ہوائے وادیٔ وحشت مجھے موافق تھی
دکھا رہے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے

نہ دیتا عشق اگر چشمِ اشکبار اے ذوق
جلا چکی تھی مری آہ شعلہ بار مجھے

لڑکپن کی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

ٹوٹے سینکڑوں تخجیر ہیں کیا یاد رہے
چیر دو سینہ میں دل کو کہ پتا یاد رہے

رات کا وعدہ ہے بندہ سے اگر بندہ نواز
بند میں دے لو گرہ تاکہ ذرا یاد رہے

قاصدِ عاشقِ سودازدہ کیا لائے جواب
جب نہ معلوم ہو گھر اور نہ پتا یاد رہے

دیکھ بھی لینا نہیں راہ میں اور کیوں صاحب
ہم سے منہ پھیر کے جانا۔ یہ بھلا یاد رہے

تیرے مدہوش سے کیا ہوش و خرد کی ہو اُمید
رات کا بھی نہ جسے کھایا ہوا یاد رہے

کشتۂ ناز کی گردن پہ چھُری پھیرو جب
کاش اُس وقت تمھیں نام خدا یاد رہے

خاک برباد نہ کرنا مری اُس کوچہ میں
تجھ سے کہہ دیتا ہوں میں باد صبا یاد رہے

گو ترنگ آئے تو چھاتی پہ قدم بھی رکھدو
کوئی بیدل اِدھر آئے تو پتا یاد رہے

تیرا عاشق نہ ہو آسودہ بزیر طوبےٰ[1]
خلد میں بھی ترے کوچہ کی ہوا یاد رہے

باز آجائیں جفا سے جو کبھی آپ تو پھر
یاد عاشق کو نہ کیجے گا بھلا یاد رہے

داغ دل پر مرے پھاہا نہیں ہے انگارا
چارہ گر لیجو نہ چٹکی سے اُٹھا یاد رہے

زخم دل بولے ترے دل کے نمکخواروں سے
لو بھلا کچھ تو محبت کا مزا یاد رہے

حضرت عشق کے مکتب میں ہے تعلیم کچھ اور
یاں لکھا یاد رہے اور نہ پڑھا یاد رہے

گر حقیقت میں ہے رہنا تو نہ رکھ خود بینی
بھولے بندہ جو خودی کو تو خدا یاد رہے

عالمِ حسن خدائی ہے بتوں کی اے ذوق
چلکے بت خانہ میں بیٹھو کہ خدا یاد رہے

چشم قاتل ہمیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

میرا خوں ہے ترے کوچے میں بہا یاد رہے
یہ بہا وہ نہیں جس کا نہ بہا یاد رہے

کشتۂ زلف کے مرقد پہ تو اے لیلیٰ وش
بید مجنوں ہی لگانا کہ پتا یاد رہے

خاکساری ہے عجب وصف کہ جوں آئنہ سوا
ہو صفا اور دل اہل صفا یاد رہے

ہو یہ لبیک حرم یا یہ اذانِ مسجد
میکشو قلقلِ مینا کی صدا یاد رہے

یاد اُس وعدہ فراموش نے غیروں سے بدی
یاد کچھ کم تو نہ تھی اور سوا یاد رہے

خط بھی لکھتے ہیں تو لیتے ہیں خطائی کاغذ
دیکھئے کبتک انہیں میری خطا یاد رہے

[1] حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۲۸

دو ورق ہیں کفِ حسرت کے دو عالم کا ہے علم — سبقِ عشق اگر تجھ کو دلا یاد رہے

قتلِ عاشق پہ کمر باندھی ہے ایدل اُس نے — پر خُدا ہے کہ اُسے نام مرا یاد رہے

طائرِ قبلہ نما بن کے کہا دل نے مجھے — کہ تڑپ کر یونہی مرجائیگا جا یاد رہے

جب یہ دیندار ہیں دُنیا کی نمازیں پڑھتے — کاش اُس وقت انھیں نام خدا یاد رہے

ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد — بھُول کر بھی کبھی ہووے تو وفا یاد رہے

محو اتنے بھی نہ ہو عشق بتاں میں اے ذوق — چاہیئے بندہ کو ہر وقت خدا یاد رہے

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے — کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اے اہلِ نظر عالمِ تصویر کو دیکھو — تصویر کا کیا دیکھنا تصویر میں کیا ہے

ہے شانہ کہ میرا دل دیوانہ ہے اُلجھا — معلوم نہیں زلف گرہگیر میں کیا ہے

پارہ کی جگہ کشتہ اگر ہو دل بیتاب — پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے

اے صید فگن کرتا ہے کیوں اتنی چھُری تیز — اب باقی بھلا اس ترے نخچیر میں کیا ہے

کچھ سلسلہ جنبانِ جنوں ہے ترا مجنوں — غُل دیکھ بپا خانۂ زنجیر میں کیا ہے

بیٹھا ہے درِ کعبہ پہ حیراں ترا شیدا — لبیک میں کیا ہوتا ہے تکبیر میں کیا ہے

صیاد عبث گرد ہے تو اسکے شب و روز — تو دیکھ تو۔ کچھ اس ترے نخچیر میں کیا ہے

ہے صیدِ نگہ کہتا قضا سے یہ تڑپ کر — اِس تیر میں کیا لطف ہے اُس تیر میں کیا ہے

یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے۔ نہ کھلے گا — کیا جانے دل عاشق دلگیر میں کیا ہے

خنجر ہے ترے ہاتھ میں اور ہم تہہِ خنجر — تاخیر ہو کیوں؟ فائدہ تاخیر میں کیا ہے

اُترا تھا گلے سے کہ جگر ہو گیا ٹھنڈا — کیا جانے اُس آبِ دمِ شمشیر میں کیا ہے

زاہد کی طرف دیکھو نہ تم میرے دمِ ذبح — لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے

لہ اُس وقت خطائی کا کاغذ بھی عمدہ کاغذوں میں تھا۔ غنیمت ہے۔ اب کشمیری تو باقی ہے۔ ۷۰-۸۰ برس کی عمر میں دنیا کی حالت ایسی بدل گئی ہے۔

ذوق اس لب شیریں کا جو تو وصف ہے کہتا
کیا کہیئے حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

پری رو کیا ستمگر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
و لیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے

وہ حبب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
صبا کے جھو کے یہاں وقت سحر ایسے نہ ہوتے تھے

کسی کی نندقیں یاد آگئیں ہیں ورنہ مژگاں پر
نمایاں قطرۂ خون جگر ایسے نہ ہوتے تھے

جو دیں ہیں گالیاں اُس بد زباں کو آج کیا کہیئے
کبھی نادم ہم اسکو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے

خدنگ عشق کھا کر زخم دل فرہاد کے باہم
لگے کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے

سفر ہے اب کہ جان کا حضرت دل بیٹھے حیراں ہیں
پریشاں ورنہ جوں گرد سفر ایسے نہ ہوتے تھے

کتاب دل شرار عشق سے ہے جل اُٹھی شاید
کہ مضموں سوز دلکے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے آبلوں میں آب ہے یا آبداری ہے
کہ پہلے خار صحرا تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر دل پہ تھے گذرے
مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے

زمانہ میں ہیں سنتے شور مدت سے قیامت کا
پر اس قامت سے ہے جو ہیں شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے شعر سن کر ذوق جیسے بزم عالم میں
ہوئے قائل ہیں اب اہل نظر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ کھینچو عاشق تشنہ جگر کے تیر پہلو سے
نکالے پر ہے مثل ماہی تصویر پہلو سے

نہ لے اے ناوک افگن دلکو میرے چیر پہلو سے
کہ وہ تو جا چکا ساتھ آہ کے جوں تیر پہلو سے

دل سیپارہ کو لے ٹانک تعویذوں میں ہیکل کے
نہ سرکا یہ حمائل لے بت بے پیر پہلو سے

وہ ہوں بے دست و پا بسمل بسا ئی حیث ہاتھ آئی
کیا تا پائے قاتل از نہ شمشیر پہلو سے

اسیر زلف دیوانے ہیں دیکھ اے پاسباں شبکو
دبا کر بیٹھ اُن کے پاؤں کی زنجیر پہلو سے

مصور لیلیٰ و مجنوں کی نا کامی پہ حیراں ہیں
کبھی بیٹھا نہ ملکر پہلوئے تصویر پہلو سے

یہ دل لب تشنۂ تیغ یار کا ہے رات بھر کرتا
صدائے العطش جوں نالۂ شبگیر پہلو سے

عجب حسرت کا عالم تھا کہ مجنوں کہتا تھا پیہم
چھٹے پہلو مرے محمل کا یا تقدیر پہلو سے

نہ کہنا استخواں ان کو یہ عالم لاغری کا ہے
کہ ہے دکھلا رہا میرا دلِ دلگیر پہلو سے

خیالِ ابروئے جاناں نہیں دل بھولتا اک دم
سپاہی ہے جدا کرتا نہیں شمشیر پہلو سے

تمام اہلِ سخن بزمِ سخن میں ذوقؔ حیراں ہیں
ملا جو قافیہ تو نے کیا تحریر پہلو سے[۱]

برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی
کچھ جو خاکستر بچا آندھی اُڑا کر لے گئی

اُس کے قدموں تک نہ بیتابی بڑھا کر لے گئی
ہائے دو پلٹے دیئے اور پھر ہٹا کر لے گئی

ناتوانی ہم کو ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر لے گئی
چیونٹی سے چیونٹی دانہ چھڑا کر لے گئی

صبحِ رُخ سے کون شامِ زلف میں جاتا تھا آہ
اے دلِ شامت زدہ! شامت لگا کر لے گئی

خون سے فرہاد کے رنگیں ہوا دامانِ کوہ
کیوں نہ موجِ شیریہ دھبا چھڑا کر لے گئی

تم نے تو چھوڑا ہی تھا اے ہمرہانِ قافلہ
لیکن آوازِ جرس ہم کو جگا کر لے گئی

نوکِ مژگاں جب ہوئی سینہ فگاروں سے دوچار
پارہ ہائے دل سے گلدستہ بنا کر لے گئی

دیکھی کچھ دل کی کشش لیلیٰ کہ ناقہ کو ترے
سوئے مجنوں آخرش رستہ بھلا کر لے گئی

وہ گئے گھر غیر کے اور یہاں ہیں دم بھر کے بعد
بدگمانی ان کے گھر سو گھر پھرا کر لے گئی

واہ اے سوزِ دروں کوچہ میں اُس کے برقِ آہ
رات ہم کو ہر قدم مشعل دکھا کر لے گئی

جو شہیدِ ناز کوچہ میں تمہارے تھا پڑا
کیا کہوں تقدیر اُسے کیونکر اُٹھا کر لے گئی

دشت وحشت میں بگولا تھا کہ دیوانہ ترا
روحِ مجنوں بہرِ استقبال آ کر لے گئی

آگ میں ہے کون گر پڑتا مگر پروانہ کو
آتشِ سوزِ محبت تھی جلا کر لے گئی

اے پری پہلو سے میرے کیا کہوں تیری نگاہ
دل اُڑا کر لے گئی یا پر لگا کر لے گئی

ذوقؔ مرجانے کا تو اپنے کوئی موقعہ نہ تھا
کوئے جاناں میں اجل ناحق لگا کر لے گئی

عالمِ شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہیں پڑھی تھی

۱ لڑکپن کا کلام ہے مگر یہ پہلو جس طرح بیٹھا ہے جاننے والے ہی جانیں گے اللہ کی قدرت ہے جسکو جب چاہے دیدے

ان کی شاگردی کا نمونہ ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

حذر قم سے وصفِ جبیں ہے صنم پرے | برحق ہے شاخ سدرہ سے لوح وقلم پرے
رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے | قامت کہے ہے شورِ قیامت کو تھم پرے
کہتا ہے کس کو ناز سے تو دمبدم پرے | تو دو قدم کہے ہیں رہوں سو قدم پرے
بسمل ترے تڑپ کے بھی پہنچے نہ پاؤں تک | یا دو قدم ورے رہے یا دو قدم پرے
کیوں گرم اضطرار ہے اسدرہ اے شرر | ہستی سے کتنی دور ہے ملکِ عدم پرے
پھر کر ہمارے کعبۂ دل میں غزالِ یار | کہتے ہیں دیکھو رہیو غزالِ حرم پرے
قاتل جو تیرے ہاتھ میں پٹی ہو زہر کی | مرہم کو زخمِ دل سے اٹھا رکھیں ہم پرے
ہے موجِ ریگ ہاویہ کیا۔ ایک گام میں | ہونگے سوار کشتیٔ نقشِ قدم پرے
یارب کدھر کو جائے یہ جانبازِ دردوغم | باندھے کھڑی ہے چار طرف فوجِ غم پرے
اتنا بھی دم نہیں ہے کہ تیرا مریضِ غم | سرکے نظر سے صورتِ نقشِ قدم پرے
شب گھر پہ اُن کے غیر نے تو آلیا تھا پر | دیوار، بام پر سے چڑھتے ہم کہ دھم پرے

ق

کچھ اپنی شرحِ سوزِ دل بیقرار آج | آیا تھا جی میں بیٹھ کے کیجے رقم پرے
اللہ رے اضطراب کہ جوں آتشیں قلم | ہاتھوں سے جا پڑا مرے چھٹ کر قلم پرے
یہ کیا شبِ وصال۔ کہ دونوں بہم تو ہیں | پر ہم سے وہ ہیں بیٹھے پرے اُنسے ہم پرے
کعبہ نہیں۔ یہ کعبۂ دل ہے مقامِ دوست | رہنا ذرا یہاں سے طوافِ حرم پرے
تم آؤ گر تو آؤ۔ نہیں مجھ کو تو بلا | گھر سے تمھارے گھر ہے مرا کئی قدم پرے
برگشتہ بخت وہ ہوں کہ پھر جائے ناز سے | مژگاں تک اُس کی آکے نگاہِ کرم پرے
میں نے کہا جو اُن سے نکلتا ہے میرا دم | بولے خدا کے واسطے رکھئے یہ دم پرے
دیکھو نہ جاؤ حضرتِ دل زلفِ یار میں | رستہ نہیں ہے آپ کے سر کی قسم پرے

کرتا ہے کیا مسافتِ منزل کا فکر ذوق
ہے اب تو یہاں سے ملکِ عدم دو قدم پرے

ذکرِ مژگاں یار جس کے روبرو نکلا کرے
اسکے بے نشتر رگِ جاں سے لہو نکلا کرے

گر فغاں اچھا نہیں تو چپ بھی رہنا ہے بُرا
کچھ تو سینہ کا بخار اے دل کبھو نکلا کرے

لائے گر بادِ صبا اس زلفِ مشکیں کی شمیم
شمع کے گل سے گلِ شبّو کی بُو نکلا کرے

دیکھے میرے آنسوؤں کی آبداری کو اگر
آب دریا سے گہر بے آبرو نکلا کرے

چشمِ مستِ یار اگر دکھلائے تاثیرِ نظر
تا قیامت پھر دلِ آہو سے ہُو نکلا کرے

اے صنم پیدا کرے جو دل میں تیری آرزو
پھر نہ اُس کے لب سے حرفِ آرزو نکلا کرے

خطِ مشکیں کا تمہارے وصف اگر کیجے رقم
خطِ مشک افشاں قلم سے مو بمو نکلا کرے

حضرتِ دل ہم تو جب جانیں کرامت آپکی
کھا کے دھکّے روز اس گھر سے عدو نکلا کرے

تیرے ترکِ چشم کو گر شوقِ خونریزی نہ ہو
باندھکر تلوار کیوں اے جنگجو نکلا کرے

خدمتِ پیرِ مغاں سے لو وہ دارو چلکے ذوق
نشۂ مے جس سے بے جام و سبو نکلا کرے

یہ غزل بھی عالمِ شباب کی ہے۔ طرح مشاعرہ میں لکھی تھی۔

خمِ ابروئے تراؔ جب یار نظر آتا ہے[لہ]
کوئی کھینچے ہوئے تلوار نظر آتا ہے

جب ترا شعلۂ رخسار نظر آتا ہے
سرِ خورشید کا بازار نظر آتا ہے

گھر میں جو روزنِ دیوار نظر آتا ہے
چشمِ افعی مجھے بے یار نظر آتا ہے

مست چشم اس کا جو میخوار نظر آتا ہے
ہے تو دیوانہ پہ ہشیار نظر آتا ہے

کیا تمھیں اے اولوالابصار نظر آتا ہے
یہاں تو اغیار میں بھی یار نظر آتا ہے

ضعف سے تارِ تنِ زار نظر آتا ہے
سر مرا تن پہ گرانبار نظر آتا ہے

سبزۂ خطِ گلِ رُخسار یہ اک عالم ہے
خطِ ریحاں خطِ گلزار نظر آتا ہے

معنیٔ رنگ خموشی سے جو دل ہو آگاہ
برگِ گل میں لبِ اظہار نظر آتا ہے

جتنا بیہوش ہوا اتنا ہی سوا ہو آرام
مست ہاتھی ہو تو بے یار نظر آتا ہے

لہ خط تری مانگ کا جب یار نظر آتا ہے ۔

زلف کے دام میں ہے مرغِ دل آتا ہیں یاد
جب کوئی مرغ گرفتار نظر آتا ہے

خواب غم میں بھی ہے آرام اگر آ جائے
ہے وہ بیچین جو ہشیار نظر آتا ہے

آنکھ اٹھا کر تو ذرا دیکھ کہ زیر افلاک
جو ہے سرکش وہ نگوں سار نظر آتا ہے

میرے رونے پہ جو ہے دیدۂ سوزن روتا
تار اک آنسوؤں کا تار نظر آتا ہے

صید بیکس پہ ترے کون ہے کہتا تکبیر
یہ تو ہوتا یوں ہی مردار نظر آتا ہے

تیرے مجنوں کو ہے سامان جنوں آرائش
داغ سودا گلِ دستار نظر آتا ہے

ہے غضب سرمہ نے چمکایا تری آنکھوں کو
آج فتنہ ہمیں بیدار نظر آتا ہے

بارِ احساں ہے صبا کا بھی سر نکہت گل
کون گلشن میں سبکبار نظر آتا ہے

خنجر موج تبسم سے ترے گلشن میں
دیکھا ہر گل کو دل افگار نظر آتا ہے

میری آنکھوں میں نظر آتا ہے عالم ویراں
دل کا ویرانہ جو بے یار نظر آتا ہے

عالمِ دل میں کبھی آ کے فلک کو دیکھو
کیا لبِ پردۂ زنگار نظر آتا ہے

ہائے اے دست جنوں تار نفس چھوڑ دیا
تن پہ تو مجھ کو نہیں تار نظر آتا ہے

بڑھ کے جو چمکا زمانہ میں دکھائی دیا کم
روز کب اخترِ دُمدار نظر آتا ہے

جو جوانمرد علائق میں پھنسا ہے وہ مجھے
شیر پنجرے میں گرفتار نظر آتا ہے

دیکھ کر اے بت مغرور یہ انداز ستم
شرم سے چرخ نگوں سار نظر آتا ہے

کاٹنے دوڑتا ہے گھر جو نہیں وہ گھر میں
حلقۂ در دہن مار نظر آتا ہے

دلِ پُر وسوسہ کا عقدہ ہے قفلِ وسواس
اس کا کھلنا مجھے دشوار نظر آتا ہے

مژدہ اے آبلہ پائی کہ پھر آنکھوں میں مری
دامن وادیٔ کہسار نظر آتا ہے

کم نمائی سے ہوا اے ماہ لقا عید کے چاند
کہ برس میں کبھی اک بار نظر آتا ہے

دل نے ہے دیکھ لیا دفتر تقدیر تمام
فلک اک نقطۂ بے کار نظر آتا ہے

چشم ساقی نے یہ میخانہ میں پھیلایا کفر
گردن شیشہ میں زنار نظر آتا ہے

صحبت اہل صفا دیتی ہے سرکش کو الٹ
نخل پانی میں نگوں سار نظر آتا ہے

تنگ جو زیست سے ہیں تختۂ تابوت نہیں
مر کے اک تخت ہوا دار نظر آتا ہے

دُرِّ مضموں ہیں ترے ذوقؔ زبس بیش بہا
کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے

دکھلا نہ خالِ ناف تو اے گلبدن مجھے
ہر لالہ یاں ہے نافۂ مشکِ ختن مجھے

ہمدم! وبالِ دوش نہ کر پیرہن مجھے
کانٹا سا ہے کھٹکتا مرا تن بدن مجھے

پھرتا لئے چمن میں ہے دیوانہ پن مجھے
زنجیر پا ہے موجِ نسیمِ چمن مجھے

تسبیح دورِ بزم میں دیکھو امام کو
بخشی ہے حق نے زیبِ سرِ انجمن مجھے

اے میرے یاسمن[1] ترے دندانِ آبدار
گلشن میں ہیں رُلاتے گلِ یاسمن مجھے

محرابِ کعبہ جب ہے ترا خمِ کماں
صیدِ حرم سمجھتے ہیں ناوک فگن مجھے

ہے تن میں ریشہ ہائے نئے خشک استخواں
کیوں کھینچتا ہے کانٹوں میں اے ضعفِ تن مجھے

اے لب مسی کو پھینک کہ نیلم ہے کم بہا
یاقوت دے دیا کوئی لعلِ یمن مجھے

ہوں شمع یا کہ شعلہ خبر کچھ نہیں۔ مگر
فانوس ہو رہا ہے مرا پیرہن مجھے

اک سرزمینِ لالہ بہار و خزاں میں ہوں
یکساں ہے داغِ تازہ و داغِ کہن مجھے

خسرو سے تیشہ بولا جو چاٹوں نہ تیرا خون
شیریں نہ ہووے خونِ سرِ کوہکن مجھے

رُخ پر بھارے دام جو ڈالا ہے سبزہ نے
آتا نظر ہے دیدۂ عنقا دہن مجھے

یہ دل وہ ہے کہ کر دے زمیں آسماں کو خاک
اک دم کو برق دے جو پہنا پیرہن مجھے

کوچہ میں تیرے کون اٹھا لیتا بھلا خبر
شب چاندنی نے آ کے پہنایا کفن مجھے

دکھلاتا آسماں سے ہے اُوٹے زمیں کی سیر
اے رشکِ ماہ تیری جبیں کا شکن مجھے

رکھتا ہے چشمِ لطف۔ یہ کس کس ادا کے ساتھ
دیتا ہے جام ساقیٔ پیماں شکن مجھے

ہے جذبِ دل درست تو چاہِ فراق سے
کھینچے گی تیری زلفِ شکن در شکن مجھے

---

[1] اس شعر کو پڑھ کر ایک دن فرمایا کہ ایسے موقع پر اب تک زبان اُردو کے شاعر اسے رشکِ یاسمن کہتے ہیں۔ مگر خیر یہ بھی ایک انداز نکلا۔ ہو گیا تو ہو گیا۔ رہا تو رہا ۱۲

دکھلاتا اک ادا میں ہے سو سو طرح بناؤ
اس سادہ پن کے ساتھ ترا بانکپن مجھے

جیسے کوئیں میں ہو کوئی تارا چمک رہا
دل سوجھتا ہے یوں تہِ چاہِ ذقن مجھے

آکر اسے بھی دو کبھی آنکھیں ذرا دکھا
آنکھیں دکھا رہا ہے غزالِ ختن مجھے

آ اے مرے چمن کہ ہوا میں تری ہوا
صحرائے دل ہوائے چمن در چمن مجھے

یارب یہ دل ہے یا کہ ہے آئینۂ نظر
دکھلا رہا ہے سیر و سفر در وطن مجھے

آیا ہوں نور لے کے میں بزمِ سخن میں ذوق
آنکھوں پہ سب بٹھائیں گے اہلِ سخن مجھے

یہ غزل بھی آغازِ شباب کی ہے۔ مضمونِ مطلع بھی گواہی دیتا ہے۔

مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے
کہدو ہم سے نہ کوئی دے کے نشانی مانگے

اے صنم دیکھ کے ہر دم کی تری کم سخنی
موت گھبرا کے نہ کیوں یہ خفقانی مانگے

خاک سے تشنۂ دیدار کے سبزے جو گھٹے
تو زباں اپنی نکالے ہوئے پانی مانگے

مار پیچاں تو بلا ہیگا مگر تو اے زلف
ہے وہ کافر کہ نہ کاٹا ترا پانی مانگے

دہنِ یار ہو اور مانگے کسی سے دل کو
وہ جو مانگے تو باندازِ نہانی مانگے

دل مرا بوسہ پہ پیغام نہیں ہے ہمدم
یار لیتا ہے تو لے اپنی زبانی مانگے

جلوہ اُس عالمِ معنی کا جو دیکھے اے ذوق
لطفِ الفاظ نہ لے حسنِ معانی مانگے

نہ دیں گواہی جو داغِ کہن نہیں دیتے
دکھائی کیا مرے تن پر چمن نہیں دیتے

جفا میں بات وہ کیا حکمتاً نہیں دیتے؟
کہ دردِ جاں ہمیں اب زخمِ تن نہیں دیتے

جو بولوں کچھ تو مجالِ سخن نہیں دیتے
سیئوں بھی ہیں تو وہ سینے دہن نہیں دیتے

سحر ہے روز دکھاتا نئی چمک خورشید
دکھا اُسے مرا داغِ کہن نہیں دیتے

ہیں منع کر رہے رونے کو یہ جو ناداں دوست
بجھانے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

یہ پڑ گئیں تنِ لاغر میں جھریاں ہیں مرے
کما تنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

شہیدِ ناز کے جہلم یہ ہے نظر شاید
کہ سرمہ آنکھوں میں کم جان بن نہیں دیتے

اجل ہے پوچھتی پھرتی مرا پتا یار دو[1]
بتا اُسے مرا بیت الحزن نہیں دیتے

عدم کی راہ میں بھی کچھ تو ہے خطر کا گذر
کہ ساتھ لینے بجز یک کفن نہیں دیتے

جو مانگا آبِ دمِ تیغ اُس سے بسمل نے
تو بولا۔ زخمی کو اے خستہ تن نہیں دیتے

بیانِ شیخ جو ہے وصفِ حور و شعلۂ طور
ذرا دکھا اُسے اپنی پھبن نہیں دیتے

وہ تیر کھینچے ہے پہلو سے کہدے اے دل زار
کہ ہے نشانیٔ ناوک فگن نہیں دیتے

ہوا اُن کی زلف سے کیا زخم دل کو چشم امید
لگا بھلے کو وہ مشک ختن نہیں دیتے

پڑے ہیں دامنِ کہسار و دامنِ صحرا
ترے شہید کو دو گز کفن نہیں دیتے

زباں حلاوتِ اُلفت کا لے مزہ کہ نہ لے
لب اپنی حد سے گذرنے سخن نہیں دیتے

پلا یا زہر۔ دکھایا ہے مے کا پیما نہ
یہ دھوکے اے بت پیماں شکن نہیں دیتے

سنبھال ناخن وحشت کو اب تو دست جنوں
کہ سینے یہ مرا چاکِ کفن نہیں دیتے

گلوں سے بن چکے جب دونوں ہاتھ گلدستہ
تو بولے **ذوق** جلا تن بدن نہیں دیتے

اے صنم ہجر میں ہم جیتے بھلا پتھر تھے
سینہ تھا ہاتھ تھا سر اپنا تھا یا پتھر تھے

وہ بھی دن یاد ہیں جب کوئے صنم میں اے دل
بستر خاک تھا اور تکیہ کی جا پتھر تھے

دلِ مجروح نے جو کھائے جنوں میں پتھر
اس کو وہ سنگ جراحت سے سوا پتھر تھے

پوچھا اُس بت نے تو نکلی نہ زباں سے اک بات
حضرتِ دل وہاں کیا بار خدا پتھر تھے

جن دلوں نے ہے کیا چور مرا شیشۂ دل
اے بتو دل تو نہ تھے وہ۔ بخدا پتھر تھے

عمر بھر کھاتا رہا سرد وذدوں کے دشنام
اس شجر سے مری قسمت کے سدا پتھر تھے

کون ہمدم شب غربت میں تھا بیکس کا ترے
یا تو سناٹا تھا یا دیتے صدا پتھر تھے

تھے دل سنگ میں جب تک تو رہے قطرۂ خوں
تاج شاہی میں لگے لعل تو کیا پتھر تھے

[1] یہ غزل بھی شاہ نصیر مرحوم کے عہد کی ہے اُستاد مرحوم کی آخر عمر جان من اور یار و غزلیت کے دائرہ سے نکل گئے تھے ۱۲

خاک اُس زیست پہ جب سنگ درِ اُسکے نہوئے
مر کے ہم خاک ہیں جیتے تھے تو کیا پتھر تھے

میرے نالوں نے تو پتھر سے بہائے چشمے
اے بُتو تم ہی پسیجے نہ ذرا۔ پتھر تھے

کعبۂ عشق کا اے ذوق کیا ہم نے طواف
آئینہ خاک تھی اور سنگ صفا پتھر تھے

دل کے مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے
اب تو کنکر ہیں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

مر کے گر خاک ہیں تو چھاتی پہ پتھر ہی دھرا
کھاتے گلیوں میں جو پتھر تھے تو کیا پتھر تھے

تاج شاہی میں جگہ پائی تو کیا ہاتھ آیا
اور دھرے گر ترے در پر تھے تو کیا پتھر تھے

کہہ نہ بت خانہ میں اے شیخ بتوں کو دل سنگ
وہاں ترے کعبہ کے اندر تھے تو کیا پتھر تھے

کتنا رویا ہوں ولیکن نہ پسیجے وہ سنگ
سنگدل گر نہ ستمگر تھے تو کیا پتھر تھے

ساقیا خاک ہے گر شیشۂ دل میرا تو کیا؟
اور بلوریں ترے ساغر تھے تو کیا پتھر تھے

سنگدل وہ رہے اے ذوق صداحق میں مرے
غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی
وہیں معلوم کروں ہونٹ ہلائے تو سہی

سنگ پر سنگ ہر اک کوچہ میں کھائے تو سہی
پر بلا سے ترے دیوانے نے کھائے تو سہی

گر جنازہ پہ نہیں قبر پہ آئے وہ مری
شکوہ کیا کیجئے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی

کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے
پاؤں کاٹوں گا انگوٹھے کو جمائے تو سہی

پارہ مصحف دل تھے ترے کوچہ میں پڑے
آئے پاؤں کے تلے شکر کہ پائے تو سہی

آکے غرفہ میں نہ بیٹھے تو نہ بیٹھے وہ شوخ
روزن در سے ذرا آنکھ لڑائے تو سہی

گہ گھٹاتا ہے گہے مہ کو بڑھاتا ہے فلک
پر شب ہجر کو ہم دیکھیں گھٹائے تو سہی

کروں اک نالہ سے میں حشر برپا سو حشر
شور محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی

تھے تمھیں نکلے جو اُس دام بلا سے اے ذوق
ورنہ تھے پیچ میں اُس زلف کے آئے تو سہی

یہ غزل بھی اُسی زمانہ کی ہے۔

خیال دل میں پری نہ لاؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے
تم آئے آؤ نہیں نہ آؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

یہ دل ہے آئینہ تم ہو صورت نہیں ہے یہاں نام کو کدورت
کسی کو گھر میں بلا بٹھاؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

خلل بنائے مکاں کو پہنچے تو ہوگا نقصاں مکیں کو پہلے
مکاں کو دل کے نہ تم گراؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

غلط ہے تہمت ہے افترا ہے کہ ہم نے دل اور کو دیا ہے
کسی کے کہنے پہ تم نہ جاؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

گئی ہے رات اب بہت زیادہ کدھر کا کرتے ہو تم ارادہ؟
نہ گھر کے جانے کی اب سناؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

تم اپنے رُخ میں ہو کر رہے دن ہو زلف میں شب کے عقدے گن گن
ہزار دل سے ہمیں بھلاؤ۔ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

مکانِ دیدہ پسند خاطر اگر نہیں ہے کہ ہوں گے ظاہر
تو خیر تشریف تم نہ لاؤ۔ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

تم اس کو دو داغ مثل لالہ دیا کرو بیٹھکر اُجالا
بگاڑو تم اس کو یا بناؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

یہی زباں سے ہے ذوق کہتا تمھارا ہے دھیان اسمیں رہتا
جُدا مکاں اور کیوں بناؤ۔ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

متفرقاتِ یا

زباں پیدا کروں جوں آسیا سینہ میں پیکاں سے
دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

اُڑائے خوب گلچھرّے نکل مجنوں نے زنداں سے
برستے پھول ہیں سر پہ شرارِ سنگِ طفلاں سے

فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہمسر چشمِ فتّاں سے
گرا تھا یہ بھی اشکِ سرمہ آلود اُسکی مژگاں سے

چمکتی ہے سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ باراں سے
لگے گی ابرِ رحمت کی جھڑی اب چشمِ گریاں سے

یہاں تک ناتواں ہیں ہم گذر جائیں اگر جاں سے
اُٹھائے مور لاشہ کو ہمارے دستِ مژگاں سے

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیِ دوراں سے

سب کو دنیا کی ہوس خوار لئے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لئے پھرتی ہے

پھرتا[1] سرگشتہ زمانہ میں بھلا کیوں خورشید
ہوس گرمیِ بازار لئے پھرتی ہے

وہ مرے اخترِ طالع کی ہے وُہ اژدوں گردش
کہ فلک کو بھی نگوں سار لئے پھرتی ہے

کر دیا کیا ترے ابرو نے اشارہ قاتل
کہ قضا ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے

جا کے پھرتا نہ تھا اکبار جہاں۔ وہاں مجھکو
بیقراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

کون وقت اے وائے گذرا جی کو گھبراتے ہوئے
موت آتی ہے اجل کو یہاں تلک آتے ہوئے

آتشِ خورشید سے اُٹھتا نہیں دیکھا دھواں
آ کھڑے ہو بام پر تم بال سکھلاتے ہوئے

وہ نہ جاگے رات اور یاں ضد سے بختِ خفتہ کی
بچ گیا آخر گجر زنجیر کھڑ کاتے ہوئے

چاک آتا ہے نظر پیراہنِ صبحِ بہار
کس شہیدِ ناز کو دیکھا ہے کفناتے ہوئے

---

[1] در بدر پھرتا نہ سرگشتہ جہاں میں خورشید

پیشوائی کو بڑھے گر کشش دل آگے
دوڑے مجنوں کی طرف ناقہ سے محمل آگے

جائے اسطرح سے اُس کوچہ میں ہیں دل اور ہم
دل سے ہم آگے کبھی۔ ہم سے کبھی دل آگے

گرچہ ہے وادیٔ عنقا سے پرے سو سو قاف
لیک ہے گم شدگی کی ابھی منزل آگے

تجھ سا ناقص بھی غنیمت ہے اب اسوقت میں ذوق
کاملیت ہے کہاں ہو چکے کامل آگے

ناقص کا صفا کیش سے مطلب نہ بر آئے
جو کور ہو عینک سے اُسے کیا نظر آئے

فردوس میں ذکر اُس لب شیریں کا گر آئے
پانی دہن چشمۂ کوثر میں بھر آئے

بتخانہ میں گر آہ کروں عشق صنم سے
ناقوس کا دل آبلہ کی طرح بھر آئے

ممکن نہیں کم ہووے تپ سوزِ محبت
جوں شمع مجھے لاکھ پسینا اگر آئے

نعل جب شکلِ مہ نو ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے

بوسہ کے مانگتے ہی پھیرنے چتون کو لگے
ایسے کیا لعل لب غیرت گلشن کو لگے

آشیاں ہو جیو مرغان ہوا کا برباد
بند کرنے تری دیوار کے روزن کو لگے

زاہد کو اگر صدق و صفا بھی ہے تو کیا ہے
بے درد اگر دل بہ خدا بھی ہے تو کیا ہے

آزار محبت کا مزا کیا کہوں جس کی
ہے درد دوا۔ دیکھو دوا بھی ہے تو کیا ہے

سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود
اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے

گر رُخ کا بوسہ دیتے نہیں لب کا دیجئے
ہے وہ مثل کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی

فرہاد! ضرب تیشہ سے ہے سخت ضرب غم
سچ پوچھئے تو چوٹ ہمیں نے کڑی سہی

تم دو گھڑی کو آؤ تو ہیں لب پہ جان کو
ٹھیرا رکھوں کہ اور بھی یہاں دو گھڑی سہی

کیا وہ دنیا جس میں کوشش ہو نہ دین کیواسطے
واسطے واں کے بھی کچھ یا سب ہیں کے واسطے؟

خوں کے دریا بہہ گئے عالم تہہ و بالا ہوئے
اے سکندر کس لئے؟ دو گز زمیں کے واسطے؟

ذوق عاصی ہے پر اسکا خاتمہ کیجو بخیر
یا الہٰی اپنے ختم المرسلیں کے واسطے

سوز دل سے مرے نالے جو شرر بار ہوئے
مدعی جل گئے اچھا ہوا فی النار ہوئے

ٹکڑے اُڑ جائیں قفس کے تو اُڑینگے نہ کبھی
ہم ہیں صیاد کی الفت کے گرفتار ہوئے

چمن دل سے ہوئے کم نہ گل لخت جگر
دو اگر خشک ہوئے اور ہرے چار ہوئے

لڑکپن کی غزل تھی۔ ۳۔ شعر یاد رہ گئے۔

چھپا کے پھولوں میں منہ صبا سے جو مسکرائے سحر کلی ہے
تبسم اُس گل کا یاد کر کے عجب ہوئی دل کو بے کلی ہے

تپش دکھائی جو میں نے دل کی تو لوٹا پروانہ داغ کھا کر
دکھایا تم نے جو روئے روشن تو شمع محفل میں کیا جلی ہے

بناؤ للہ چوب صندل سے میرا تابوت اے عزیزو
کہ قتل مجھ کو کیا کسی نے دکھا کے رنگ اپنا صندلی ہے

فرماتے تھے ہمارا لڑکپن تھا۔ مشاعرہ میں طرح ہوئی ہم نے بھی غزل لکھی تھی۔

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ مقرر جائینگے
آگے جائیں پیچھے جائیں جائینگے پر جائینگے

لیکے جب زیر زمیں ہم دیدۂ تر جائینگے
خشک ہیں جتنے کوئیں پانی سے سب بھر جائینگے

ابر رحمت ہے بجھے اسدم لگادے تو جھڑی
کہتے ہیں جانے کو وہ دیکھیں تو کیونکر جائینگے

لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے۔ ۴ شعر ہی یاد تھے۔

گر درد ہے کھونا دل مضطر ہے کسی کے
پانی تو پلا وار کے سر پر سے کسی کے

دل بس میں پڑا اُس کے کہ جو بس میں نہ آیا
جادو سے نہ ٹونے سے نہ منتر سے کسی کے

اللہ کرے یاں ہمیں پیوند زمیں کا
جب وصل ہو بستر ترا بستر سے کسی کے

جو دل نہ کشمکش طُرّہ دوتا میں پڑے
تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے

ہوائے سایۂ طوبےٰ نہیں ہے مستوں کو
رہیں گے تاک کے نیچے کہیں ہوا میں پڑے

بُتوں کے دزدِ نظر سے ہے دل مرا نالاں
یہ چور وہ ہیں کہ جو خانۂ خدا میں پڑے

ایک کلکِ آہ بس ہے شرح غم کے واسطے
کون نیزے واسطی ڈھونڈے قلم کے واسطے

سر تو ہے تن پر مرے تیغ ستم کے واسطے
پر لگا رکھتے ہیں وہ جھوٹی قسم کے واسطے

تم بیٹھے بغل میں جو رقیب و غلی کی
کی گرم بغل ہم نے بھی گور بغلی کی

اے ذوق نہ کر نور میں آمیزش ظلمت
کیا کام بترہ کا محبت میں علی کی

مقابل اُس رُخ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

وہ دل میں رکھتا ہوں میں آہِ آتشیں اے ذوق
کہ برق دیکھے تو فی النار والسقر ہو جائے

اسیری پر تری مرتا ہوں آخر ہی لڑکپن سے
جدا تن سے ہوئی گردن نہ اُترا طوق گردن سے

مجھے گہوارہ بھی تھا کشتیٔ طوفاں زدہ آسا
رہا جوں طفل اشک آفت رسیدہ میں تو بچپن سے

یاں لگ چکے سب ہیں دل و جان ٹھکانے
اب تک نہیں کافر ترا ایمان ٹھکانے
کیا جانے خبر لایا ہے کیا واں سے کہ قاصد
آتے نہیں تیرے نظر اوسان ٹھکانے

مرے حسن عمل سے معصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ۔ توبہ استغفار کرتی ہے
اگر انسان قانع ہو تو ہے اکسیر سے بہتر
ہوا و حرص لیکن اسکی مٹی خوار کرتی ہے

ہم ہیں غلام اُنکے جو ہیں وفا کے بندے
اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے
مت بھول بندگی پر غرہ ہیں آکے بندے
زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

ہم بتوں کو اپنے جذب دل سے کھینچے جائینگے
پر بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائینگے
دیکھیں تو کب تک نہیں کرتے ترے دل میں اثر
ہم بھی نالے اپنے جذب دل سے کھینچے جائینگے

کام لیجے گا کہیں اور ہی دانائی سے
ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے
کیونکہ عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار
چار آنکھیں ہوئیں کچھ قوت بینائی سے

کون سے دن نگہ تیز نہ خونریز رہی
مجھ پہ ظالم تری ہر روز چھری تیز رہی
آتش عشق تو ہے گلشن جنت کی ہوا
یاں مگر آتش دوزخ سے بھی کچھ تیز رہی

ہم کو کیا یاں راہ پر ہے کوئی یا گمراہ ہے
اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے
کیا بشر مانند یوسف کیا بشر ہاروت وار
عشق کے ہاتھوں سے ہو جاتا اسیر چاہ ہے

عزیزو ناقۂ لیلیٰ کے دیکھو گے شتر غمزے
اگر ملجائے گی مجنوں کو خدمت ساربانی کی

کہاں ہم۔ اور کہاں غم ہیکشو نکو غم سے کیا نسبت
مگر اے حضرت دل آپ نے یہ مہربانی کی

یہ دو شعر سب سے اخیر کا کلام ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ حافظ ویران نے کئی دن پہلے کہا تھا کہ حضرت اس محاورے کو کیونکر باندھیں۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بیماری کا تیسرا دن تھا۔ فرمایا۔ حافظ تم نے اس دن کیا کہا تھا پھر یہ دو شعر پڑھے اور مجھے کہا لکھ لو یادداشت میں۔

رہے خاطر نہ بے شغل محبت کیونکہ بند اپنی
کلید قفل دل فریاد ہے مثل سپند اپنی

زمیں کیا ہے فلک پاؤں کے نیچے سے نکلجائے
ہماری خاک پر دکھلا دو رفتار سمند اپنی

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے
فلک کے پاؤں تلے سے زمیں نکل جائے

ستم نے سیم تنوں کے کیا ہے ناک میں دم
الٰہی تن سے مرا دم کہیں نکل جائے

اُٹھاتا عشق کی کیوں اے دلِ ناداں جوکھوں ہے
ابھی تو مال جوکھوں ہے پر آگے جان جوکھوں ہے

بیش اکرام سے ساری کرامت ہے یہی
عادت بد ترک کر تو خرق عادت ہے یہی

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سودے میں مال و جاہ کے
طفل مکتب بنتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے

سجدہ کو جاتے ہوئے یوں پیر پشت خم دیکھے
سرا کو جیسے تھکا اونٹ دمبدم دیکھے

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندہ کی کیا چوری

رہی اس طرح بعد از مرگ دنیا کی ہوس نا کی | شرابی کر کے توبہ جس طرح ہو جائے تریا کی

راتوں کو نہ ہُو حق کر اے شیخ مناجاتی | سوتے ہوئے چونکیں گے رندانِ خراباتی

کیا ہم سخن کرتا ہے اُس گل کے دہن سے | غنچہ سے یہ کہدو کہ پَٹخ جائے چمن سے

قطعہ قطرہ آنسو جس کے طوفاں طوفاں شدّت ہے
ٹکڑے ٹکڑے دل جو پڑا ہے تودہ تودہ حسرت ہے

جسے ہم چاہتے ہیں وہ بت گمراہ بھی چاہے | ہمارے دل نے تو چاہا مگر اللہ بھی چاہے

کل کے جو وصل کے عالم ہیں نظر میں پھرتے | آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ہم اور غیر یکجا دونوں بہم نہ ہونگے | ہم ہونگے وہ نہ ہونگے وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

جنوں کے دست مبارک ہیں پیرہن کو لگے | رہا بھی تار نہ باقی کہ جو کفن کو لگے

لاشے کو دفن کیجے میرے کہ پھینکدیجے | مردہ بدست زندہ جو چاہئے سو کیجے

معلوم ہوا بینیٔ و ابروئے بتاں سے | اک تیر ہے گویا کہ چڑھا ہے دو کماں سے

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیرے مارا نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمید ہے | نا اُمیدی سے مگر آرام کی امید ہے

اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے | لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

باقی ہے دل میں شیخ کے حسرت گناہ کی | کالا کرے گا منہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

عیاں ہے اشک کی گرمی ہویدا سوزشِ دل ہے | کہ آتا اپنا اشکِ سوختہ مانندِ فلفل ہے

درد دل سے لوٹتا ہوں میرا اسکو درد ہے | میں ہوں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے

دل گرفتار ہوا یار کی عیاری سے | ہم گرفتار ہوئے دل کی گرفتاری سے

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی | آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

جس در پہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی
عقل سحر اُس در پہ تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

رازِ درونِ زمزم سے کسے اس پردہ میں آگاہی ہے
یوں تو ہر اک زعم میں اپنے افلاطون الٰہی ہے

وہ لعلِ شیریں کسی کے دل کی الٰہی کیا ہو گیا دوا ہے؟
کہ میٹھا میٹھا سا درد کل سے مرے کلیجہ میں ہو رہا ہے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے | خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

اب ہے جا زیرِ مغیلاں ترے دیوانوں کی | مدتوں چھان چکے خاک بیابانوں کی

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے | یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

رات جوں شمع کٹی ہم کو جو روتے روتے | بہہ گئے اشکوں میں ہم صبح کے ہوتے ہوتے

کوئی جو اُس کو پڑھ کر عاشق کا خط سُنائے | اک حرف مدعا پر سو بے نقط سُنائے

لاشے کے ساتھ بھی نہ مری قبر تک چلے | ہوتے ہی اذنِ عام کے گھر کو کھسک چلے

نہیں ہچکی یہ ہچکی شام سے اکدم ٹھہرتی ہے | ترے بیمارِ غم کو موت شاید یاد کرتی ہے

ناخن سے منقار کی سیرے داغِ جنوں کو زاغ کھجائے
عشق یہ تیری خطرت ہے تو سر سہلائے بھیجا کھلائے

چاہئے زر اِن بتانِ سیم تن کے واسطے | یاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کے واسطے

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے | ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی | ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی

مصروف چارہ دیکھا کیا چارہ گر کو میرے | مرچیں سی لگ رہی ہیں زخمِ جگر کو میرے

مٹی سے اپنی مٹی جو تربت میں مل گئی | جو کچھ کہ تھی مراد محبت میں مل گئی

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے | ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

لال کتاب اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے | میکدہ اپنے واسطے مدرسۂ فرنگ ہے

کیا تاب دل جلوں سے جو برق لاگ رکھے | دوزخ بھی ہو تو اُن کی جلوں پہ آگ رکھے

کرے کعبہ میں کیا جو سر بتخانہ سے آگہ ہے | یہاں تو کوئی صورت بھی وہاں اللہ ہی اللہ ہے

ہمیشہ کام مجنوں کو رہا صحرا نوردی سے | بسایا خانۂ زنجیر ہم نے پائے سرزی سے

جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے | کہ میں صورت ہوں وحشت کی وہ یونہی اک ہیولا ہے

خاک اُڑاتا دشت میں جب نہ سودائی پھرے | پھر بگولا تو ہے کیا آندھی بھی بولائی پھرے

جہاں دنیا میں دیکھا پہلے کے اوپر جھوٹ لائق ہے | کہ پہلے صبح کاذب ہے تو پیچھے صبح صادق ہے

ذکر کچھ چاکِ جگر سینے کا سُن سُن اپنے	کرکے ہیں ضبط ہنسی دیکھوں ہو ناخن[۱] اپنے
بیمار۔ غم جو اُس کا کھا کر زمین دیکھے	خوش خوش وہ مقبروں کی جا کر زمین دیکھے
کترے پر رکھنے میں صیاد یہ اغماض کہ ہائے	ملتی اسیر کفِ افسوس ہے مقراض کہ ہائے
وحشت اگر پتنگ کو ہوویگی داغ سے	زنجیر گھر کے ڈالیں گے دو دِ چراغ سے
تری عمر دو روزہ غافل اک تیلی ہے دو کل کی	کہ اک کل روز آخر کی ہے اک کل روز اوّل کی
دکھانے کو نہیں ہم مضطرب حالت ہی ایسی ہے	مثل ہے رو رہے ہو کیوں کہا صورت ہی ایسی ہے
پہلے بتوں کے عشق میں ایمان پر بنی	پھر ایسی آ بنی کہ مری جان پر بنی
جو تیرے ناخن پا پیر امائل دھو کے پی جاوے	تو اُسکے دست و پا پھر ماہِ کامل دھو کے پی جاوے
جس طرح ماہ سارے ستاروں میں ایک ہے	یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

[۱] کتب تصوف میں لکھا ہے کہ جب انسان کو بہت ہنسی آئے تو ناخنوں کو دیکھنے لگے۔ ہنسی تھم جائے گی سبب اس کا یہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدمؑ بہشت سے نکلے تھے تو ان کا جسم مبارک ایسا صاف اور روشن تھا جیسے ناخن دنیا میں آکر بدلنا شروع ہوا اور اولاد کا رنگ بدلتے بدلتے ایسا ہوگیا کہ ظاہر ہے۔ جب انسان ناخنوں کو دیکھتا ہے نورروحانی آگاہی سے دل متنبہ ہوتا ہے۔ اور افسوس میں ہنسی جاتی رہتی ہے ۱۲ استاد رحمۃ اللہ علیہ

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے | تیری خاطر سے اجل تجھ سے فراموش ہوئے

قسمتِ برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادہر | سو بھی آکر تا سرِ مژگاں حیا سے پھر گئی

اس شعر پر خاتمہ اُن کا اور اُن کی شاعری کا ہو گیا۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا | کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

۱۸۳۹ء میں بادشاہ کا ایک بیٹا مرزا الٰہی نام ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں مرگیا حسین بھی تھا اور بادشاہ کو بھی اُس سے بہت محبت تھی۔ رنج ہوا۔ اور ایسا ہوا کہ کئی ہفتہ تک شعروں میں ٹپکتا رہا۔ انھیں دنوں میں اُستاد مرحوم ایک دن قلعہ سے پھرتے ہوئے والد مرحوم کے پاس آئے۔ مجھے یاد ہے اول بادشاہ کے ملال طبع کا حال بیان کیا پھر ایک مطلع سُنایا۔ کہ اُسی وقت غزل درست کرکے آئے تھے۔

گل کچھ تو اُس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے | وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کملا کے جھڑ پڑے

پھر کہا ردیف مناسب مقام نہیں اور ذرا سوچ کر آپ مطلع پڑھا۔ اور خود کتاب یادداشت میں لکھ دیا۔

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے | حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یا اللہ کیا دقت تھے اور کیا کیا موقع پیش آتے تھے۔ پھر فرمایا حضور کا ایک قطعہ بھی ابھی درست کرکے آیا ہوں۔

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسبِ حال | دیکھے تماشے ہیں نے جو ملک وجود کے

اک دن وہ تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے | پھر یہ ہوا گھنڈ نے لگی کھیل کود کے

اب حال یہ ہے عالم پیری ہیں اے ظفر

باقی نہیں حواس بھی گھنٹ وشنود کے

کئی دن کے بعد جو پھر آئے، فرمایا۔ قلعہ سے آتا ہوں۔ مرزا شاہ رُخ[1] آج کہنے لگے بھئی اُستاد میں نے مولوی صاحب کو حضور کا وہ قطعہ سُنایا تھا۔ اُنھوں نے کہا شنود نہیں شنید چاہیئے۔ اُسی وقت مجھے شعر یاد آیا۔ میں نے کہا مولوی صاحب سے تعجب ہے کہ ایسا کہا ہو۔

گر عشق نہ بودے و غم عشق نبودے — چندیں سخن نغز کہ گفتے و شنودے

مطلع مرقوم الذیل میں خدا جانے بادشاہ کو کیا پسند آگیا تھا۔ اُستاد فرماتے تھے کئی دفعہ حضور نے اس کے مضمون کو ہیر پھیر کرکے لینا چاہا۔ ہم نے ہر دفعہ اپنے مطلع کا پہلو بچا دیا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اُستاد نے ایسا کیا ورنہ ان کا یہ طریقہ نہ تھا۔ میں نے ایک دفعہ سبب بھی پوچھا۔ فرمایا خدا جانے جب ہوا کچھ ایسا ہی خیال ہوگیا۔

کیا کہوں اس ابروئے پیوستہ کے دل میں ہے — ایک طعمہ مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے

ایک دن فرمایا کہ ہمارا عالم شباب تھا۔ ایک بزرگ کہن سال نے کسی بڑے اُستاد شاعر کا مطلع سنایا۔

آبلے دکھلائے جب۔ اس دل رنجور نے — دانتوں میں تنکا لیا خوشۂ انگور نے

ہمارے چشمۂ طبع میں لہر آئی اور اسی وقت یہ مطلع ہوا۔

اشک کے قطرے جو مژگاں پر اکٹھے ہو گئے — خوشۂ انگور کے بھی دانت کھٹے ہو گئے

اس زمانہ کے لوگ بڑے باانصاف ہوتے تھے سُنکر بہت تعریف کی۔

قطعہ

کہوں کیا دق احوالِ شب ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تب غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے

[1] مرزا شاہ رخ بادشاہ کے ایک بیٹے ولیعہد وقت سے چھوٹے تھے۔ وہ مولوی امام بخش مقتول کے شاگرد تھے۔ اُن سے فارسی پڑھا کرتے تھے۔

یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں ہیں اور کہاں یہ شب مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا اس ظلمت کے پردہ میں کیے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سنکر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی ہائے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خود ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

کل اک تارکِ دنیا سے میں نے پوچھا ذوق — کہ تو اُکھڑ کے اِدھر سے ادھر ہوا پیوست
گذرتی ہوگی بآرام زندگی تیری — کہ تجھ کو اب نہ غمِ نیست ہے نہ شادیِ ہست
کہا یہ اُس نے کہ قیدِ حیات میں انساں — کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مستِ الست
اُٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں — کہ با فراغ کرے کنجِ عافیت میں نشست

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دُنیا کی — تو سلسلہ میں فقیری کے وہ ہُوا پابست
رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں — کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقام عالی پر — کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
جو دستگاہ تصرف میں بھی ہوئی اُس کو — تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالا دست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی — کہ نفس دشمن سرکش ہے اُسکو دیجے شکست
جو ہوشیار رہے تو ہے وہ شرع کا پابند — پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی — مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کرکے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ — گیا زباں سے نکل اُسکی جیسے تیر از شست

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدۂ زہمہ۔ با خدا گرفتار است

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگا رنگ ہم — مثل نرگس جب تلک ہے اس چمن میں چشم وا
آخرش ہوگا وہی اکدن خزاں کے ہاتھ سے — جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا
ہے غنیمت کوئی دم نظارۂ رنگ بہار — پھر کہاں یہ گلشن اور گل۔ اور سبزہ یہ ہوا
در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت — ایں تماشائے جہاں را مفت مے بینیم ما

رباعیات

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا — ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا۔ ہوا کرم سے تیرے — جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اعلیٰ جو علیؑ کی ہے امامت کا مقام — رکھتے ہیں خبر اُس سے یہاں خاص نہ عام
جو لوگ صف اوّل میثاق میں تھے — پوچھے کوئی اُن سے کہ وہ کیسا تھا امام

سبطینِ نبیؐ یعنی حسنؑ اور حسینؑ
زہراؑ و علیؑ کے دونوں وہ نورالعین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لئے
اے ذوقؔ لگا آنکھوں سے انکے نعلین

دل کو سرِ بازارِ جہاں کر نہ اُچاٹ
جس طرح بنے سود و زیاں میں دن کاٹ
اے ذوقؔ فلک کے جب ہیں بارہ حصّے
سودا ہو نہ کیونکر یہ فلک بارہ باٹ

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کے پیسے
سب کہتے تھے اُن کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوقؔ
پوچھا نہ کہ تھے وہ کون ایسے ویسے

اے ذوقؔ کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
اک دم نہ ترا صرف مناجات ہوا
جب تک تھا جوان تھا جوانِ بدمست
اب پیر ہوا پیر خرابات ہوا

آنکھ اُس کی نشہ میں جب گلابی ہو جائے
صوفی اسے دیکھے تو شرابی ہو جائے
دکھلائے جو وہ روئے کتابی اے ذوقؔ
سب مدرسہ کافر کتابی ہو جائے

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھِل کھِل
اب درد سے ہیں وہی رُلاتے ہِل ہِل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے
اے ذوقؔ بڑھاپے سے ہے دنتا کِل کِل

اے ذوقؔ فرشتے ہیں یہ کہکر روتے
اے کاش کہ انسان ہی ہم بھی ہوتے
غفلت میں یہ رہتا ہے یہانتک ہشیار
شیطاں کے چلا دیتا ہے سوتے سوتے

ان آنکھوں سے روئے لالہ گوں بھی دیکھا
اور پھر ان کو برا شک خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھے نہ رنگ ہم نے اے ذوق
یوں بھی دیکھا جہاں ہیں ووں بھی دیکھا

دُنیا کے الم ذوق اٹھا جائیں گے
ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائیں گے
جب آئے تھے روتے ہوئے آئے تھے
اب جائیں گے اوروں کو رولا جائیں گے

دل جن کا ہے آہن کی طرح سخت سیاہ
وہ لطفِ سخن سے نہیں ہوتے آگاہ
بداصل کو کیا نام خدا کوئی بتائے
ہندوق کا طوطا نہ کہے حق اللہ

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی
دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

مشکل ہے یہاں پائے خرد کا جمنا
اس وحشیٔ رم دیدہ کو کیسا رمنا
ہم پیروِ عشق۔ عشق اپنا ہادی
جو عشق کہے ذوق۔ کہو سلمنا

کھلتا نہیں اے ذوق یہ ہم پر مضموں
ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتوں
کہئے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے
کل حزب بمالدیھم فرحون

اے زاہدو تم سے کیا جھگڑ کر لوں میں
غصہ سے کروں کس لئے دل کو خوں میں
میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے؟
تم ہو تم ہو۔ جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

ط رباعی مرقومہ حاشیہ میں نے ایک دن اُستاد مرحوم کے سامنے پڑھی اور کہا کہ حضرت اس میں وہ گرمی اور تیزی اور صفائی نہیں جو آپ کی زبان کا جوہر ہے فرمایا کاٹ دو۔ میں نے کہا مضمون تو بہت خوب ہے۔ فرمایا۔ رباعی کی بحر میں تو یہی ہو گا۔ اچھا قطعہ کر دیتے ہیں۔

دنیا سے ذوق رشتۂ الفت کو توڑ دے	جس سر کا ہے یہ بال اُسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو نہ چھوٹے گا اس پیرِ زال کو	یہ پیرِ زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعوےٰ ہے کمال	غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُنکا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر	نقل کرتا ہے مسلمان کی کافر نقال

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق	ہے بُرا وہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے	کیوں بُرا کہنے سے تو اُس کے بُرا مانتا ہے

قدم سنبھال کے رکھ راہ عشق میں اے ذوق	گذرنا اس رہِ دشوار سے نہ آساں ہے
جو کوئی آبلۂ پائے مور بھی ہے یہاں	ترے ڈبونے کو وہ بھی تنورِ طوفاں ہے

نذر دیں نفس کس کو دُنیا دار	واہ کیا تیری کارسازی ہے
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق	مالِ موذی نصیبِ غازی ہے

ط۔ رباعی مرقومہ ذیل دیوان مروج مطبوع میں مولفوں کی بے خبری سے درج ہو گئی تھی۔ الحمد للہ کہ جو اس پر اصلاح ہوئی۔ بندہ آزاد کو یاد تھی۔ ایسی اصلاحیں ان کی ہمیشہ جاری تھیں۔

اے ذوق کرے گا کوئی دُنیا کیا ترک	دنیا ہے بڑی بلا ارے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دُنیا	جب تک نہ کرے آپ سے دنیا ترک

دل سے میں اپنے رسولِ عربی کا ہوں غلام
میں حضوری میں رہوں انکی نہ کس طرح مدام
دل کہو۔ جان کہو۔ جاہئیں اس بات کو سب
ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیش عرب

ایک دوست کا چند اشخاص سے کچھ تنازعہ تھا۔ اُستاد کے مزاج میں سلامت روی اور صلح جوئی بہت تھی۔ دوست کو مجبور کر کے صلح کرادی۔ اور اس قطعہ سے اس کی بھی دلجوئی فرمائی۔ گویا اس کی زبانی کہتے ہیں۔

ناصحا مجھ کو ملامت تو نہ کر
سبکہ مجھ کو عشقبازی کا ہے ذوق
کس طرح میں عشق سے بیزار ہوں
کیا کروں میں ذوق سے ناچار ہوں

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشدزادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے اُن کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا کہکر زرنگار کاغذ پر لکھکر ایک سونے کی کشتی میں رکھکر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گذرانا۔

خوش ہوا ے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حُسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ چھینے ترا المبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہربار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رُک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تابِ گرانباریٔ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرہ کو ملاحظہ فرمایا۔ تو مقطع کو دیکھکر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔
اُستاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ استاد اسے تو دیکھو! اُنھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہدو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا۔ کہ ابھی کہدو۔ اور کہا۔ مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سُبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش ہے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھر لی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھولدے مُنہ کو جو تو منہ سے اُٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو

دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اُسی وقت اُنھیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے اداشناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور۔ ہو گیا کچھ اور۔ یہ قطعہ لکھکر حضور میں گذرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
قسمت بُری سہی پہ طبیعت نہیں بُری
صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ

اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مثنوی

نواب حامد علی خاں مرحوم نے عاشقانہ موقع پر ایک شوقیہ خط کی اُستاد مرحوم سے فرمائش کی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں ایسے کاموں کے لئے کب فرصت دیتی تھیں۔

مگر اتفاق کہ انہی دنوں میں ماہِ رمضان آگیا اور بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس چمن کی ہوا کھانے کو اپنا دل بھی چاہتا تھا۔ انھوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کر دیا۔ اور کئی دن میں ۳۰۰ شعر ہو گئے۔ لیکن ادھر ماہِ رمضان ہو چکا۔ ادھر بادشاہ نے پھر غزلیں شروع کر دیں مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر طبیعت میں اُمنگ اُٹھی۔ مگر ایک دن کبھی دو دن۔ ۲۰۔ ۲۵ شعر ہوئے پھر رہ گئے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا تو اکثر اس کا ذکر کیا کرتے اور کہیں کہیں کے شعر بھی پڑھا کرتے۔ میرے بار بار کہنے سے اُسے نکالا تو دیکھا کہ تین تختیاں مشق اطفال کی تھیں۔ دونوں طرف سے سیاہ تھیں۔ اور کچھ کاغذی مسودے تھے تختیاں اکثر جگہ سے پڑھی بھی نہ جاتی تھیں۔ فرصت کے وقتوں میں وہ سوچ سوچ کر بتاتے گئے میں لکھتا گیا۔ ۵۰۰ شعر سے زیادہ ہوئے۔ نامہ ناتمام تھا۔ مگر ایک ایک مصرع ریزۂ جواہر تھا۔ میرے صاف کئے ہوئے جزو بھی اُنہی غزلوں میں تھے۔ جو میں خلیفہ صاحب کے ہاں جا کر صاف کیا کرتا تھا سب کے ساتھ وہ بھی گئے۔ اس کا نام نامۂ جانسوز تھا۔ اول حمد و نعت تھی۔ پھر ساقی نامہ پھر القاب معشوق۔ اسی میں اس کا سراپا۔ اس کے بعد یادِ ایامِ وصل۔ اس میں چاروں موسموں کی بہار۔ معنوں کی نزاکت۔ لفظوں کی لطافت۔ ترکیبوں کی خوبیاں۔ اندازوں کی شوخیاں۔ کیا کہوں۔ سامری کا جادو اس کے آگے دھواں ہو کر اُڑتا تھا۔ چند متفرق شعر دیوان مطبوعہ میں ہیں۔ چند شعر مجھے یاد تھے۔ یکجا لکھدیتا ہوں کہ جو یادگار رہ جاوے وہی غنیمت ہے۔

مثنوی

چاہیئے نام اُسی کا اے خامہ	زینتِ نامہ زیبِ سر نامہ

ہے فلک اک نمونہ قدرت کا / یا قلمداں ہزار صنعت کا
رُخِ قرطاس کو صفائی دی / اور سیاہی کو روشنائی دی
دیا قمری کو مصرع نالا / مصرع قدِ سرو بر بالا
کی عطا نو خطوں کو کلکِ ادا / کیا عاشق کو تختۂ مشقِ جفا
نمک افشاں ہے عشق شور انگیز / زخمِ دل کرتے ہیں بریز بریز
عکس ہے سبزۂ لبِ جو کا / وسمہ قوسِ قزح کے ابرو کا
آئے گلشن میں فصلِ گل سو بار / بلبلیں ہوں ترانہ سنج ہزار
ساقیا جلد اُٹھ درنگ نہ کر / عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر
طاق سے تو اُتار لے شیشہ / طاق پر رکھ کتاب اندیشہ
شیشۂ مے کی یہ دراز زباں / اور پھر یہ ستم کہ پنبہ دہاں
میں ہوں مانند ساغر لبریز / جاں بلب جاں بلب کو کیا پرہیز
جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے / پاؤں توبہ کے لڑکھڑانے لگے
ق
کردے یا نشک مجھے نشہ میں چور / تاکہ مانندِ خوشۂ انگور
دل کے سارے پھپھولے پھوڑوں میں / نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں
شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی / نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
بسترِ رنج و کنجِ تنہائی / رات کیا آئی اک بلا آئی
شام سے حال ہے یہ صبح تلک / نہیں لگتی مری پلک سے پلک
کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور / کیا شفق نے کھلا دیا سیندور
گر لکھوں خط میں بیقراریٔ دل / نامہ بر ہو کبوتر بسمل
مضطرب اب جو ہو رہا دل ہے / دل ہے یا مرغِ نیم بسمل ہے
دل کی وا شد کی کیا کروں تدبیر / غنچۂ گل ہے غنچۂ تصویر
جانِ بیتاب جیسی بجلی برق / وہ بھی گرمِ رہِ فنا کالبرق

نبضیں چھوٹی ہوئیں غشی طاری
ایک فرقت ہزار بیماری

دل سے رخصت ہے تاب و طاقت کی
بیقراری لے استقامت کی

ہوس سیرِ باغ ہے کس کو
دل ہے کس کو دماغ ہے کس کو

کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر
سگِ دیوانہ بن گیا ہے گھر

اب ہو یک لخت دل کہ ہو صد لخت
تن بتقدیر سنگ آمد و سخت

ہو چکی دل کی اپنے عشق میں خیر
رہوں دریا میں اور مگر سے بیر

ماہِ بے مہر بلکہ دشمنِ مہر
ہر ستم میں ستم شریک سپہر

برق کا وہ ذرا چمک جانا
اور بغل میں ترا دبک جانا

فتنۂ استاد نرگسِ فتاں
گردِ مژگاں ہجوم شاگرداں

رُخ تعالےٰ و زلف صلِّ علیٰ
قد وہ سُبحان ربیَّ الاعلےٰ

زلفِ جنباں میں رُخ کی بُرّاقی
کرے مشّائیوں کو اشراقی

گو انا ربکم نہ مُنہ سے کہے
لیک جاری زبان ہر ہُو سے

مچھلی بازو کی یا ہے دو الفین
غرقہ کش بحرِ خوں سے مردمِ عین

کمرِ ناف از پئے دلِ زار
رشتۂ کار و عقدۂ دشوار

رنگِ پاں لعل روح افزا پر
خون ثابت کرے مسیحا پر



قصیدہ نمبر ۱

نظر ثانی سے نور نہیں پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔

سحر جو گھر میں بشکل آئینہ۔ بھا میں بیٹھا۔ نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ۔ حور طلعت۔ بشکل بلقیس و ماہ کنعاں
پری کی صورت۔ چمن کی رنگت۔ گر اس کا شیوہ۔ تو اُس کا جلوہ
زبان شیریں۔ بیان رنگیں۔ کلام رنداں۔ خرام مستاں
انیس خلوت۔ جلیس جلوت۔ حریف حکمت۔ ظریف صحبت
بہ بزم یاراں۔ بدل بہاراں۔ باہل عزلت۔ گلے بداماں
حسیں بشکل و مہ منور۔ عرق کے قطرے ہیں اُس میں اختر
ہلال ابرو۔ نگاہ جادو۔ خدنگ مژگان و چشم فتاں
بروئے رنگیں۔ نگار بستاں۔ شگوفہ خنداں۔ مگر نہ خنداں
بموئے پیچاں۔ ہے عشق پیچاں۔ جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں
وہ گوش پر زیب کج کلاہی۔ جو دیکھو بینی تو یا الٰہی۔
دہن میں غنچہ۔ لبوں میں گلبرگ و۔ روئے روشن میں مہر تاباں
نگاہ ساغر کش بتماشا۔ بیاض گردن۔ صراحی آسا
وہ گول بازو۔ وہ گوری ساعد۔ و پنجہ رنگیں بخونِ مرجاں
کمر نزاکت سے لچکی جائے۔ کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اُس پہ سو نور لہر کھائے۔ پھر اُس پہ ہیں دو قمر فروزاں
وہ ران روشن۔ وہ ساق سیمیں۔ وہ پائے نازک حنا میں رنگیں
وہ قد قیامت وہ فتنہ قامت۔ دلوں پہ شامت جو ہو خراماں
جو نام پوچھا۔ کہا خوشی ہوں۔ جو وصف پوچھا۔ تو دلبری ہوں

سبب جو پوچھا۔ تو ہنس کے بولا۔ کہ ذوق تو بھی عجب ہے ناداں
وہ شاہ جو ہے۔ محمد اکبر۔ جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوس جشن اس کا ہے فلک پر۔ اُسی کے پرتو ہیں سب یہ ساماں
یہ سنتے ہی میں نے بالبداہت۔ لکھا وہ مطلع شفق شباہت
کہ جس کو احسن کہے سخنور۔ پڑھے یہ تحسیں ہر اک سخنداں

مطلع

شہنشہا تیرے سر پہ دوراں۔ ہے چتر بن بن کے ہوتا قرباں
کہ ہفت اختر بہ ہفت کشور ہیں آج یکسر مطیع فرماں
وہ ہے ترا اختر ہمایوں۔ کہ ہو کے روشن چراغ گردوں
مدام کانپے ہے شعلہ آسا۔ بزیر فانوس چرخ گرداں
سحاب ہمت جو دُرفشانی۔ کرے بہ ہنگام حکمرانی
تو ہو خجالت سے پانی پانی۔ ہوا یہ یک دست ابرِ نیساں
تری عدالت میں ہے یہ قدغن۔ کتاں کو دیکھے نہ ماہ روشن
وگرنہ ہالہ ہو طوق گردن۔ کہ تا ہو دل میں بہت پشیماں
جو تیغ بُرّاں کو اپنی شاہا۔ کرے علم تو بزورِ ہیجا
تو زیر دامان ابر اپنا دکھائے جلوہ نہ برق رخشاں
یہ تیرا خنجر ہے یا کہ شہپر۔ کہ جس کے لگتے ہی دم میں اُڑ کر
قفس سے ہوتا ہے تن کے پرّاں۔ ترے مخالف کا طائر جاں
ہے عید قرباں میں تیری میموں۔ رکھا بزرگوں نے شتر گردوں
کہ کھا کے گاو زمیں نہ ہیبت۔ کہیں بزیرِ زمیں ہو لرزاں
رکھے گا فغفور چینی خانہ۔ تو حکم دے اے شہ زمانہ
بنا صفاہاں یہ آستانہ۔ کہ بیٹھے دارا بجائے درباں

تری سخاوت کا سُن کے عالم۔ امنڈ پڑا ہے تمام عالم
عرب سے آیا ہے چل کے حاتم۔ بلب سوال و بدست داماں
جو آئیں جنبش میں لعل شیریں۔ چمک ہو اُن کی کلام رنگیں
تو حکم دیوے تو ہو ویں آئیں۔ تو ہنس کے بولے تو گل ہو خنداں
جو ہو سوار سمند تازی۔ کرے تو میداں میں اسپ تازی
تو سمجھے دور فلک کو بازی۔ بپائے گوئے و بدست چوگاں
(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)
وہ تیرا ہے فیل کوہ پیکر۔ کہ جس پہ کہتے ہیں سب نظر کر
فلک پہ دُمدار ہیں دو اختر۔ وہ نمایاں ہیں اسکے دنداں
(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)
ترا جو وصفِ خجستہ شاہا لکھے۔ قلم کو کہاں ہے یارا
ثنا دُعا پر ہے ختم کرتا جو ذوق تیرا ہے تہنیت خواں
کہ روز تجھ کو خوشی ہو افزوں۔ حسود ہوں سرنگون و محزوں
یہ جشن ہو فرخ و ہمایوں۔ سدا بصد فرّ و شوکت و شاں

قصیدہ نمبر ۲

اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔ افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا۔ ورنہ عجیب جلوہ دکھاتا۔ اکثر شعر اس کے زبانی سُنا کرتے تھے۔ دل روشن ہو جاتے تھے کئی شعر مسودۂ موجودہ میں نہ تھے۔ بندہ آزاد کو ان کی زبانی سنے ہوئے یاد تھے وہ بھی درج کئے ہیں۔

صبح سعادت نور ارادت تن بہ ریاضت دل بہ تمنا
جلوۂ قدرت عالم وحدت چشم بصیرت محو تماشا

قصرِ رفیع و صحن وسیع وطرزِ مسجع سطح مربع
باغ ارم یا روضۂ رضواں خلدِ بریں یا جنّت ماوے
مرغِ خوش الحاں برسرِ بستاں ہرگل بستاں خرم وخنداں
گوش شقایق ۔ محو سرود و دیدۂ نرگس مست تمنا
لحن قماری شکلِ مسجع صوت عنادل ور دِ ہلّل
سرو بقامت نخل دعاؤ نکہت گل یا دم بہ مسیحا
فصلِ ربیع و موسم اردی معتدل اک جا گرمی وسردی
میل عناصر سوئے طبائع ربطِ قوئے یا عالمِ اشیاء
چہرہ گلشن آتش رخشاں سرخی گل میں لعل بدخشاں
سبزہ بہ شبنم رشک جواہر لالہ بہ ژالہ لولوئے لالا
قلب کو فرحت روح کو راحت عقل کو قوت طبع کو جودت
جلوۂ ساقی نغمۂ مطرب نالہ بہ چنگ و نشہ بہ صہبا
خندۂ گل پر نغمۂ مُل پر سرو چمن پر لطف سخن پر
نغمۂ بلبل نالہ صُلصُل قہقہ قُلقُل برلب مینا
غُلغُلہ اندر محفل مستاں وجد میں خیلِ بادہ پرستاں
نغمہ طرازاں باربد آسا چنگ نوازاں شکل نکیسا
جام بلوریں بادۂ لعلیں صبح بہار و گلشن رنگیں
شیشۂ مینا بر سر مینا اختر صبح و گنبدِ خضرا
ساقیٔ مہوش مست شبانہ مطرب دلکش صرف ترانہ
مژدۂ عید اقبال مجسّم وقت سعید الوار سراپا
اک بُت ترسا۔ بادل سنگیں۔ لعبت کافر باہمہ تمکیں
صورت لات وشکل منات ورشک یعوق وغیرتِ عزّے

کانِ ملاحت بحرِ صباحت جوئے فصاحت گلشن راحت
شور میں لیلیٰ نور میں سلمیٰ لہجہ میں شیریں جلوہ میں عذرا
وہ لب میگوں عارض گلگوں وہ قد موزوں چشم پُر افسوں
برگ گل تر لالۂ احمر سرو صنوبر نرگس شہلا
خال بلب ہے نقطۂ مشکیں۔ یا ہے ہلال و چشمۂ شیریں
مردم دیدہ محو بدیدہ لالہ بہ داغ و دل بہ سویدا
فوج نظارہ جوں رم آہو۔ آہوئے کعبہ نرگس جادو
چیں بہ جبیں محراب بہ کعبہ طاق دو ابرو مسجد اقصےٰ
چاہ زنخداں آب زلال۔ اور اسپہ تکلم چشمۂ شیریں
ناصیہ روشن جوں کف موسیٰ زلف شکن در خطِ چلیپا
پان کی سُرخی لب سے گلو تک دست و گریباں قوس قزح سے
دام برائے گردن عنقا چشم و چراغ دیدہ حورا
بیت زلالی لب بہ تکلم۔ فرد خیالی رنگ تبسم،
موئے میاں جوں معنیٔ نازک تنگ دہاں سربستہ معمّا
عارض گلگوں چشم پُر افسوں سبزۂ تر سے طرز نظر سے
مایۂ ناز و غمزہ طراز و۔ گلشن راز و۔ راز بہ دلہا
فتنہ سراپا۔ قہر سراسر سُست وفا میں چست جفا میں
شرم سے ڈوبا بحر حیا میں۔ ناصیہ رو بر عالمِ بالا
رمز سے ہو کر صرف تکلم۔ ناز سے ہو کر لب بہ تبسم
مجھ سے کہا ہو زمزمہ پیرا۔ تو بھی تو بول اے بلبل شیدا
میں نے پڑھا اک مطلع روشن مدح میں تیرے جس سے ہو گلشن
روح معرّیٰ اے شہِ عالم۔ عنش ہو جریرا اور شاد ہو اعشےٰ

اے شہ عالم در ہمہ عالم۔ عالیِ اعلیٰ۔ والی والا
لب بہ ستائش۔ دل بہ نیائش جلوہ طراز عرش معلیٰ
نفس خلافت ازرہ رتبت تخت خلافت عرش بہ عظمت
تو ہے بہ حکم وجہ جو صورت وہ ہے بہ نفس رتبہ ہیولیٰ
روح مجسم عقلِ مکرم نفس مقدس جسمِ مطہر
باطن صافی جان موافی پردہ بہ دنیا جلوہ بہ عقبیٰ
علم حقیقی علم مجازی تیرے حلول ساری و طاری
اصل مبانی نقل معانی عقل کو تیرے عیشِ مہیا
سارے بڑھے اسمائے الہٰی سب ہیں مؤثر اے شہ اکبر
اسم جو اعظم ہے تو وہی ہے جس سے ہے تیرا اسم مسمیٰ
فہم میں لے کر صافی طینت رکھ کے نظر میں اوج قرینت
غرق حیا میں زمزم و کوثر سر بہ زمیں ہیں سدرہ و طوبےٰ
خلق کریم و نفس نفیس و ابر مفیض و فائز رحمت
آب بقاؤ خاک شفاؤ نار خلیل و باد مسیحا
تو سر دنیا ظلِ الہٰی حکم ترا تا ماہ بہ ماہی
تخت ترا ہے تا بہ ثرےٰ۔ اور فرق ہے تیرا تا بہ ثریا
حکم بہ حاضر نظم بہ ناظر۔ تیرے جلوس جشن کی خاطر
فوج سکندر لشکر دارا۔ تخت فریدوں مسند کسریٰ
تجھ سے ہی قایم شام سحر ہے۔ تجھ سے ہی دایم تازہ و تر ہے
بار مراد و برگِ نشاط و شاخ امید و نخلِ تمنا
تو بہ ریاست تو بہ فراست۔ تو بہ مقالت تو بہ سیاست
فطرت کیاں فکرِ جماعت حسنِ بیاض و غصہ حمرا

رو برضا و لب بہ دعا و دست بہمت پا بہ اقامت
لب بہ ہدایت دل بہ درایت صرف بہ زہد و محو بہ تقویٰ
تو بہ حقیقت تو بہ طریقت تو بہ شریعت تو بہ ودیعت
پاک سرشت و نیک نوشت بود جسم مطہر قلب مصفیٰ
رو بہ تجمل خو بہ تحمل کف بہ تکلف لب بہ تکلم
روکش یوسفؑ ہمسر صالحؑ ہمرہ موسیٰؑ ہمدم عیسےٰؑ
تیری محافظ آیۂ کرسی۔ تیری معاون آیتِ قدسی
زیب نمایم سورۂ یاسیں حسن عزائم سورۂ طٰہٰ
جانب اعدا تو سر میداں کھینچ لے جبدم صارمِ برّاں
نعرہ ہو اس کا اقتل اقتل۔ ندیہ اس کا نحن قتلنا
جلوہ سے تیرے ہو نہ منور شام و سحر آفاق تو کیونکر
نہ ہو دو اے دیدۂ شپّر مہر ضیائے حیرتِ حربا
تو دم فرحت تو دم عشرت تو دمِ صولت بر سر دولت
ماہ بسرطاں زہرہ بمیزاں تیر بہ قوس و شمس بہ جوزا
فہم ترا وہ عقل ارسطو بالغہ جس سے جوہر ثانی
عقل ترا دے درس فلاطوں فلسفہ جس کی ابجد اولےٰ
حال دو عالم تجھ میں ہے پیدا۔ اور ہے یہ نور کشف ہویدا
غیر قیافہ غیر سرودہ۔ غیر تفاؤل غیر بہ رؤیا
تیری شمیم خُلق سے طاری۔ تیری نسیم طبع سے جاری
باد بہاری مشک تتاری۔ عود قماری۔ عنبر سارا
فکر فرنگ و دانشِ یوناں آگے ترے ہے طفل دبستاں
تو ہے وہ باہر تو ہے وہ ماہر۔ تو ہے وہ بینا تو ہے وہ دانا

تیغ سے تیری ہے پیکر دشمن۔ حلقہ بہ حلقہ جب ہو بہ جوشن
پیش حکیماں کب رہے ثابت۔ عقل سے جزو لا تیجزّی
زینت لوح شوکت و شاں تو زیب سر تو تیغ جہاں تو
اسپہ مزین جوں گُل طغرے۔ اسپہ مسجل جوں خطِ امضا
حاتم دوراں منذر نعماں رستم دستاں شیر نیستاں
تو بہ سخاوت تو بہ عنایت تو دم جرأت تو سر ہیجا
حسن ادائیں نکتۂ موزوں۔ طرزِ بجائیں گوہرِ مکنوں
شغل و عمل میں نظم مسجع۔ حرف سخن میں نثرِ مقفےٰ
تیرا ہے توسن سایہ ذو المنن۔ بر سر جستن در دم رفتن
برق جہان و آب روان و شعلۂ آتش موجۂ دریا
باد بوقت تیز روانی ابر بوقت قطرہ فشانی
جب تو اُڑا دے کوہ و جبل پر جب تو رواں ہو جانب صحرا
(یہاں سے دو شعر رہ گئے)
فیل ہے تیرا ابر بہاراں۔ پر بہ خیال بادہ گساراں
ہو وے درخشاں برق بہ باراں دے جو ہلا زنجیر مطلّا
بحر بوسعت کوہ برفعت۔ پردہ کوہِ نور بہ ظلمت
اُس پہ طلوع جلوۂ طلعت۔ طور پہ گویا نور تجلّےٰ
پشت پہ اُس کی ہو درج زرّیں قوس قزح سے ستک رنگیں
تیرا طلوع اے خسرو خاور صبح شفق میں کردے ہویدا
تھا جو سخن آغازِ ثنا سے ختم سخن ہو حسن ادا سے
ذوق سخنداں تیری دعا سے طرز سخن موزوں ہو سراپا
دل ہے ترا یا نور کا عالم بلکہ فروغ طور کا عالم

پیش نظر ہو دُور کا عالم سن تو سہی افلاک پہ ہے کیا
وردِ ملائک نام خدا ہے دیکھ زباں پر کس کی ثنا ہے
دل کہ سراپا دستِ دُعا ہے۔ دست دعا و دامن شبہا
تا کہ زماں منضم بہ زمیں ہو دور میں چتر چرخ بریں ہو
شاہ کا عالم زیر نگیں ہو۔ سطح زمیں ہو عالم بالا

قصیدہ نمبر ۳

اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔ افسوس کہ نظر ثانی سے محروم رہا۔ آغاز جوانی کا کلام ہے۔

خضر نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو
منظور ہر نظر میں تب شکل آئینہ ہوں
تارہ کی طرح چمکے ذرّہ مرے سخن کا
میں رستمِ معانی۔ اور سیستاں سخن ہے
برگشتہ بخت اپنا۔ گر آئے راستی پر
یہ کہہ رہا تھا میں جو یکبار عقل بولی
تجھ کو خبر نہیں کیا ہے دور شاہِ اکبر
ہے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں
مثلِ سحاب جاکر باندھے ہوا فلک پر
دربار میں تو اُسکے ہو بہرہ یاب جاکر
لیکن رہِ رسائی اُس وقت ہو گی روشن
تو بھی تو سوچ دل میں تیرے دُرِ سخن کا
اُس کی نظر چڑھیں گر یہ تابدار گوھر
تب بحرِ فکر میں دل غوّاص ہو کے اُترا

اور شاہ راہ دلبر۔ چشم ہنروری ہو
روشن قلم سے میرے تاجِ سکندری ہو
اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو
دیتا جو زورِ قسمت دل کو تناوری ہو
گردوں بھی سرنگوں پھر دیکھ اپنی سروری ہو
وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو
رفعت سے پست جسکی شانِ سکندری ہو
اور دل کا اُسکے مقصد خود بندہ پروری ہو
جس پر کہ اُسکی چشم الطاف سرسری ہو
بہروزی ہووے میری اور تیری بہتری ہو
جب خضر راہ تیری۔ طبع سخنوری ہو
اُسکے سوا جہاں میں کون آج جوہری ہو
پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو
معلوم تا کہ سب کو زورِ شناوری ہو

مطلع یہ ہاتھ آیا شہوار بن کے موتی — شرمندہ جس کے آگے صد کان جوہری ہو

شاہا نظر کرم کی جس ذرہ پر ذری ہو
وہ آسماں پہ جا کر خورشید خاوری ہو

دیکھی ہے چین ابرو آئینۂ جبیں میں — کیونکر نہ تن میں اُس کے ہیبت سے تھرتھری ہو
کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے — گر بہر پائے بندی ایماء سرسری ہو
یہ داستان دولت ہے سجدہ گاہ عالم — دل کی تری عقیدت اور ننگ سروری ہو
دارا کو تیرے در تک ہو کس طرح رسائی — درباں جو تیرے در کا۔ کرتا سکندری ہو
سورج مکھی کا تیرے اک پھول مہر انور — قربان چتر دولت۔ نہ چرخ چنبری ہو
باغ جہاں میں نرگس۔ لے کیوں نہ جام زریں — جب ہر گدا کو دیتا اک ساغر زری ہو
دکھلائے آبداری جب تیغ شعلہ دم کی — شیروں کے دل میں ٹھنڈا خونِ دلاوری ہو
کشتِ اہل کو سرسبز آب گہر سے کر دے — ابر کرم کی تیری جب فیض گستری ہو
بیشہ میں معدلت کے۔ وہ شیر ہے تو شاہا — نوشیرواں کو جس سے ہرگز نہ ہمسری ہو
شیوہ مہوسوں کا۔ مہر کرم میں تیرے — تیری گدا گری ہو۔ کیوں کیمیا گری ہو
گر آفتاب تیرا۔ ڈالے کرن کو اپنی — تاجِ گدا کا جلوہ۔ جوں تاجِ قیصری ہو
تیری ثنا میں شاہا لکھتا ہوں اب وہ مطلع — جس کی چمک سے کاغذ چوں کاغذ زری ہو

پا بوس نقش پا سے۔ تیرے جو کنکری ہو
جا کر فلک پر اُس کو تاروں سے برتری ہو

ابر کرم سے تیرے کیا دور ہے کہ شاہا — کشتِ فلک میں پیدا۔ سرسبزی و تری ہو
سورج کی جو کرن ہے گردوں سے لے زمیں تک — مانندِ عشق پیچاں پھر سرسبز ہری ہو
مریخ کو فلک پر جس تیغ سے ہو ہیبت — دشمن کو بھاگ کر پھر کیا اُس سے بچاں بری ہو
نعرے سے تیرے ہوئے ہیبت کا چاک سینہ — دل پر دلاوری کے وہ تیغ حیدری ہو
تیرے سوا جہاں میں کون آج ہے توانا — جو دل کے ناتواں کو دیتا تونگری ہو

جاروب کش ہے تیرے بشکوئے خسروی کا — زیبا ہے ماہ کو گر۔ فرمان مہتری ہو
خورشید نذر لائے۔ جب افسر شعاع سے — منشور افسری پر توقیع خاوری ہو
ابر بہ تاج بخشی) جدم کرے اشارت — کشتی میں لے کے حاضر وہ افسر زری ہو
لائیں پئے سواری)۔ توسن کو جب سجا کر — صورت میں ہووے پتلی دروازہ میں پری ہو
چلتا ہوا ہے افسوں اڑتا ہوا چھلاوہ — پھر اس سے آگے بڑھ کر کیا سحر سامری ہو
کیا ترش قلم وہاں دکھلائے شہسواری — جب توسن تصور کھاتا سکندری ہو
خاک قدم ہو اس کی۔ اہل نظر کو سونا — جو نقش سم ہے اُس کا وہ مُہر اکبری ہو
تو اُس پہ بر سر زیں۔ جوں رحل پر ادب سے — اُم الکتاب لیکر جبریل نے دھری ہو
کس وصف کی ہو سیڑھی ہاتھی پہ بیٹھے موزوں — کرتا نہ فیل گردوں جس کی برابری ہو
اس طرح جلوہ گر ہے تو بر سر عماری — برج حمل میں جیسے۔ خورشید خاوری ہو
چار آئینہ بدن پر دشمن کے گر سجا ہو — اور سر پہ اُسکے ٹوپی فولاد کی دھری ہو
پر جیسے آئینہ سے تیر نگاہ گذرے — یوں غرق اس میں تیری ہر تیر کی سری ہو
کیا سعد و نحس کا یاں رہوے حساب باقی — جب چھائی آسماں پر۔ فرخندہ اختری ہو
ختم ثنا ہے کرتا اب ذوق اس دعا پر — تو مدعا پہ اس کی گر ملتفت ذری ہو
جو ہو ترا دعاگو گلرنگ ہو وہ کھل کر — بدخواہ اگر ہو خنداں صد برگ جعفری ہو

ہو سیر بخت تیری گر اوج میمنت پر
رفتار بخت اعدا بر رجع قہقری ہو

قصیدہ نمبر ۴

یہ قصیدہ ایام طالب علمی کا ہے۔ مطلب اس کے عہد مذکور پہ شاہد حال ہیں۔ افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔

تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام — ہے پئے افلاک لازم نفی خرق والتیام

تا خطِ محور پہ ہووے گرم گردش آفتاب
تا نہ قطبین فلک تک پہنچے دورِ صبح و شام

سبعۂ سیارہ ہوں سائر تا سرِ ہفت آسماں
ہو ثوابت کا سپہرِ ہشتمیں پر ازدحام

منجمد ہو کر میانِ طبقہ ہائے زمہریر
قطرہ افشاں تا بخارِ ابر ہوں بن کر غمام

آبِ باراں سے گذر کر منتشر تا ہو شعاع
انعکاس رنگ سے قوسِ قزح پائے نظام

تا حقیقت کے لئے لطفِ سخن ہو دے مجاز
صنعتیں ہوں اُس سے پیدا بامرام و بے مرام

تا کریں روشن معانی و بیاں سحرِ بدیع
جن سے ایرادِ معانی ہو بہ تحسین الکلام

تا اَنْ و لَنْ کے اِذَنْ دیں فعلِ مستقبل کو نصب
جازمِ فعلِ مضارع اِنْ و لَمْ لمّا و لام

تا کہ علمِ شعر ہو داخل بہ اوزانِ بحور
تا افاعیل و تفاعیل اس سے پائیں اہتمام

اور زحافوں کا عمل لیکر ردیف و قافیہ
گہ عرب گا ہے عجم میں انکو دے موزوں مقام

تا اطباء زماں کو ہو دے علمِ طب کے ساتھ
غورِ نبض و فکرِ بحراں۔ فکرِ الوان قوام

تا خس و حکاک لازغ۔ رحوۃ و ثاقب ثقیل
جبتلک امراضِ مہلک کا اطبا میں ہو نام

(یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے)

کیفیاتِ خمسہ ہوں منطق میں ایسا غوجیا
یعنی جنس و فصل و نوع و خاصہ اور عرضِ عام

مادّی و فاعلی علت کو تا صورت کے ساتھ
علتِ غائی پہ دیویں اہلِ دانش انصرام

تا ریاضی و طبیعی سے بزورِ فلسفہ
فیلسوفان جہاں علم و عمل میں لیویں کام

تا کہ نسبت سعدِ اکبر ہوں فلک پر قوس حوت
تا کہ جوزا اور حمل میں شمس کو ہو احتشام

سنبلہ کو تا منجم کہوے ہے شاید عقیم
تا کہ ہو دستِ دبغل جوزا فلک پہ شاد کام

عکم ہو بر جیس و کیواں کارواں بر چین و ہند
تا کہ تیر و ماہ روم و بلخ پر رکھیں مقام

تا خراساں مہر کو۔ بہرام کو ہو ملکِ ترک
ماوراء النہر پہ ناہید کو تا ہو قیام

تا کرے معلوم اصطرلاب سے اختر شناس
ارتفاعِ ہر ستارہ روز و شب یا صبح و شام

تا زحل کے ساتھ شکلِ عقلہ و انکیس کو
زائچہ میں دیتے ہوں صاحب رمل نسبت مدام

ہوئے دائرِ عرصۂ برزخ میں تا بحثِ حکیم
ہوں مذبذب جبر اور تفویض میں اہلِ کلام

رد کریں تا دعوئے رویت کو اہل اعتزال — اور بلا حار وسوسوں سے دیں نبی کو اہتمام
محو ہو حتیاب کہ جوگی شغل استدراج میں — سینہ و سر میں رکھے مرغِ نفس کو اپنے تھام
تا کہ سالک مسلک تقوے میں کرتا ہو سلوک — تا رہے مجذوب مستِ بادۂ غفلت مدام
تا وجود پاک سے ابدال اور اوتاد کے — انتظام اہل عالم ہو وے عالم میں تمام
تا خراسان و عراق و زابل و نیریز سے — نغمہ ریز فارس آباد ال کرے اپنا مقام
مدہم و پنچم ۔ کھرج گندھار و دھیوت اور نکھاد — نغمۂ ہندی کا ہو وے سات سُر سے انتظام
تا کہ فرور دی ۔ ابارو ۔ آب ۔ ایلول ۔ او دیئل — ماہ شمسی ہو مطابق ہر ولایت میں مدام
یارب اس کا رتبۂ عالی ہمیشہ ہو فزوں — دولت اسکی ہو کنیز اقبال ہو ادنے غلام
کون وہ یعنی محمّد شاہ اکبر دیں پناہ — نیک صورت نیک سیرت نیک طالع نیک نام
زور دینداری سے جس کی ہے دکھائی خود بخود — بیخ و بنیان ضلال کفر شکل انہدام
کیا تعجب ہے اگر اس کی بہار فیض سے — گلشنِ گیتی ہو رشک روضۂ دار السّلام
مرغزار عالم اس کی فیض سے ہے بسکہ سبز — پائے ہے رنگ زمرّد پارۂ سنگ رخام
کہکشاں سے لے عصائے نقری پیر فلک — کرتا ہے وقت سواری شکل چاؤش اہتمام
لے شمیم خلق اگر اُس سے تو ہو جائے ابھی — طبلۂ عطار کی صورت معطر ہر مشام
گلشن مدح و ثنا سے اس کی لے گلچین فکر — لا گل مضمون تازہ جلد بہر اث تمام

محترم یوں ذات عالی ہے بہ جمہور انام
حلقۂ تسبیح میں جوں سر برآوردہ امام

مائدہ اور من و سلویٰ کی کسے ہے احتیاج — مطبخ عالی سے تیرے سب کو پہنچے ہے طعام
بہرہ ور خورشید سے کوہ بدخشاں ہے فقط — تیر اجلال کی تیرے نظر عالم پہ عام
غنچۂ تصویر کو بھی مثل گلہائے چمن — ہے نسیم لطف سے تیرے ہوائے ابتسام
ق
ہے ملا دست سخا کے ساتھ تجھکو زورِ حکم — دست قسام ازل سے بسکہ وقت انقسام
فیض تیرا ہے کہ پائے خرقۂ ماہی درم — حکم تو دیوے تو رہوے زیر دریا تشنہ کام

دشمن بدبیں کو آب خضر بھی زہر آب ہے
اور دم عیسیٰ گلے میں بُرّش آب حسام

بد ہوا خواہوں کو تیری مرحمت سے خسروا
فیض انفاس الہٰی ہیں نفوس انتقام

دست صحت سے رگ ہر سنگ کوہ و دشت میں
نبض سالم کی طرح جنبش دکھائیگی دوام

دیں مریضوں کو دم عیسیٰ تو یوں نکلیں وہاں
قطرۂ ریزش گریں جس طرح سے وقت زکام

مستفید نور کب ہے شمس سے جرم قمر
نیّر اجلال سے تیرے جلا لیتا ہے دام

روبرو دست کرم کے ہوئی گرد و باد ہے
آبروئے ابر گوہر باز لے ذو الاحترام

تو جھروکوں میں جو بیٹھے آکے بہر عدل و داد
شیر و آہو گھاٹ پر جمنا کے ہوں آلیمن ام

تا نہ آئے زخم عاشق کے دل ناکام پر
تیغ ابرو پر بتاں رکھتے ہیں وسمہ سے نیام

ق اے فریدوں تو جو کر دے راہ خونریزی کو بند
اور لبوں سے جام کے چھلکے رحیق لالہ فام

شانۂ ضحاک کی مانند ایک ایک اس کی موج
مار پیچاں بن کے ہو وے متحد با خط جام

معجز انصاف سے تیرے سر دشت و جبل
ہر غزالہ ناقۂ صالح ہے گویا بے زمام

قصد صید اس کا کرے کوئی معاذ اللہ اگر
ہو خدا کا قہر نازل اس پہ بہر انتقام

آیا جب تیرے مقابل اے نہنگ بحر رزم
شکل خرچنگ الٹے پاؤں ہٹ گیا دستان سام

گنج استقلال پر ہے قفل اگر تیری سپر
وقت پر شمشیر ہے مفتاح ابواب جہام

جوں عصائے حضرت موسیٰ سر دریائے نیل
نیزہ تیرا لشکر اعدا میں کر جاتا ہے کام

ہے خدنگ تیر تیرا یا ہوا پر ہے عقاب
دمبدم دے ہے قضا کا اُڑ کے اعدا کو پیام

گر عدو سدِ سکندر کو کرے جا ر آئینہ
آگے تیری تیغ کے وصلی ہے پر کاغذ ہے خام

تیرے وصف ناوک اندازی پہ تیر انداز فکر
مطلع برجستہ کو ہے لکھ کے دیتا انتظام

برسر پرواز ہوں جب تیرے شہباز سہام
جوشن جسم عدو میں ہووے دم محبوس دام

دست دہقاں میں فلاخن شعلۂ جوالہ ہو
لیں ترے برق غضب کا کشت اعدا پر جو نام

گر سحاب قہر تیرا ہو تگرگ افشاں تو ہو
حال اہل قاف وہ لے خسرو عالی مقام

وادیٔ بطحا میں جیسے بر سرِ اصحابِ فیل
معجز طیراً ابابیل آیا دُنبت انہزام

جنبش خامہ سے میرے سرد ہو برق جہاں
گر کروں شاہا رقم وصفِ سمندِ تیز گام

ترک تازی میں پڑی تھی اس کی شوخی پر نظر
ابلقِ چشم بتاں کی ہو گئی ترکی تمام

صفحۂ غبرا پہ کھائے نقطۂ رمّال رشک
دیکھے نقش سُم جو اُس کا جلوہ گر وقت خرام

سرعت طیِّ منازل کا لکھوں گر اُسکے وصف
حال و مستقبل کا داخل فعل ماضی میں ہو نام

عرصۂ چوگاں میں جب اُس کو بوقت معرکہ
لائے جولانی میں دیکر جنبش دست لگام

گاہ سرپٹ گہ اُڑان اور گاہ میٹھا پوئیہ
گاہ دلکی اپنیہ اور گاہ جائے شاہ گام

اور اشارہ ہو اگر اس قاف سے اُس قاف پر
اس طرح اڑ جائے جوں مرغِ نظر بالائے بام

فیل کو تیرے شب یلدا تو کہتا ہے جہاں
پر جو ہے نقش قدم اُس کا وہی ماہِ تمام

یا سیہ خیمہ ہے لیلیٰ کا دیا ہے تھم گئی
جان قیسِ تفتہ دل بنکر دھواں شکلِ غمام

حلقۂ زلفِ بتاں کب کھائے ہے یوں پیچ و تاب
جب اُٹھا خرطوم کو اپنے کرے ہے وہ سلام

منزلِ توصیف کو کیونکر تری طے کر سکے
دم کہاں پیکِ خرد میں یہ خیال اسکا ہے خام

تہنیت کو ہے دُعا پر ذوق کرتا مختصر
ہو مبارک تجھ کو باعیش و طرب عیدِ صیام

جو کہ ہوں بدخواہ وہ ناشاد اور غمگیں رہیں
اور ہوا خواہوں کے دل ہو دیں ہمیشہ شاد کام

قصیدہ نمبر ۵

افسوس کہ نظرِ ثانی سے محروم رہا۔

صبحدم فکر جو تھا سیرِ فلک کا مشتاق
عرش پر اُڑ گیا اک آن میں مانندِ براق

چمک اس برق جہاں کی ہو بیاں کیا کہ اگر
افقِ طبع پہ دکھلائے فروغ اشراق

شعلۂ رنگ حنا کر کے اُڑا دیوے ابھی
قفسِ دل میں جو ہیں بند طیورِ اشواق

رات مجھ کو یہ فلک گرد وہاں لے کے گیا
کہ عقولِ عقلا کی تھی جہاں طاقت طاق

فلسفی دہر کے جو جو تھے ہوئے ہمتا ہیں
نور اشراق سے تھے ہو گئے سب اہل رواق

تھے سعادت سے جو سب بُرج فلک مالا مال
بخت و دولت سے یہ لبریز تھا ہر قصر وثاق

تھی تعجب کی نہ جا بار جلالت سے ہو گر
حرکتِ چرخ گرانبار کی قطبین پہ شاق

انجم ثابت و سیار سعادت سے بہم
یوں نظر آئے کہ جوں دست و بغل اہلِ وفاق

نجم ناہید۔ لقب جس کا ہے رقاص فلک
تھا چپ و راست بہ آہنگ رہاب و عشاق

بدر تھا پل میں قمر۔ پل میں نظر آتا ہلال
خدمتِ دائرہ داری میں تھا ہر رنگ سے طاق

اس کا طنبور جو دیتا تھا سروں کو ہیہات
جرم خورشید سے ہوتی تھیں شعاعیں اشراق

تیر گردوں کا خوشی سے تھا جو دل لہراتا
دے کے ترتیب ثریا کو باقسام ایاق

جلترنگ ایسی بجاتا تھا کہ سب وجد میں تھے
لعبتانِ فلکی صورتِ اہلِ اذواق

نظر آجاتا تھا گر اخترِ دمدار کوئی
دیتا مریخ دم تیغ سے اُس کو الحاق

ہاتھ پھر مار کے جو رنگ کا اک پھرتی سے
دم میں تھا اپنے طپنچہ پہ چڑھاتا چقماق

جو جلا پارۂ تن اس کا سوئے عالم خاک
یہ اُڑا اُسپہ تڑاقا وہ اڑا اسپہ تڑاق

سعدِ اکبر کہ جسے کہتے ہیں قاضی فلک
حسن کو عشق سے دیتا تھا بہم ربطِ وفاق

ہوتا زاہد بھی تھا آمادہ پئے دامادی
زال دنیا کو جو تھا بیٹھ رہا دے کے طلاق

چرخ ہفتم پہ فلک ہے تو بطی الحرکت
عالم خاک میں پر ہے تگ و دو کا مشتاق

نغمِ تفریح سے پرباد ہے گردوں کا شکم
لیکن اس وقت ہیں تنقیہ بہت اُسکو ہے شاق

ہے جو ہر کوچہ میں آرائش نوبت خانہ
خالی آواز دمامہ سے نہ ہو کوئی رواق

یوں جو آراستہ افلاک پہ ہو بزم طرب
گلشنِ عیش و طرب کیوں نہ ہو بزم آفاق

آج وہ روزِ ہمایوں ہے جسے کہتے ہیں عید
بذلہ سنجی میں شگفتہ ہے دل اہلِ مذاق

بزمِ خسرو میں چل اے باربد بزم سخن
سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق

تیرا قانون ترے پاس خط مسطر ہے
چھیڑ دے زابل و تبریز و خراسان و عراق

تیرے نغمے ترے مضموں ہیں بہ شہنائے قلم
دلکشی پر ہے سر دست کمر بستہ و چاق

زمزمۂ مدح کے لکھ اسکی جسے کہتے ہیں سب — نائبِ ختم رسل ظلّ خدائے خلاق
کون وہ یعنی شہنشاہ محمد اکبر — دست بخشش سے خجل جس کے ہے بحر آفاق
طبع وقاد کی گر اُس کی رقم ہو توصیف — چہرہ اختر کا ہوا اور ماہ سے آئے مہراق
نیرجاہ سے خورشید ہلال آسا ہے — کاہش رشک سے رکھتا ہو ہلا ستدقاق
عطر سے شیشۂ افلاک ہو دم میں لبریز — ہو وے گر لخلخہ سا اس کی نسیم اخلاق
خسروارات کو تھا منزل دل ہیں میرے — کارواں شہر سمرقند کا رکھتا آتراق[1]
اُن کے خرجینوں سے چُن چُن کے ہیں لایا ہوں متاع — مدح حاضر کے لئے تیرے بہ صد استغراق
تو ہے وہ نسل خواقیں بہ تتار آفاق — جس نے توراں سے کیا ہند میں آکر قشلاق[2]
گر ترا مہر طبیعت ہو بہ جوزائے غضب — زمہریر از پئے آرام جہاں ہو ییلاق[3]
گر نہ دے حکم تو پھر ابر کے سینہ میں کبھی — رحمت عام ہو پایۂ ماء مُہراق
تر زباں وصف میں سب ہیں ترے طفلانِ نبات — ندایہ غیب سے بلواتا ہے شیر اشفاق
تیرے شیلانِ[4] کرم پر ہے زمانہ مہماں — مہ و انجم سے فلک پر ہیں مہیا اطباق
گر سبق لیں نہ ترے فلسفۂ حکمت سے — اہل یوناں پہ نہ ہو وے حکماء کا اطلاق
ہوں نظر سے کبھی باہر نہ غوامض کے طیور — تیرے شہباز فراست کا ہے یہ استحقاق
درگ امراض کریں جبکہ انامل تیرے — نبض آسا متحرک ہو رگ سنگ سماق
دیکھکر نجم سعادت کا ترے حسنِ طلوع — مادرِ شب پسر مہ کو کرے شرم سے عاق
تو جو محراب عبادت ہیں رکھے سر بسجود — طاق مسجد میں جھکے آکے سر ہفتم طاق
پاس دیں تیرا جو زنار کی چاہے تبدیل — دوش گردوں پہ خطِ منطقہ ہو خط نطاق
ہو گیا تیغ سیہ تاب سے ہے سُرمہ گلو — دم نہ مارے گا ترے آگے حسود بقباق
رعب شمشیر ترا یوں ہے سپر سے دہ چند — جیسے نقطہ سے کریں ایک کو دس اہل سیاق

[1] فرود آمدن بہ منزل۔ [2] قشلاق۔ گرم ملک جہاں سرد پہاڑوں کے لوگ آکر سردی کے دن بسر کریں ۱۲
[3] ییلاق۔ سرد ملک جہاں گرمی کے دنوں میں آرام کریں ۱۲ [4] شیلان۔ دسترخوان شاہ۔ ۱۲

ہو ترے فیضِ تکلم سے شفا عام تو ہو
زہر کی جا دہنِ مار میں پیدا تریاق

عدل نے تیرے سہا دفع یہ کی خونریزی
فصد کی منع اطبا نے پئے رفعِ خناق

اللہ اللہ رہے لشکر کا ترے خیل و حشم
ہم عدو جس سے نہ از بک ہو نہ ہمسر قلماق

تیرے دربارِ جلالت کے جو ہیں میرِ غضب
کہکشاں کو ہیں سرِ دوش لئے مثلِ چماق

اور اک مطلعِ دلکش نے طبیعت سے مری
ہے ترے عدل کی تعریف میں پایا الصاق

اُٹھ گیا مدرسہ دہر سے یہ شر و شقاق
زید سے عمر کے دل میں نہیں باقی ہے نفاق

چرخ کے گنبدِ بے در میں رہیں گے محبوس
دم نہ ماریں گے مگر گونج کے شور و شلتاق

گر لکھوں وصف ترے اسپِ جہانگرد کا میں
دے فلک اُڑنے پئے پامالِ قلم ہفت اوراق

تن میں اس طرح سے ہے اُسکے پھڑکتی شوخی
قفسِ تن میں ہو جوں طائرِ جانِ عشاق

ماہی زیرِ زمیں لوٹ کے ہو جائے کباب
جھاڑے گر سنگ پہ وہ نعل سے اپنے چقماق

وقت کو باندھ کے فتراک میں راکب اُس کا
چرخ پر دائرے کھینچا کرے مانندِ نطاق

اُس فلک سیر کو گلگشت میں گر تو شاہا
جودتِ طبع کی جنبش کا چھوا دے مطراق

یوں اُڑے سوئے فلک جیسے یہ تفریحِ مشام
بوئے گل جائے تنفس میں دمِ استنشاق

کیا لکھوں وصف ترے فیل فلک پیکر کا
کہ گرانباری ہے اس کی تنِ البرز پہ شاق

عمر بھر مطبخِ عالی میں رہا نعمت خوان
صفحۂ اطعمہ پر خام رہا جوں نسیق

ہیں ستاروں کی بھی آنکھیں اپنی ہاتھوں کو لگی
نورِ ہمت کا زمانہ میں جو ہے عام الفاق

بر سرِ دشمنِ بدکیش بہنگامِ وغا
گر قشوں ہووے جلوہ ریز بہ دشتِ قبچاق

تو عجب کیا ہے کہ اس کشورِ برفانی میں
شعلۂ تیغ شرربار ہو برقِ حراق

دل مرا ہو گیا اس وقت ہے وہ عالمِ نور
جس کی مشرق سے کریں نورِ معانی اشراق

گرد عا صدقِ ارادت سے کہ ہے دستِ دعا
کیوں خموشی پہ کیا ذوق زباں کو مشتاق

دوش گر دل پہ ہو تا فرغلِ سنجاب غمام
سبزہ تا خاک پہ ہو پیرہنِ استبراق

دختِ رز کو بہ سرِ محفلِ اہلِ تقوے	حبب تلک سینۂ مینا میں رہے دردِ فراق
تجھ کو آفاق میں ہوئے رمضاں بھی بہ عید	ہو ترے رویتِ دیدار پہ عیدِ آفاق
اور ترے نیرِ اقبال کے آگے دشمن	یوں رہے جیسے کہ ہو ماہ بایامِ محاق

صفحۂ دہر سے پھر گردشِ افلاک اسے
حرفِ باطل کی طرح دیکے جہاں سے ازہاق

قصیدہ نمبر ۶

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔

گردش میں چشمِ مست کی ہو دل مرا اگر گرہ	اور کھولے ہائے دانہ کی یوں آسیا گرہ
سینہ میں دل اگر نہ گرہ تھا تو کس لیئے	ہر اشک میری آنکھ سے ہو کر گرا گرہ
اپنا دل گرفتہ چمن میں نہ وا ہوا	غنچہ ہزار جا پہ کھلا اور ہوا گرہ
چلتا نہیں ہے پنجۂ مژگاں کا کچھ عمل	ہے ایسی چشمِ تر سے بہم آشنا گرہ
قمری ہے لائی چاکِ گریباں چمن میں آہ	اے سروِ گل سے دے سر بندِ قبا گرہ
ہوں وہ گرفتہ دل کہ مژہ پر ہجومِ اشک	ہوتا ہے شکلِ خوشۂ انگور آ گرہ
میں مجمرِ فنا میں ہوں کیا دانۂ سپند؟	کھولے ہے کاربستہ کی میری صدا گرہ
تصویرِ غنچہ ہوں چمنِ روزگار میں	وا کر سکے گی میری بھلا کیا صبا گرہ
مرقد پہ میرے طرۂ شمشاد کی طرح	پھوٹے گی نخلِ شمع میں بھی جابجا گرہ
آیا ہوں میں سرشت میں لیکر گرفتگی	ہو دینگے استخواں بہ گلوئے ہما گرہ
رہو یگا شکلِ دستِ حنابستہ حشر تک	قاتل کے دست و دل میں مرا خوں بہا گرہ
گر میں شگفتہ دل ہوں تو جوں دانۂ انار	محفل میں ہوگا خندۂ دنداں بنا گرہ
میں عکس اپنا دل تو ہو جوہر سے آئینہ	جوں دامِ موج وشکلِ خطِ بوریا گرہ
عکسِ دلِ فسردہ سے مینائے بزمِ مے	رہ جائے شکلِ دانۂ انگور کھا گرہ

یہ زہر غم چڑھا ہے کہ سبزہ بزیر زلف
سوجھے ہے یوں کہ زہر کی تھا یہ بلا گرہ

میں دل گرفتہ آہ اگر کارواں میں ہوں،
حیرت سے اینٹھ کر ہو زبانِ درا گرہ

رویا میں شکل شیشہ کبھی کھول کر نہ دل
میرے گلو میں گریہ ہمیشہ رہا گرہ

دل بستگی کا اپنے قلمبند کرکے حال
بازو پہ مرغ دل کے اگر دوں لگا گرہ

کھائیں کبوترانِ گرہ باز کی طرح
سینہ سے آن کر سر دوش ہوا گرہ

وہ دل گرفتہ ہوں کہ اگر نکلے پاس سے
جوں غنچہ ہو رہوں بہ جبینِ صبا گرہ

پھیلاؤں گر شمیم مضامیں کو ہند میں
ہوئے ختن میں نافۂ مشک خطا گرہ

رجعت سے نجم بد کی مری ماہی سپہر
خرچنگ بن کے بیٹھ رہے ایک جا گرہ

پیدا ہوں سو گرہ اگر اک دل سے کھولئے
جوں کو کنار لالہ و تخمِ حنا گرہ

گہنا نہ ماہرو کا ہے کہتا کہ دیکھیو!
قینچی کی طرح کترے ہے چرخ دوتا گرہ

آہیں تو کھینچیں سینۂ صد چاک سے بہت ن
کھلنی تھی میرے دل کی مگر کیا بھلا گرہ

سوزن کا رشتہ بن کے کھچا جنتری میں وہ
ہے زیر پائے رشتہ بپا دو اسرا گرہ

قطروں سے خونِ دل کے ہوں سو سو گرہ عیاں
اک آبلہ سے دل کے جو کھولوں ذرا گرہ

یہ عقدہ مثلِ ابروئے خوبانِ کینہ جو
ہے ڈالتا بہ ناخنِ عقدہ کشا گرہ

رمّال قرعہ ڈالے جو اس عقدہ پر تو ہو
انگلی سے پوری پوری میں اس کی جدا گرہ

ہر قطرۂ سرشک مرے روئے زرد پر
خاطر گرفتگی سے ہے جوں کہربا گرہ

یارب وہ شانہ پاؤں کہاں میں جو دل سے آہ
دے کھول شکل عقدۂ زلف دوتا گرہ

وابستہ تار موئے میاں سے ہوں شکل ناف
چشمِ کشادہ کار رکھے مجھ سے کیا گرہ

نقطہ کی طرح مرکز گردش رہا سدا
میں تھا مگر بہ دائرۂ دیرپا گرہ

دل تھا گرہ خیال میں جو آ کے عقل نے
یوں کھول دی بہ ناخنِ فکر رسا گرہ

اس آفتاب پرتو نظر کر کہ جوں تگرگ
پل بھر میں اک زمانے کی ہے کھولتا گرہ

وہ کون یعنی اکبر ثانی کہ جس نے وا
تیرے بھی کام دل سے ہے کی بارہا گرہ

گل کی گرہ بہار کرے گر صبا سے وا
وہ کھولدے دلوں کی بہ فضلِ خدا گرہ

لایا ہوں بہر نذر میں وہ دُرِّ آب دار
ہو جس کو دیکھ آبِ دُرِ بے بہا گرہ

جوں برق لکھ کے مطلع برجستہ خامہ نے
مطلع سے آفتاب کے دی ہے لگا گرہ

مہ طلعتوں میں حسن سے کی تو نے وا گرہ
کیوں میرے دل میں خال سویدا رہا گرہ

کھلجائے نام پاک سے اک آن میں ابھی
گر ہو وے کوہ مروہ و کوہِ صفا گرہ

ہیبت سے تیرے نطق کے تبخالہ بنکے ہے
دعویٰ کے لب پہ آ سخنِ مدعا گرہ

چاہے جو اُس کو آبِ فصاحت کرے رواں
لکنت دہیں زبان پہ دیوے لگا گرہ

تیرے سحاب جود سے گلشن میں صبحدم
لے مشت زر ہے غنچۂ گل باندھتا گرہ

گر دلِ خنک کی جان فرو بستہ کھینچ کے ہو
مابین کوہ قاف میانِ شتا گرہ

تو ناخنِ نگاہ سے مانند آفتاب
دے کھول دم میں دیکھکے یہ ماجرا گرہ

کھولے ہیں کارِ بستۂ عالم سے دانہ وار
تیری ہوائے لطف و سحابِ عطا گرہ

دستِ گرہ کشا سے نہ ہے باقی کہاں رکھی
جز تکمہ ہائے پیرہنِ اغنیا گرہ

البتہ دل میں غنچۂ پیکاں کے ہے ترے
جانب سے حاسدوں کے صباح و مسا گرہ

یا جو تری کمانِ نگاریں میں ہے نمود
وہ ابروئے نگار پہ ہے خوشنما گرہ

اک دم میں تیرے ناخن شمشیر سے ہوا
ہیں سر جو حاسدوں کے بروزِ دغا گرہ

تیرے فروغِ نیّرِ حشمت سے کیا عجب
گر مہر ہو سمٹ کے بہ شکلِ سہا گرہ

اللہ رے تیری قوتِ بازو کہ مثلِ گوئے
چوگاں کے آگے کوہ کو ہے جانتا گرہ

تو چاہے گر تو دامنِ ساحل میں بحر کو
دونوں طرف سے کھینچ کے دیوے لگا گرہ

پنجہ سے تیرے مہر کے گردوں پہ ہر سحر
کھل جاتی ہے ستاروں کی لا انتہا گرہ

منقارِ ماکیاں کی طرح ناخنِ ہلال
ہے بیضۂ فلک کی سدا کھولتا گرہ

لائے جو شعلہ حرفِ شرارت زبان پر
تاثیرِ عدل سے ہو تری لب پہ آ گرہ

اللہ رے ہیم عدل کہ خون زمانہ میں
دشنہ بھی رکھے گر کے جبیں پہ ابا گرہ

ق

زلفوں کے دام جیسے حسینانِ نازنیں
ہیں ڈالدیتے دیکھے لبوئے قفا گرہ

مار سیہ کے سر میں اسی طرح زہر مار
ہو وے گا مثلِ مہرۂ مار ایکجا گرہ

انجم سے تیری سالگرہ کے لئے فلک
ہر سال کہکشاں میں ہے دیتا لگا گرہ

توسن ترا نہیں پہ جو کاوے کا ڈالے نقش
سمجھیں کہ بیٹھا مار کے ہے اژدہا گرہ

جولاں پہ اپنے آئے تو جوں جنبشِ صبا
غنچوں کی کھولے باغ میں وہ بادپا گرہ

دامان ابر تر پہ وہ پاتا ہے برق تام
اُس کا شرار نعل جو دے سے اُڑا گرہ

گر اُس کی گردِ سُم سے بمیدان کارزار
ہو گرد بادِ دامنِ صحرا میں کھا گرہ

لائے اُڑا کے تو اسے از شرق تا بہ غرب
کھلنے نہ پائے یہاں پہ جبین ہوا گرہ

رفعت پہ تیرے فیل کی طبع رسا نے رات
پھینکا کمند وہم کو جو کر کے وا گرہ

آیا نظر کہ صفحۂ چشمِ زمانہ میں
اک نقطہ مشکِ ناب کا ہے ہو رہا گرہ

ہے بسکہ رکھتا عقدہ کشائی کا دل میں شوق
دیکھا جو نیشکر میں کہ ہیں جا بجا گرہ

کرتا ہے آشنا اُسے دنداں سے وہ فقط
اس واسطے کہ اُس کی بھی ہو دل کی وا گرہ

سلکِ دُرِ سخن میں دلا صبح تا بہ شام
جوں سبحہ دیگا بیٹھا ہوا تا کجا گرہ

وا کر لبِ سوال بدرگاہِ ذوالجلال
تا رہ نجائے سینہ میں دل کی دعا گرہ

غلطاں بزیرِ گنبدِ گردوں ہوا کرے
بن بن کے تا زمانہ کی صبح و مسا گرہ

تا چرخ واژگوں پہ سرِ شاخ کہکشاں
ہو خوشہ وار عقدِ ثریا سدا گرہ

میداں ہو تا سپہر کا اور گوئے ماہ و مہر
اور دور مہ سے ہو ذنب و راس تا گرہ

تا دل گرفتگی سے زمانہ کی بزم میں
ہر دم گلوئے شیشہ میں ہو قہقہا گرہ

حب نبات کو پئے دردِ مریضِ عشق
تا دیں بحالِ لب بتِ شیریں ادا گرہ

جبتک شمیم کا گل پیچاں لگے رشک سے
نافہ میں ہوئے مشکِ ختن بے خطا گرہ

ہر سال تجھ کو جشن مبارک ہو خسروا
اور مشکلاتِ خلق کی ہوں اُس سے وا گرہ

پر ترے مدعی کی نہ وا ہوئے جوں حباب
ہرگز محیطِ دہر میں غیر از فنا گرہ

قصیدہ منبر ۲

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔

قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہوئے نکتہ نگار ۔۔۔ تو اپنے نقش مٹادیں جہاں کے جادوکار
سخنوروں نے جو باندھے سخن کے ہیں نیرنگ ۔۔۔ زباں سے اُسکی ہیں وابستہ اُن کے سب اسرار
سوار توسنِ دستِ رواں پہ ہووے یہ جب ۔۔۔ کرے قلمروِ معنی کو دم میں باجگذار
جو شاخِ سدرہ پہ بیٹھا ہو طائرِ مضموں ۔۔۔ تو اُڑ کے صورتِ شاہیں کرے یہ اُس کو شکار
زبانِ تیغِ نگہ سے لیا فسوں شاید ۔۔۔ کہ اِس پہ اُڑ کے مضامیں ہیں کرتے جی کو نثار
ہیں دست بستہ کھڑے چاہوں باندھ لوں جس کو ۔۔۔ کہ لفظ و معنی و مضموں ہیں بے شمار و قطار
ہے کرتی کام جہاں جا کے اُس کی نوکِ زباں ۔۔۔ قلم دبیرِ فلک کا ہے واں پڑا بیکار
سخن زباں پہ ہے اور ہے نگاہِ دل دل پر ۔۔۔ کہ نشوا ہیں دل تو ہر ایک کی ہے اپنی بہار
سخن شناس اُنھیں دیکھکر یہ کہتے ہیں ۔۔۔ کہ جو گہر ہے وہی اس میں ہے دُرِ شہوار
کروں میں اس کو مگر کیا کہ مشتری نہ رہے ۔۔۔ متاعِ بخت کو بیچوں جو میں تو کس بازار
شراب دُرد سے دل ہو گیا ہے مست ایسا ۔۔۔ کہ شام روزِ جزا تک نہ جس کا اُترے خمار
بنائے ناوکِ تقدیر خاک تودہ جسے ۔۔۔ بچا سکے اُسے کیا خاک بُلبلے کا حصار
ہزار درد اسے بیدردیٔ زمانہ دکھائے ۔۔۔ زباں پہ لایا نہ لائے گا شکوہ یہ زنہار
ق میں لایا سینہ میں تھا دل کی جا پہ آئینہ ۔۔۔ کہ اہلِ دل اسے سمجھیں گے مطلع الانوار
سو اس کو لوٹا ہے لوگوں نے سنگ باراں سے ۔۔۔ میں کہتا تھا کہ گہربار ہوں گے یا گلبار
صفا کا اُسکے اک ادنےٰ سا وصف یہ دیکھو ۔۔۔ غبارِ غیر کی خاطر میں ہو تو اس پہ ہے بار
میں آگینہ سکے آگے ہوں آپ شرمندہ ۔۔۔ کہ ایک بات سے پڑتے ہیں بال اس میں ہزار

اگر تردد ایام کیوں کروں اے چرخ
نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار

لے آیا حسن مقدر اس آستاں پہ مجھے
کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جبہ لیل و نہار

سحاب جود سے اُس کے زمانہ ہے گلشن
نہال ابر کرم اُس کے ہیں صغار و کبار

یہ سُن کے مجھ سے کہا طبع نے کہ اے ناداں
کچھ اُس کے نام کی تصریح بھی تو ہے درکار

ہے اُس کے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی
کہ چشمہ پاس نہ دریا نہ ابر دریا بار

سو میں زباں کو گیا لے کے دل کے دریا میں
مذاق آب گہر میں ہلا لیا کئی بار

اور اس کے بعد ہوں کہتا کہ نام پاک ہے وہ
جسے نمازوں میں لیتے ہیں سب پکار پکار

خدا کا سایہ ہے اور نائب رسول خدا
محمد اکبر عالم نواز و عرش وقار

ملک صفات و فرشتہ سیر ولی خصلت
بدیں پناہ و بدل دولت و بہ رُخ انوار

خدا شناس طریقت نما حقیقت بیں
بدست جود ہے دریا۔ بہ تمکنت کہسار

نہ حق وصف ہو اُسکا کبھی ادا لب سے
زباں بہر سر مو آ کے گر کرے گفتار

ہوا ہوں لیکے میں حاضر یہ تہنیت کے پھول
کہ اور پاس نہ رکھتا تھا کچھ برائے نثار

شہا ہے آج اُسی شاہزادہ کی شادی
جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

وہ شاہزادہ ہے پر ہے ابھی سے شاہ نشاں
وہ شاہزادہ جواں ہے ولے کہن کردار

پڑھو حضور میں اک مطلع دعائیہ
قبول جس سے دعائیں ہوں بہ سر دربار

شہا خدا سے یہی ہے مری دعا ہر بار
کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیرے لیل و نہار

شکوہ شادیٔ شہزادہ کس زباں سے کہوں
کہ جوں شگاف قلم بند ہیں لب اظہار

(یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے)

جو لکھنے بیٹھا میں ساچق کا وصف آرائش
تو نکلا خامہ سے جو حرف تھا خط گلزار

یکایک اُتریں پرستاں سے آن کر پریاں
ہوئیں جو تخت ہوائی پہ ناچنے کو سوار

ہجوم عیش و طرب اس قدر زمیں پہ ہوا
دبیر چرخ سے بھی ہو سکا نہ اُس کا شمار

یہ لعبتانِ فلک پر ہوا خوشی کا جوش
سہاگ گانے لگی زہرہ بن کے موسیقار

(یہاں سے کئی سطریں پڑھی نہ گئیں۔ آگے چند شعر متفرق آتشبازی کے ہیں)

شب برات کی وہ روشنی کہ صلِّ علیٰ
ہو روزِ عید اگر آئے سامنے سفب تار

جو ٹٹیوں پہ ہوئی روشنی تو شور اُٹھا
فلک نے کھینچی زمیں پر ستاروں کی دیوار

دیا ہے لایا ارسطو طلسمِ یوناں سے
کھلایا سدِ سکندر میں چین کا گلزار

لگے ستاروں کو جب آگ دینے آتشباز
تو بولے اہلِ نظر دیکھنا ہے طرفہ بہار

یہ دیں گے آگ کا دانہ جب اپنے موروں کو
تو آکے ہوویں گے طاؤسِ خلد اپنہ نثار

جب اک طرف کو لگی جگمگانے چادرِ گنج
زمیں پہ سب کو نظر آئی آسماں کی بہار

ہمارے کانوں کے پردے تو اُڑ گئے اُس دم
پٹاخے کرنے لگے چٹکے جب بہم تکرار

پکارے سب کہ قواعد ہے فوج میں شاید
کہ فیر اُڑ رہے ہر صف میں ہیں قطار قطار

عجب تماشا ہوا پتلیوں میں جب ہی آگ
کہ ناچنے لگے مل کر ثوابت و سیّار

ہوائی کہتی تھی جا کر شہابِ ثاقب سے
کہ نور زیادہ ہے یا ہیں فزوں ہوں آتشبار

ہیں ابرِ طور سے برسے زمیں پہ نور کے پھول
زمیں تو تودہ گُل ہے گی آسماں گلبار

(کئی شعر اور پڑھے نہ گئے)

اب اس دُعا پہ قصیدہ کو ختم کرتا ہے ذوق
کہ دوست تیرے سرافراز اور عدو ہوں خوار

پر اس ہوس کی ابھی چھینٹ رہی ہے مہتابی
قلم میں سالِ عروسی کا پھول دیوے بہار

اسی خیال میں تھا دیکھتا خدا کی طرف
کئے خموشی نکہت سنے والبِ گفتار

کہو سہرِ لبِ ابتہ سے شادیٔ فرزند
مبارک آپ کو ہوا ے شہ سپہر وقار

۳۰ + ۲	جو ہو گیا اس کے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز ہوں اُس کے دشمن بدکیش خالد آتی النار	۱۱۹۳ ۳۲ ۱۲۲۵

قصیدہ نمبر (۸)

اکبر شاہ مرحوم کی مدح ہے۔ عالم شباب کا کلام اور نظر ثانی سے محروم ہے۔

اُفقِ دل پہ مرے عیش و طرب دو نو بہم / آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر تو ام
ایک کا ایک سے وہ ربط سخن تھا گویا / دو لب یار ہیں یا حضرت عیسیٰ ہمدم
روشِ ناز پہ ہمدوش تھے یوں جیسے کبھی / لام الف لکھتا تھا اسلام کا یاقوت رقم
یا تھے دو مصرع مربوط بہم دست و بغل / یا کہ پیوند تھے دو نخل گلستان ارم
مل کے دو تار نظر ایک ہوئے تھے دو نو / یا وہ اک بینی کے دو پردے تھے باہم ہمدم
دو نو پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں / کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھے نہ جعدِ پُرخم
ایک معنی کے وہ لفظ مترادف تھے دو / ایک مضموں کے دو فقرے تھے مگر مستحکم
تھے جڑے دو دُرِ شہوار کہ ہرگز نہ ملیں / ابر نیساں سے ملیں لاکھ اگر قطرۂ یم
ایسے تھے دونوں وہ یک دل کہ دو قالب یکجان / یک زبان دونوں وہ اس طرح کہ جوں چاک قلم
آئے لپٹے ہوئے یوں عالم سرشاری میں / نالۂ زیر کے ہمراہ ہو جوں نالۂ بم
میں نے پوچھا جو سبب اُن کے بہم ہونے کا / تو یہ ہاتف نے کہا غیب سے ہو کر ملہم
ہو کیوں مضموں کے دلِ تنگ میں معنی ہوں نہ تنگ / جب ہے معلوم تو پھر بات رہے کیوں مبہم
آج اُس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طوبیٰ لہٗ / کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم
کون وہ؟ ظلِ خدا شاہ محمد اکبر / جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گر ارباب ہمم
شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم / ہو سلامت روی اُسکی بہ سلامت منضم
اس لئے عیش و طرب مثل قران السعدین / متفق ہو کے پئے تہنیت آئے اس دم
یُمن اس عقد نے بخشا ہے جہاں کو ایسا / جو گرہ آج لگائیں سو ہے لگتی محکم
آج وہ دن ہے مبارک کہ ابھی لائے ثمر / دو درختوں کو جو پیوند لگائیں باہم
دیتا شکلوں میں ہے پیوند بدیہ الانتاج / یہ قلم سمجھے نہ تہذیب نہ جانے سُلّم

بزم عشرت کی طرف کرتا ہے جو نظارہ
پڑھتا یہ مطلع رنگیں ہے وہ ہو کر خرم

ہے اٹھا عیش کا طوفاں بسرِ ساحلِ یم
زمزمہ موج کا بربط سے ہوا ہے ہمدم

گٹکری کا سا ہے پچھا یہ گلوئے مینا
ہچکیاں قلقلِ مینا جو ہے لیتی پیہم

لوگے جس ساز خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑوگے کھرج کا تو سنو گے پنجم

اثر نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا
کہ سوا راگ کی سم کے ہے کوئی اور بھی سم

جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ سے حرام
وجد میں آئیں سنیں آج گر آہوئے حرم

تار طنبور بنی آج رگِ سنگِ صفا
بے زباں زمزمہ سازی کرے موجِ زمزم

نہیں کچھ دور کہ تبدیل ہو کعبہ کا لباس
تا کہ دکھلائی نہ دے صورتِ اہلِ ماتم

دھوم اس شادی کی یہ ہے کہ منڈھے کی صورت
چھا گیا گلشنِ آفاق پہ ہے ابرِ کرم

رقعہ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہوا
کہ جوانانِ چمن آئیں جو ل کر باہم

شاخِ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا
زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

عطرداں میں گلِ نرگس وہ بھرے عطرِ سہاگ
سارے گُل بھرنے لگیں بلبلِ بیتاب کا دم

بل بے تیاری پوشاک کہ چرخِ اطلس
لایا اطلس جو لگانے تو یہاں نکلی کم

یہ خیاطہ کی ہے جلدی کہ کھلا جاتا ہے
شکم کرم بریشم ہی میں تارِ ریشم

یہ چڑھاوے کی ہے کثرت کہ جڑے ہیں ہر صبح
دُگدگی پر گُل داؤدی کے ہیرے شبنم

اللہ اللہ رے نوشہ ترا عالی رتبہ
جس کی انگلی میں پہنائے گا سلیماںؑ خاتم

ہوئی نوبت کی یہ نوبت کہ سحر اسکی ٹکور
گوشِ افلاک سے بھرتی ہے سوا گوشِ اصم

نئے قلیاں کو بھی گر منہ سے لگاتا ہے کوئی
تو وہ بھرتی ہے ہم آوازئ شہنائے کا دم

پہنچا یہ طنطنۂ کوس کا گردوں پہ دماغ
کہ نہیں رکھتا مریخ روئے زمیں اپنا قدم

آتی اس طرح سے پیہم ہے جلاجل کی صدا
کہ پریزاد ہے آتی کوئی کرتی چھم چھم

کہتا ہر دم ہے یہ نقارچیٔ مہرِ فلک
کہ تھا مدت سے دمامہ کا مرے پھولا شکم

سارے ارمان نکالوں گا وہ اس شادی میں — اسکے سینہ سے جو نکلینگے بآوازۂ بم
جو گھڑے روپے کے اور سونے کی ٹھلیاں ائیں — صف بہ صف دیکھ کے ان کو یہ پکارا عالم
ہے یہ سلکِ دُرِ شہوار بگوش بہجیت — یا کہ ہنستی ہے خوشی دانت نکالے پیہم
ہر سبوچے پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ — اپنے اُبھرے ہوئے پستاں پہ چڑہاوے محرم
دیکھ نقلوں کو سبوچوں میں یہ حیران ہے خلق — کہ بھرے موتیوں سے کیونکہ حباب لب یم
ایسے شیریں کہ اگر رکھے زباں پر ان کو — وصفِ شیریں سخنی پائے زبان ابکم
کروں تحریر جو رنگت کو حنا بندی کی — شاخِ گل مہدی ہو پھولوں سے ابھی ہر قلم
ہوئے روشن جو کنول شکل رُخِ آتشناک — تو لٹیں اُنپہ دھوئیں کی ہوئیں زلفیں پُر خم
کاغذِ زرد کے پھولوں میں یہ گل کترے تھے — آگیا تھا گل صد برگ کا پھر کر موسم
نخلِ آرائش اگر دیکھو تو ایسے دلکش — نوجوانانِ چمن جیسے بصد ناز و نعم
بیاہ کی شب وہ تجمل تھا کہ اللہ اللہ — کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم
سچ کہو کرتے ہو نظارہ جہاں کا جب سے — کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا تمھیں آنکھوں کی قسم
دیکھے دولہا کے نہیں دست حنا بستہ ابھی — ورنہ مٹھی کا ابھی غنچہ کی کھل جاتا بھرم
مُنہ پہ نوشاہ کے یوں سہرہ زرتار کی زیب — روئے خورشید پہ جوں خطِ شعاعی کی جھلم
ہوا شبدیز فلک سیر یہ دولہا جو سوار — روز نے صدقہ کیا اشہب و شب نے ادہم
وصف میں اُسکے پڑہوں کیونکہ نہ اک مطلع میں — توسن طبع نے اب تیز نکالا ہے قلم

یار ہمدم نہیں لیکن ہے وہ نسلِ آدم
ہے وہ اُس نسل میں جس اصل میں رخشِ رستم

رمز راکب سے یہ آگاہ وہ صرصر رفتار — گذرے گر دل میں توقف تو وہیں جانے ہے تھم
ہے تو وہ حور شمائل۔ نہیں پریزادۂ حور — خوئے آدم ہے ولیکن نہیں نسل آدم
چادریں بھیجنا مہتاب کی ہے بسکہ فلک — چاہیئے اس کو زمیں پر نہ گلیم و نہ گلم
نور کے قطرے فلک سے ہیں زمیں پر برسے — چھوٹتے گنج ستاروں کے کہاں ہیں پیہم

سر اُٹھایا یہ ہوائی نے کہ آخر کو ہوا
شعلہ اس کا علمِ کاہکشاں کا پرچم

ٹہنیاں جھومی ہیں اس رنگ سے نافرماں کی
جیسے رکھے ہوں تراشے ہوئے جامِ نیلم

ہاتھی لڑتے نہ سمجھنا۔ بلِ عشرت نے بزور
سر کو دو کوہ کے ٹکرایا ہے مانند غنم

نخل پھولا ہوا دم بھر میں نکل آتا ہے
ہے اناروں میں اچنبھے کا تماشا عالم

چھوٹے گھن چکر اس انداز سے کھا کر چکر
چرخ میں آیا ہے جیسے دیکھ کے گردوں دُژم

پھولیں کیونکر نہ چمک کر گل آتشبازی
شاخ تھی گل کی قلم بن گئی شورے کی قلم

جھاڑ ابرک کے ہیں۔ چادر مہتاب کے ہیں
جڑ تلک لپٹے ہوئے نخل گلستانِ ارم

شجرِ طور کا جوں وادیٔ ایمن میں ہو نور
شمع ابرک کے کنول میں ہے دکھاتی عالم

ہیں جو سرگرمیٔ شادی سے فتیلے روشن
تاب کیا خانۂ گیتی میں رہے سایۂ غم

باندھے سو شعلۂ فندق بسر ہر انگشت
پنج شاخوں کو کہوں میں نہ کبھی دستِ صنم

کھولا مصحف۔ تو زہے یمن کہ سرِ لوحِ ورق
اسمِ اعظم تھا عیاں خطِ شعاعی سے رقم

رونمائی پہ لگی رشک سے زہرہ گانے
غیرت از چشم کنم روئے تو دیدن ندہم

ایسی شادی کے تجمل کو لکھے کیا کوئی
دھوم ہے جس کی گئی تا سرِ ہفتم طارم

جی میں ہے توسنِ خامہ کی عناں پھیر کے میں
مدح اکبر شہ ثانی کروں پھر زیبِ رقم

جس کے باعث سے منور ہے چراغِ خورشید
جس کی دولت سے ہے آراستہ بزمِ عالم

اُس کے دیں داری کے نقارہ کی اللہ رے صدا
از عجم تا بہ عرب اور ز عرب تا بہ عجم

جس سے پوچھو کہ تو آگہ ہے؟ کہیگا کہ بلے
انت نعم انت کہو جس سے وہ کہیگا کہ نعم

مدح میں اُس کی رقم کرتا ہوں اک تازہ غزل
کہ غزلخواں ہے ہر اک آج بجانِ خرم

تو ہے وہ ابرِ سخا۔ تو ہے وہ دریائے کرم
جس میں ہوں فلس کی جا کیسۂ ماہی پہ درم

چارہ گر ہو جو ترا لطف تو پھر کیا ہے عجب
مشک سودہ کرے ہر زخم پہ کارِ مرہم

پہنچی ہے روحِ عدو سہم کے ناوک سے ترے
مثلِ آہوئے رمیدہ سرِ صحرائے عدم

تیرا خنجر ہے نہنگ ایسا کہ غرق زہر آب
تیری شمشیر وہ اژدر ہے کہ ہے آتش دم

حق میں اعدا کے ترا تیر ہے پیغامِ قضا
اور ترا جوہر شمشیر قضائے مبرم

توڑے دل شیشہ کا ہرگز نہ ترے عہد میں سنگ
رحم کھا وے کہ لیا اُس نے مرے گھر میں جنم

تیرے انصاف کا پرتو ہے جو عالم پہ محیط
تو نہ پایا ہے نہ پائینگے فروغ اہل ستم

روبرو بچۂ آہو کے نہ روشن ہو چراغ
ڈالے روغن کی جگہ اُس میں جو پیہ ضیغم

ق

گلشن مدح میں دے تیرے ترا ذوقؔ لگا
خرمن گل کی جگہ تازہ مضامیں کا اٹم

پر یہ سمجھا کہ ہے جز کرتا دلالت گل پر
کہہ کے اک شمہ تری وصف کا اے نیک شیم

یہ دعا کرتا ہے دل سے کہ مبارک ہو تجھے
شادی وصلت فرزند بصد جاہ و حشم

ہو شبستاں میں ترے دست و بغل عیش و طرب
گھر میں حاسد کے دل آشوب رہیں محنت و غم

قصیدہ نمبر ۹

یہ قصیدہ مبارکبادی مرزا سلیم شاہزادہ کی شادی میں لکھا تھا۔ بندہ آزاد اُن دنوں طفلِ مکتب بھی نہ تھا۔ جب حاضرِ خدمت ہونے لگا تو حضرت مرحوم اکثر اسکے اشعار پڑھا کرتے تھے ڈھونڈنے کی فرصت نہ تھی۔ ایک برس وفات سے پہلے فرمایا کہ اگر ہوتا تو اسے درست کرتے طبیعت نے عالمِ جوانی میں بلند مضامین پیدا کئے تھے۔ خیر اکثر اشعار اور مطالب خیال میں ہیں۔ ایک قطعہ لکھدیتے ہیں چنانچہ ۲۲ شعر کا قطعہ لکھا اور عیدِ قرباں کی تہنیت میں ابوظفر بہادر شاہ کو سُنایا۔ بعد انتقال کے یہ قصیدہ بھی نکلا الحمدللہ کہ یہاں تک پہنچا۔ اول قصیدہ لکھتا ہوں۔ پھر قطعہ

دل کہ اس دہر میں ہے گرسنۂ نازِ بتاں
زخم تیغ اس کو غنیمت ہے کہ دیکھا لب ناں

ہوں وہ لب تشنہ کہ میں دامنِ دریا سمجھوں
برق پُرسوز کا ہاتھ آئے جو طرف داماں

وہ خنک دل ہوں کہ جس کے نفس سرد سے آہ
دم میں یخ بستہ ہو چشمۂ مہر رخشاں

میں ہوں وہ شعلۂ جوّالہ بزیرِ گردوں
کہ اگر دل کو قرار آئے تو جگر میں ہو جاں

ہیں وہ مجنوں جگر تفتہ ہوں جس کے دمِ فصد
ہر بُنِ مو سے عوض خوں کے نکلتا ہے دھواں

چشمِ سوزن سے نہ لو سلسلہ زنجیر کا تم
دلِ وحشت زدہ ہے لاغر بے تاب و تواں

ہوں وہ افتادہ کہ ہمت کبھی یاور ہو تو ہو
دستگیر آکے عصاءِ مژہ مورچگاں

ہوں وہ تصویر سرِ صفحۂ عالم جس پر
ہو قلم دو تو کرے کارِ سنان و پیکاں

دل گرفتہ ہوں وہ میں دہر میں مانند انار
اک گرہ وا ہو تو ہو صد گرہ اندر داماں

ہوں وہ فرسودۂ غم جس کے بچشمِ بینش
کرتا سرو چمن دہر ہے کارِ سوہاں

قطرۂ شبنم کا ہو گل پر تو مری نظروں میں
سنگِ حسرت ہو کہ رکھتا ہوں بزیرِ دنداں

میں ہوں وہ کشت کہ بیگانہ ہے سبزہ جس سے
اور اگر ہے تو ہے آغشتۂ زہرابِ سناں

فلکِ سبز کے نیچے ہوں میں تلوار کا کھیت
آبِ شمشیر مجھے دو کہ یہی ہے مری جاں

ہوں وہ خود رفتہ کہ جوں عمر تلف کردہ مجھے
حشر تک ڈھونڈیں تو ممکن نہیں ہاتھ آئے نشاں

ماہِ نخشب کی طرح ہوتا عیاں ہوں سرِ کوہ
اور ابھی پل میں جو دیکھو تو عیاں ہوں نہ نہاں

ہوں وہ سرگشتہ کہ گر ساقی و ساغر جا ہوں
حلقۂ دورِ فلاخن ہو بدستِ دہقاں

اس گلستاں کی روش پر گل بازی ہوں میں
نہ اِدھر ہوں نہ اُدھر ہوں نہ وہاں ہوں نہ یہاں

دل نے لیموں سے کیا رنگ طلا کا روشن
ترش روئی سے رُخِ زرد ہے میرا تاباں

میں وہ گردش زدۂ دہر ہوں جس کا پسِ مرگ
سنگِ تعویذ بھی چکر میں ہو مانندِ فساں

میں وہ ہوں بسملِ دل خوں شدہ جسکے خوں میں
تیغِ قاتل روشِ کشتئ دریا ہو رواں

اشکِ خونیں ہے مرا آتشِ یاقوتِ یمن
گرچہ ہوں آب میں لیکن ہوں ہمیشہ سوزاں

دل اُڑا جاتا ہے جل جل کے جو بن آگ مرا
طائرِ رنگِ حنا بن کے ہوا ہوں پرّاں

طفلِ معصوم کا ہے خواب مری موت و حیات
کہ یہی لب مرا خنداں ہے یہی ہے گریاں

وہ سیہ بخت ہوں میں خاک نے جس کی یکسر
ہے سیہ کر دیا آئینۂ چرخِ گرداں

میں وہ بیمار ہوں مایوسِ شفا جس کے لئے
دمِ عیسےٰ نے کیا کارِ نفوسِ ثعباں

اُٹھ سکا سر نہ مرا مزرعِ گیتی میں ذرا
دل رہا دانۂ روئیدہ تہِ سنگِ گراں

شرحِ جانسوزی سے میری نئے قلیاں کی طرح
کیا عجب نالے قلم سے جو نکل آئے دھواں

دلِ مایوس یہ تھا کہہ رہا مجھ سے کہ خرد
یوں لگے کہنے کہ ہے فائدہ کیوں آہ و فغاں

پھر تو کر غور کہ مدّاح ہے کس شاہ کا تو
دیکھ وہ ابرِ کرم قلزمِ جود و احساں

وہ شہنشاہ کہ جشن اس کا ہے افلاک کی سیر
ہنستے مہوش ہیں تو کرتے ہیں ستارے افشاں

ماہِ گردوں پہ ہے اور آکے زمیں پر مہتاب
کثرتِ عیش سے دریا میں ہے شب کو رقصاں

سُن کے یہ مژدۂ جاں بخش ہر اک کو یہانتک
شوقِ نظارہ ہوا عام یہ گلزارِ جہاں

دیکھتا ہوں کہ سرِ شاخِ مژہ کا سرِ چشم
رُخِ نظارگیاں پر ہے بنا نرگس داں

آج عالم کا ہے دل شاد کہ جوں عالمِ نور
جلوہ گر ہے سرِ اورنگ بصد شوکتِ شاں

ماہِ فرخندہ لقب شاہ محمّد اکبر
تاجِ شاہانِ زماں فخرِ سلاطینِ جہاں

دیکھا ہے دولت و صولت کا جو اُس کے اقبال
دہرِ سرکش کا بھی قد ہو گیا خم مثلِ کماں

مدحِ حاضر کے لئے حاضرِ دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانیِ ہند اور وہ ہے خاقانِ زماں

پوچھ لو آج فلک سے کہ ہے خورشید کہاں؟
گر ہے کچھ وزن تو آجائے بسوئے میزاں

تیرے جلوہ کے تجلّی نے جو روشن کیا دل
ہو گیا شمع مرے سینہ میں تارِ رگِ جاں

آستیں اپنی ہلا دے جو ترا دستِ کرم
ہر شکن سے ہو عیاں لجّۂ بحرِ عمّاں

کیوں نہ اسباب ہم ہوں تری ہمت کے غلام
حق یہی ہے کہ اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُ الْاِحْسَان

آگے دریا ترے خود کھولے ہے لبہائے سوال
کہوے کس منہ سے کہ پنجہ بھی ہے رکھتا مرجاں

سُرخروئی ترے حاسد کو جگر خواری ہے
شیر کے بال سے ہے تیز تر اُس کو رگِ جاں

کانپتے ہیں ترے ہیبت سے پلنگ اور نہنگ
بحر و بر پر ہے تری تیغ کی پُرسش یکساں

ہے زرہ رکھتی اسی واسطے ماہی تہِ آب
پہنے جوشن ہے نیستاں میں ہر اک شیرِ ژیاں

تیغ ہندی تو کمر میں ہے پر ایک اک جوہر
رکھتا در زیرِ نگیں ہے صفحاتِ صفہاں

کوہ پر بیٹھ کے یوں بیٹھے بہ پشتِ ماہی
جیسے ابر دئے بتاں ہو بہ آئینہ عیاں

ترے خنجر کو بلا شبہہ قدرت سے ہے زور
مرغ دل سینوں سے جوں زاغ و زغن ہیں پرّاں

تیر ناوک کو ترے دیکھ کے ہے لوٹ رہا
طائرِ قبلہ نما خاک کر یگا طیران

آتش قہر کی ہیبت سے تری نارِ سعیر
رکسی شعلہ سے ہے انگشت بزیرِ دندان

گنبدِ چرخ ہوا کلبۂ پر دود اُسے
روح کو سینۂ حاسد میں بجائے خفقان

تیرا فرماں تھا کہ فرماں بر دولت کے سوا
ہو وے اک برگ نہ پیدا بہ گلستان جہاں

ہوئے یہ منکرِ اقبال ترے ناپیدا
کہ چمن میں نہیں اُگتا ہے گل نافرمان

تیرے مہتاب کرم سے جو سپر قلزمِ قہر
پردۂ نور میں اُبلا ہے تنور طوفان

عدل نے تیرے دکھلائے ہیں بہم آتش و آب
آب آئینہ میں روشن ہے رُخِ برق وشان

دل افگار کا ہے سودۂ الماس علاج
سنگ ہے سنگ جراحت بہ سر زخم جہاں

تیری تاثیر محبت نے دیا ہے تریاک
ورنہ تھا زہر دلوں کو خطِ سبز خوبان

اُفق صبح سے کافور کا لیکر مرہم
رکھتا مہتاب ہے بر سینہ صد چاک کتان

سرزنش عہد کی تیری یہانتک معدوم
کہ نظر آتا نہیں دشت میں کانٹوں کا نشاں

بے علف نافۂ لیلیٰ ہے مگر قیس غریب
نہیں دیتا بہ ضیافت سر خارِ مژگان

خسروا تیری توانائیٔ اقبال سے آج
ناتوانوں کو ہوئی دہر میں یہ تاب و توان

مور کا سلسلۂ نقش قدم گر ہو کہیں
اپنے حلقہ میں جکڑ لیتا ہے صد پیل دمان

آگے جلوہ کے ترے پرتو خورشید ہے گرد
آگے رتبہ کے ترے خاک ہے جرمِ کیوان

اس تصور میں جو ہے پیشِ نظر عالمِ نور
اس کو اک مطلعِ موزوں میں ہوں کرتا میں بیاں

گر تری ذات نہ ہو کعبۂ اقبال جہاں
آسماں ہوئے نہ پھر پھر کے زمیں کے قرباں

ہوس ناصیہ سائی تری خورشید کو زور
سوکشاں لاتی ہے در پہ ترے سر گرداں

مہرگاں ہمت عالی کا جو بادل لائے
ایسے نیساں سے وہ آفاق پہ ہو قطرہ فشاں

جن کی شادابی گوہر کو اگر دیکھے تو دور
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یرقان

آتشِ قہر و غضب تیری عیاذاً باللہ
مشتعل ہووے اگر سوئے گلستانِ جہاں

ہے یقیں صورتِ نخلِ گلِ آتشبازی
نخلِ فوارہ بھی پانی میں رہے شعلہ فشاں

ماجرائے خامہ نے شیریں سخنی کا تیری
صورتِ موج میں دریا کے دیا تھا بزباں

سخن و اہلِ سخن سب سرِ ساحل تھے کھڑے
دونوں لب اس کے حلاوت سے بہم تھے چسپاں

وصفِ شوخی ترے توسن کا ہو کس طرح رقم
کہ قلم صفحۂ کاغذ پہ ہے جوں برق طپاں

باندھوں کس طرح سے مضمون سواری میں اسے
تڑپ اٹھتا ہے کرے جنبش اگر طبع رواں

قلم و حرف نہیں پیشِ نظر ہیں اس دم
سر حاسد سے ہے دل کھیلا گوئے و چوگاں

کہوں شائستگی اس بادیہ پیما کی میں کیا
تازیانہ ہے بکار اس کو نہ درکار عناں

نہیں انساں ہے مگر کام ہیں انساں سے فزوں
پر نہیں۔ پردہ پری سے ہے زیادہ پرّاں

خسروا سرعتِ رفتار ہو گر مدِ نظر
پہلے ہو قاف سے تا قاف سراسر میداں

جلوہ گر خانۂ زیں پر ہو پھر اس شان سے تو
بر سرِ دوشِ صبا جیسے شمیمِ ریحاں

تازیانہ جو لگاوے تو کفل پر اُس کے
اور چمک کر کبھی اڑ جائے وہ بجلی تہِ راں

ابھی کوڑے کی صدا کوہ سے پھر کر نہ چلے
وہ کئی بار پھرے وہاں سے یہاں یہاں سے وہاں

کیا دکھاؤں ترے ہاتھی کی بلندی شاہا
آئے کوسوں سے نظر جب تو عیاں را چہ بیاں

جھومتا جھامتا آتا ہے درِ دولت پر
کہتے ہیں ساقی طناز سے یوں بادہ کشاں

سمتِ قبلہ پہ ہے ابر آیا سرِ دوشِ ہوا
خُم پہ خُم آج چلے۔ جام نہ آئے بمیاں

اس کی مستک پہ سپر اور وہ نگارِ خرطوم
کریں آنکھوں پہ رقم قوسِ قزح کا عنواں

اور اگر یہ نہیں مضموں تو کسی مہوش کی
زلف پر گل ہے دیا کاکلِ عنبر افشاں

اس کے دنداں یہ نہیں غور سے دیکھا میں نے
کشورِ زنگ میں آئے ہیں فرنگی بچگاں

کیا لکھوں آگے ترا وصف کہ منہ میں ہیرے
پاسِ آداب سے جوں شعلہ زباں ہے لرزاں

ختم کرتا ہے ثنا تیری دعا پر اب ذوق
کہ زباں کو لبوں سے آگے نہیں یارائے بیاں

تجھکو یہ جشن مبارک ہو بصد جاہ و جلال
عقل ہو پیر تری بخت رہیں تیرے جواں

جو دعا گو ہیں ترے ان کی دعائیں ہوں قبول
صبح جشن طرب افزا میں ہو دائم خنداں

اور برنگ شب دیجور ترے سب بدخواہ
روسیہ محفل عالم میں ہوں جوں ماتمیاں

یہ ہی قطعہ ہے کہ قصیدۂ مذکور کی طرح میں وفات سے ایک سال پہلے تحریر فرمایا۔

خسروا جلوہ ترا وہ طرب افزائے جہاں
کہ جسے دیکھ کے ہو عید بھی قرباں قرباں

حکم دے تو جو شہا واسطے قربانی کے
سعد ذابح بھی کرے ایسا چھری کو براں

گاؤ گردوں نہ فقط خوف سے اس دم کانپے
بلکہ ہو زیر زمیں گاؤ زمیں بھی لرزاں

تو جو ہو حامیٔ اسلام تو بت خانہ میں
بت کرے قصد نماز اور کہے ناقوس اذاں

نیر جاہ شب و روز ترا جاوہ فروز
مہر تاباں کبھی ظاہر ہے کبھی ہے پنہاں

قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحاب ہمت
لیکے پنجہ میں گہر بحر سے نکلے مرجاں

اور گہر بھی ہوں وہ خوش آب جنہیں دیکھ کے دو
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یرقاں

نطق شیریں ترا وہ ہے کہ ثنا میں اس کے
تر زباں موجۂ دریا ہو اگر ایک زباں

آب دریا میں ہو یہ جوش حلاوت پیدا
لب دریا بھی بہم ہو کے ہوں دونوں چسپاں

اس قدر تابع فرماں ہے زمانہ تیرا
نہ ہو گلشن میں بھی روئیدہ گل نافرماں

ہو کے سر سبز بہاران کرم سے تیرے
شاخ پر گل چمن دہر میں ہو شاخ کماں

بلکہ حیرت کی نہیں جا کہ سر شاخ خدنگ
روش غنچہ گل ہوئے شگفتہ پیکاں

وہ ترا زور حمایت ہے کہ جس کے باعث
ناتوانوں کو بھی ہو دہر میں یہ تاب و تواں

ہل سکیں پھر نہ جگہ سے کبھی گر باندھ رکھیں
ایک تار رگ مور سے سو پیل دماں

دیگ مطبخ پہ ترے یہ فلک پر انجم
کیا عجب صورت سرپوش ہو گر قطرہ فشاں

پیل تیرا گل سوسن کا پڑا ہے انبار
گل مہتاب کے گلدستہ ہیں اُس کے دنداں

اس کی خرطوم کسی دلبر لیلیٰ وش کی
جعد مشکیں ہے کہ ہے کاکل عنبر افشاں

لکھوں شوخی جو ترے توسن چالاک کی میں
جنبش خامہ بھی ہو موج رم برق جہاں

وقت کاوہ کے دمِ معرکہ راکب اس کا	سرِ حاسد کو رکھے صورتِ گوئے چوگان
دل میں ہیں جوشِ مضامیں تو نہایت لیکن	دل حوادث سے زمانے کے ہے بیتاب و تواں
ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر تیری	کیا لکھے وہ تیرے اوصاف کہ قاصر ہے زباں

عید الضحیٰ تجھے ہر سال مبارک ہووے
تجھ پہ ہو سایۂ حق اور ترے سایہ میں جہاں

قصیدہ نمبر ۱۰

جب پہلے پہل ۱۲۴۵ھ ہجری میں سائیں نثار علی شاہ وارودہلی ہوئے بیان کیا کہ اورنگ آباد ہمارے وطن میں میاں عاشق نہال چشتی ایک بزرگ ہیں ان کے ہم دیکھنے والے ہیں۔ استاد مرحوم کی خوش اعتقادی نے جب ہی ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اور تعجب یہ کہ ان کے پاس مسودہ بھی نہ رہا تھا۔ کوئی کوئی شعر سنایا کرتے تھے۔ سائیں نثار علی شاہ اندنوں ایک سید بزرگوار کے گھر میں اُترے تھے۔ خدا کی قدرت ۲۶ برس کے بعد اس گھر میں کوئی بھی نہ رہا۔ مگر ایک پاکیزہ نفس۔ پاکدامن اہل اللہ۔ بی بی۔ میں کبھی کبھی ان کی سلام کو جایا کرتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے ایک لستہ اجزا کا دیا۔ کہ سائیں یہ چھوڑ گئے تھے۔ ان میں دیکھوں تو قصیدۂ مذکور ہے۔ جو اُستاد مرحوم نے اورنگ آباد بھیجنے کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ آج اس کی تحریر کو پورے ساٹھ برس اور کئی مہینے ہوئے۔ بچ تو گیا ہے۔ اللہ شہرت عام اور بقائے نام نصیب کرے۔ اصل سے نقل ہوتی ہے۔

پیشانی پر یہ عبارت لکھی تھی

قصیدہ در مدح زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حضرت سید عاشق نہال چشتی ادام اللہ برکاتہم

ہے ابرِ دُر فشاں وہ چمن میں کمال کے	عاشق نہال کیوں نہ ہوں عاشق نہال کے
ہیں دیدہ ورستاروں میں خورشید و ماہ اگر	روشن ہیں دونوں نور سے اس کے جمال کے
اس کی نگہ سے گر جگرِ سنگ پائے رنگ	بھر جائیں پل میں لعل سے دامن جبال کے

ہے بحر اس کے سامنے کشتی بکف گدا
بھرتا صدف ہے کھولے ہوئے لب سوال کے

ہیں اس کے در کے خاک نشینوں کے دل غنی
خواہاں وہ ملک کے ہیں نہ جویاں ہیں مال کے

دنیا نے خاکساری اسے دی ہے نذر میں
مٹی خمیر یہ ہے گہر ہیں کلال کے

ہو اس کا حکم عام جو بر منع انقطاع
رہ جائے ارّہ چوب پہ دنداں نکال کے

دل جس کا اس کے زور حمایت سے ہے قوی
وہ ببر زال سمجھے ہیں رستم کے زال کے

ہیبت جو اس کی وادئ حق میں کرے ظہور
جا بیٹھے چھپ کے شیر بھی گھر میں غزال کے

اس کی شمیم خلق معطر کرے جو گل
لے لے کے سونگھیں اہل چمن پھول ڈھال کے

خوشبو سے اس کی فیض کے ہوتا ہے مشکبو
ہے وہ جو خون جام میں ناف غزال کے

کیا تاب رات دن میں تغیر ہو بال بھر
وہ لائے گر زمانہ میں دن اعتدال کے

ہو شکر ثنا سے اگر اس کی کامیاب
لب بند ہو ویں طوطئ شیریں مقال کے

طائر بھی اس کے ذکر سے ہیں سرخرو ہوئے
نکلے ہے بیر بیر صدا منہ سے لال کے

آب گہر میں ہووے رواں کشتئ گدا
دست کرم سے اس شہ دریا نوال کے

جی چاہتا ہے ہو کے مخاطب بیاں کروں
اوصاف ایسے شاہ کرامت خصال کے

اے سید جلال کے خورشید پُر جلال
قربان جائیے ترے جاہ و جلال کے

تو شمع بزم خاص کہ پیدا کیا تجھے
صانع نے اپنے نور کے سانچے میں ڈھال کے

گردوں بھی پست ہو کے ہوا خوب منفعل
رتبہ کو دیکھا جب ترے اوج کمال کے

انجم جنہیں ہیں کہتے منجم جہاں کے
قطرے جبیں پہ ہیں عرق انفعال کے

اے شاطر زمانہ تصدق ہو بیل چرخ
شطرنج عشق میں ترے گھوڑے کی چال کے

دیکھا جو تیرے فیض کو جاری تو رہ گیا
دریا بھی منہ بھنور کے گریباں میں ڈال کے

جس دل پہ تو نگاہ کرے اس کے سامنے
جام جہاں نما ہے برابر سفال کے

ق

ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا جمال
روشن ہوا کمال سے قطب شمال کے

سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب ترا ذکر خیر
گویا اذاں کو سنتے ہیں منہ سے بلال کے

سر تا قدم ہیں شوق ترے طالب جمال
ساعت بقدر روز ہے اور روز ہفتہ وار
بیتاب اس طرح ہیں ترے اشتیاق مند
مرغ نظر کے ساتھ اُڑا چاہتا ہے دل
جاتا ہے دوڑ دوڑ کے ہر دم تری طرف
شاہا یہ تیرا ذوق ہے امیدوارِ لطف
تا جلد اس کا کوکب طالع پئے عروج
کر دے بہار نام سے اپنے اسے نہال
دنیا میں زندگی کرے آرام سے بسر

مشتاق روزہ دار کھڑے ہیں ہلال کے
ہر ہفتہ ماہ وماہ برابر ہے سال کے
جیسے طیور تازہ گرفتہ رجال کے
مژگاں سے دونو بازوؤں پر پر نکال کے
دھو دھو کے پاؤں نیچے پیک خیال کے
ہو حال پر نگاہ اس آشفتہ حال کے
آجائے سمت اوج پہ گھر سے وبال کے
جھونکوں میں آگیا ہے سموم ملال کے
ایمان اس کے ساتھ ہو وقت انتقال کے

نکلے بہ صبح حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمدؐ کی آل کے

بقلم مصنف عقیدت کیش صداقت اندیش سراپا شوق شیخ ابراہیم ذوق - برائے نذر جناب فیضمآب گلشن فضل وکمال۔ حضرت سید عاشق نہال چشتی بتاریخ چہاردہم جمادی الاول روز پنجشنبہ ۱۲۴۵ھ ہجری قدسی مطابق ۴۲ء۔ اکبر شاہی در قلعہ شاہ جہاں آباد د
گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

قصیدہ نمبر ۱۱

در مدح ابو ظفر بہادر شاہ مرحوم

استاد مرحوم جشن کی مبارکباد کے لئے کئی دن سے قصیدہ مرقوم الذیل لکھ رہے تھے بعد شام صاف کرنے بیٹھے کہ صبح دربار میں پڑھیں گے۔ چند شعر لکھے تھے۔ جو مرزا علی عرض بیگی کا آدمی آیا اور کہا مرزا صاحب نے آداب عرض کیا ہے (اور آہستہ سے

کہا) اسی وقت بیگم صاحبہ کا حکم پہنچا ہے کہ کل استاد قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تعریف نہ کرے۔ آپ کو خیال رہے۔ استاد نے کہا بہت خوب۔ میری طرف سے انہیں دعا کہنا۔

وہ شخص رخصت ہوا۔ آپ تھوڑی دیر خاموش سوچتے رہے اور ایک دم گرم بھر کر کہا۔ اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے؟ خدائی کے منہ بند کرتی ہے؟ میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوان خاص کے در و دیوار سے واہ وا لوں گا۔ یہ کہا اور پھر لکھنے لگے۔ رات کے دو بجے تک قصیدہ صاف کر لیا۔

صبح کو دربار میں حاضر ہوئے۔ وقت معین پر ایما ہوا کہ استاد اپنا قصیدہ عرض کریں۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود۔ کئی شعر پڑھ گئے سب صمٌ بکمٌ۔ جب ساتواں شعر پڑھا۔ تو بادشاہ نے اشارہ کیا کہ آگے آؤ۔ اور آگے آؤ۔ پاس پہنچے تو اشارہ کیا کہ سر جھکاؤ۔ اور ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا۔ پھر کہا۔ ہوں؟ (یعنی پھر پڑھو) پھر جو پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے تھے۔ خوب تعریفیں ہوئیں بیگم نے بھی سُنا۔ کلیجہ مسوس کر رہ گئیں ۱۸۴۹ء میں لکھا تھا۔

پیری میں پر ضرور ہے جام شراب ناب — پائے فروغ صبح نہ بے نور آفتاب
تائبؔ ہو تو اس سے کہ ڈاڑھی ہوئی سفید — کر خوب مے کشی کہ یہ ہے سیر ماہتاب
ہے پیر دل خنک کی ہوا پر بقائے عمر — یہ برف وہ نہیں جسے رکھیں نمد سے داب
ہستی کا اپنے کر نہ بھروسہ حباب وار — تعمیر بے بنا ہے یہ اور خیمہ بے طناب

لہ۔ بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارت سلطنت ان کے نام کر دی تھی۔ اور ان کی طرف سے محبوب خواجہ سرا کل دربار اور کاروبار کا انتظام کرتا تھا۔ خلیفہ اسمٰعیل کے پاس بعض خدمتیں تھیں وہ بیگم نے لے لی تھیں۔ اس لئے اسے ہمیشہ خطر تھا۔ کہ شاید استاد بیٹے کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ بادشاہ استاد کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ مگر استاد نے نہ پہلے نہ بعد خلیفہ مرحوم کی سفارش میں کچھ کہا نہ بیگم کی شکایت کی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ کسی کی شکایت سے بھی زبان آلودہ نہیں کی ان کا قول تھا کہ زبان جوہر لطیف ہے۔ اسے عیب سے آلودہ کرنا اچھی بات نہیں ۱۲

آئی ہے جب سے قالب خاکی میں تیری جاں — غافل پئے سفر ہے اسی دن سے پا بہ رکاب
جو دم منہ سے گزرے غنیمت سمجھ کہ روز — گردش ہے آسماں کو زمانہ کو انقلاب
ہر بازیٔ فلک پہ تو نوروز روز کر — رکھ آفتاب گنجفہ پر سال کا حساب
حاصل ہے کیا ہنر سے دلا آئینہ کو دیکھ — جوہر سے دل میں رکھتا ہے کیا رنج پیچ و تاب
گر ہو سکے تو خاکِ درِ میکدہ ہو تو — اس خاکداں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب
آسودگانِ کنج خرابات کے لئے — جانا بہشت تک بھی ہے دوزخ کا اک عذاب
یاں تک ہیں بے دماغ نہ بولیں گے منہ سے وہ — دیگا جواب نامہ نکیرین کو جواب
رکھتا ہے چرخ اہل سعادت کو بد مذاق — گذران ہے ہما کی سرِ روزی کلاب
دیکھے جہاں کو دیدۂ عبرت سے تو اگر — جامِ جہاں نما ہے ہر اک کاسۂ حیات
ساقی جو تجھ کو عین عنایت سے جام دے — لے اور لگا کے آنکھوں سے پی جا اُسے شتاب
گر بے حساب جام پہ جام آئیں تیرے ہاتھ — روزِ حساب تک تو پئے جا علی الحساب
مستی میں ایسا مطلع تازہ کوئی سنا — جامی بھی لکھے دل پہ جسے کر کے انتخاب

گلشن کو دے جو گریۂ مستانہ میرا آب
بیضوں سے بلبلوں کے ہو پیدا بطِ شراب

گلگونِ نشۂ مے گلگوں پہ ہو مرا — پا بوسِ آسماں روشِ حلقۂ رکاب
مستی مری سکھائے اگر جھومنے کی طرز — ٹپکے ہمیشہ ابر سے مستی بجائے آب
بیہوشیوں میں ہیں مری وہ گرم جوشیاں — ہوتے ہیں جس سے طائر ہوش و خرد کباب
جاگ اُٹھیں وہ جو خواب عدم میں ہیں ہوشمند — غفلت میں گر بلند ہو میری صفیر خواب
نہ پردۂ فلک کو اُٹھا دوں اک آن میں — ہو جاؤں میں جو عالم مستی میں بے حجاب
ہو وہ سبو ابد ید فلاطوں میں خم نشین — کہہ بیٹھوں گر نشہ میں کوئی حرف ناصواب
یہ ذہن کو ہے عالم مستی میں روشنی — ہر خشت خم ہے حکمت اشراق کی کتاب
ہر روز جام بادۂ روشن کا مجھ کو شغل — ہے مثل شغلِ آئینہ و شغل آفتاب

پرہیز میرا یہ ہے کہ تقوے سے ہے گریز
تقوے ہے میرا یہ کہ ہے توبہ سے اجتناب

لیکن ہے ابرِ رحمتِ باری سے دُرفشاں
دامانِ تر مرا روشِ دامنِ سحاب

مداح ہوں میں اس کا کہ ہے جس کے دور میں
شیب زمانہ کے لئے کیفیتِ شباب

پیر فلک بنے ہے جوانِ سیاہ مست
ریشِ شعاعِ مہر پہ ہے ابر سے خضاب

مانند نافِ آہو اگر جام میں ہو خوں
اس کی شمیم فیض سے ہو جائے مشکِ ناب

اس شاہ کے نمِ کرم و بوئے خلق سے
ہر خار بن ہو ہمسرِ فوارۂ گلاب

وہ بادشاہ جس کا بہادر شہ اسم پاک
ہے دُرجِ زمانہ کا یکتا دُرِ خوش آب

ظلِ الٰہ۔ خسروِ دیندار۔ دیں پناہ
شاہ بلند جاہ و خدیو فلک جناب

تیغ اُس کی وہ ظفر دم و نصرت اثر کہ ہے
گنجِ ہزار فتح کے مفتاحِ فتح باب

روشن دلی سے اس کی عدو تیرہ بخت ہے
دزدِ سیاہ کار کو آفت ہے ماہتاب

ہو مغز جانِ کافرِ نعمت کے واسطے
مطبخ میں اس کے لپٹۂ نمرود ہر دتاب

ہے ابر میں بھی برق کا شعلہ مگر نہیں
اس میں دمِ وفورِ عطا گرمیٔ عتاب

کج خلقی اس کی طبع رواں میں نہیں ذرا
دریائے موج زن کو ہزاروں ہیں پیچ و تاب

پڑھتا ہوں میں وہ مطلعِ روشن حضور میں
جس کا نہ ہووے مطلعِ خورشید بھی جواب

شاہا تو وہ ہے نورِ مجسم کہ آفتاب
کرتا ہے نور کو ترے سایہ سے اکتساب

تلوار تیری ہے وہ غضب برقِ کفر سوز
ہے جس کی آنچ آتشِ دوزخ کا التہاب

جوہر سے تیری تیغ کے دکھلائے ہے قضا
سرکش کو لکھ کے حرف بحرف آیۂ عذاب

اللہ رے پاسداریٔ اسلام و پاسِ شرع
اللہ رے تیری مصلحت اللہ رے احتساب

انگور زخمِ دل پہ نہ بدخواہ کے بندھے
اس خوف سے کہ ہوتی ہے انگور کی شراب

کیسا ہی مے پرست ہو مانندِ چشمِ یار
مقدور کیا کرے قدحِ مے کا ارتکاب

بلکہ نہ لے دعا، قدح کا بھی منہ سے نام
بالفرض گر وہی ہو دعاؤں میں مستجاب

شاہا تری حمایت و دولت کے سایہ میں
کنجشک رشکِ باز ہے رشکِ ہما غراب

کرتا ہے روز شب کو برابر شہنشہا
تعمیلِ عدل سے تری میزاں میں آفتاب

خورشید شیر چرخ پہ جو کھینچتا ہے تیغ
چاہے ہے شیر جنگ یہ تجھ سے مگر خطاب

کہئے تو تیرے تکلم شیریں کو شہد کیا
یہ شربتِ خضر ہے شہا وہ قئے ذباب

ق

چالاکی ہے وہ توسنِ چالاک میں ترے
شوخی ہے چشمِ یار میں عاشق میں اضطراب

کاوے میں یوں وہ جیسے کہ طاؤسِ مست رقص
اُڑنے میں یوں وہ جیسے کہ پرواز میں عقاب

چمکائے ایک ذرا سر میداں جو تو اسے
لے پر ہوا پہ جائے وہ جوں ناوکِ شہاب

کرتا ہے یوں ثنا کو دعا پر اب اختصار
یارب دعا ذوق ہو مقبول و مستجاب

تا عید و عید گاہ ہو اور خطبہ نماز
تا خطبہ و نماز سے منظور ہو ثواب

ہر سال تجھ کو عید ہو فرخ بعز و جاہ
ناکام ہوں عدو ترے اور دوست کامیاب

قصیدہ نمبر ۱۲

در مدح ابو ظفر بہادر شاہ مرحوم

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جامِ بلوریں سے مئے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ مے کش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اُڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہو وے نہ ممیّز کرۂ ناری و مائی

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے ہے یہ زور
ہر نالہ کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزمِ عمّاں پہ لبِ جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی

سردی کی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک
معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش سے عالم
ہے مدرسہ میں بھی سبقِ صرف ہوائی

خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ریائی

جو آئینۂ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینائے مے کاہ ربائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

تھا سوزنئ خار کا صحرا ابھی جہاں فرش
سبزہ نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی

آرائشِ گلشن کے لئے جامۂ رنگین
زیبائشِ غنچہ کے لئے تنگ قبائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگِ گلِ سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ابرو پہ کرے قوسِ قزح وسمہ تو خورشید
سرخئ شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم
جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی

کیا ساغرِ رنگیں کو کیا جلد بہت
نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

ہوئی متحمل نہیں اک ساغرِ گل کی
شاخِ گلِ احمر کی نزاکت سے کلائی

اعجازِ نوا سنجئ مطرب سے چمن میں
ہر خار کی ہے نوک زباں شعر نوائی

حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر
ہر طائرِ تصویر کرے نغمہ سرائی

شاہا ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

کہتے ہیں مہِ نو جسے ابروئے وہ تیری
کی آئینۂ چرخ میں ہے عکس نمائی

پرتو سے ترے جامِ مئے عیش سرِ بزم
لے ساغرِ جمشید کرے کارروائی

ٹپکے لبِ ساغر سے وہ قطرۂ گردوں شکل
ہو مثلِ فلک جس میں تماشائی خدائی

کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہو سکے کاسہ میں سمائی

پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلعِ موزوں
اُحسنتَ کہیں سُن کے بہائی و سنائی

یوں کُرسئی زر پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سر رحل طلائی

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہرِ گدائی

گمرہ کو ہدایت جو ترے راہ پہ لائے
رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی

تا ناخنِ شمشیر نہ ہو ناخنِ تدبیر
دشمن کی ترے ہو نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رُخِ روشن سے ترے جوں یدِ بیضا
کرتا ہے کف آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تری نذر سد النقدِ سعادت
ہے مشتریٔ چرخ کی کیا نیک کمائی

ایک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوٹے
گر سرِ بہوا ہووے ترا تیرِ ہوائی

ہر کوہ اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دلِ سنگ صنم میں
ہر بت میں کرے صورت حق جلوہ نمائی

ہر شعرِ غزل میں ترے معنئ شفا ہیں
قربان غزل کی ترے دیوان شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کے رہی تیغ ہمیشہ
خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

دیتا ہے دعا ذوقؔ کہ مضمونِ ثنا میں
ہے ذہنِ رسا کو یہ کہاں اس کی رسائی

ہر سال شہا ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

قصیدہ نمبر (۱۳) اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے مگر مطلع ثانی نہیں پائی

شاہا جمال و حسن کا تیرے لکھوں میں وصف کیا
ظاہر میں تو ظلِ خدا باطن میں تو نورِ خدا

جلوہ ترے دیدار کا ہے اس قدر بہجت فزا
روئے مقدس کو ترے جس نے کہ دیکھا یہ کہا

صلِ علیٰ صلِ علیٰ صلِ علیٰ صلِ علیٰ

انوار عرفاں سے ترا سینہ ہوا ایسا ہے صاف
جس کی پہنچتی روشنی ہے قاف سے لے تا بہ قاف

خورشید و مہ کو روبرو تیرے کہاں مقدور لاف
کرتے ہیں دونوں روز و شب آکر ترے در کا طواف
اے قبلۂ روشن دلاں اے کعبۂ اہل صفا

ہے تیری فر و فر ہی فر فریدوں کا نشاں
نصفت کو تیری دیکھ کر کسریٰ کی بھی ہو کسر شاں
تو وہ سکندر قدر ہے اے فخر شاہان جہاں
تیرے ضمیر پاک کو پہنچے ہے جام جم کہاں
وہ جام ہے گیتی نما یہ آئینہ ہے حق نما

تیری بہار لطف سے ہر دشت ہے رشک چمن
پیدا ہوں خار خشک میں گلہائے نسرین و سمن
تیرے سحاب فیض سے اے ظل رب ذو المنن
جس جا کہ موج ریگ ہو بحر رواں ہو موج زن
اور دامن ہر موج میں لاکھوں ہوں دُرّ بے بہا

اللہ رے دریا دلی تیری دم جود و کرم
ہے دل ہی دل شاہنشہا تو سہے لیکر تا قدم
آگے تری بخشش کے ہے دریا کہیں رتبہ میں کم
تو بخشدے اک آن میں سو گنج دینار و درم
پیسہ بھی دے سکتا نہیں وہ فلس ماہی کے سوا

جس پر عنایت ہو تری اس کو نہیں پروائے زر
جس کا کہ حامی تو ہو کیوں اس کی شکستہ ہو کمر
اللہ نے تجھ کو کیا بے چارگاں کا چارہ گر
اے خسرو والا گہر تیرے تلطف کی نظر
ہے مفلسوں کو کیمیا ٹوٹے دلوں کو مومیا

تیری ثنا کب ہو سکے اے خسرو والا نگاہ
اب یہ دعا ہے ذوق کی حق میں ترے شام و پگاہ
جب تک زمیں پر ہے فلک اور ہیں فلک پر مہر و ماہ
فرخ ہمیشہ عید ہو تجھ کو شہا با عز و جاہ
بدخواہ تیرا ہو سدا رنج و الم میں مبتلا

تمت بالخیر

قصیدہ نمبر ۱۴

مرزا ابو ظفر بہادر شاہ نے عالم ولیعہدی میں بیماری کے بعد غسلِ صحت کیا تھا۔ اس کی مبارکباد میں استاد مرحوم نے یہ قصیدہ لکھا تھا عالم شباب کا کلام ہے۔

واہ واہ کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا
مثلِ نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ لبشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغ یہ پانے لگا نشو و نما

ہوگیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر ریدالہو
برگ میں ہر نخل کی سرخی ہے جوں برگ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

نام کو اشیاء میں نہ تلخی رہی نہ سمیت
بن گئی تریاک افیوں زہر میٹھا ہوگیا

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آب حنظل دیوے شربت کا مزا

نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا

راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دور
چاہیئے واقف نہ ہو دوران سر سے آسیا

موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف
اب رکھے ہے روشنی مثل دل اہلِ صفا

آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبان خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا

نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا

فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا

لاغروں کو ہو کمال تاب و طاقت یہ شباب
کیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدرالدجا

صبح صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آگئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدت سے اس کو یک نفس فرصت نہو
قرص سے خورشید کی جب تک نہ کر لے ناشتا

رات بھر ٹھونگا کیا انجم کے دانہ چرخ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو ملا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی یہ نفقتیج کی نوبت کہ نوبتخانہ میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرّنا

کوس بھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اس کی نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہنچایا بہم
جید الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا

ہے مزاج اہل عالم یہ قریب اعتدال
سا تول قلمیں ہیں گویا اب بخط استواء

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو
پھینکدے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جب کہ ہو اس کی نوید غسل صحت جانفزا

وہ ولیعہدِ زماں مرزا محمد بو ظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا

تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد
ہوں مقوی دل و جاں مثل اوراقِ طلا

شادی صحت سے اس کے آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

میں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں
بلبلِ تصویر سُن کر بول اُٹھے مرحبا

آج ہے عالم میں وہ روز سعادت اِنتما
دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو پیدا ہو ہما

مژدۂ جاں بخش صحت ہے ترا ماء الحیات
جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا

ہے بقائے عمر سے تیری بقائے عمر خلق
ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آب بقا

قطرہ افشانی سے آب غسل صحت کے ترے
ہوں دُرِ خوش آب پیدا اس قدر قوت فزا

ہوویں استعمال یا قوتی میں وہ موتی اگر
بخشے پیرانِ کہن کو نوجوانوں کے قواء

جسم کو مل مل کے دھویا تو نے جبدم وقت غسل
گردِ کلفت کو دل عالم سے گویا دھو دیا

دل عدوئے سنگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت
زیر پا پامال ہوتا تھا برنگِ سنگ پا

خوردۂ گل کو صبا لائی تصدق کے لئے
دے گیا ابر بہاری نذر دُر بے بہا

شادیٔ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوش عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

چھیڑے تار شمع کو گر ناخن موج نسیم
بزم میں پیدا ہو تار ساز مطرب کی صدا

لب پہ ساغر کے ہے جوں موج تبسم موج مے
شور قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے قہقہا

بزم تصویرات فانوس خیالی کی طرح
حلقۂ رقاصگاں ہے زیر گردوں جابجا

کر رہا صحن چمن ہی میں ہے کیا طاؤس رقص
آشیانہ میں ہے رقصاں طائر قبلہ نما

خانہائے چشم میں بھی پتلیوں کا رقص ہے
آشیانہ میں ہے رقصاں طائر قبلہ نما

چھوٹی آتشبازی ایسی جس کی گلکاری کو دیکھ
رات کو کہتے تھے آپس میں ثریا و سہا

صنع آتشباز پر حیرت زدہ ہوتی ہے عقل
سنگ پارس سے کہیں باروت کو پیسا تھا کیا

ہو گئی تاثیر جس کی یہ کہ ہر گلریز سے
ریزۂ فولاد نکلے بن کے گلہائے طلا

گنج چھٹتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے
ماہ پاروں کا تھا گویا خندۂ دنداں نما

منہ ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے ہمتاب ہو
غازہ سے ہر چند چمکے رنگ روئے مہ لقا

بُرج جو اُڑ کر ہوئے قندیل شب پر فلک
بُرج تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کر دیا

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ اس کے روبرو
جشن جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

ہے زبان خامہ عاجز آگے بس تعریف میں
ذوقؔ کہتا ہے اٹھا کر ذوق میں دست دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شافی مطلق تجھے
جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

قصیدہ نمبر ۱۵

اس قصیدہ پر علاوہ خلعت معمولی کے ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا تھا

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت

ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو
تھا مرا ذہن نہ محتاج حصول صورت

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
نہ غرض مجھ کو نتیجہ سے نہ تھا شکل سے کام
ذہن میں سب مرے حاضر صُوَرِ علمیہ
چار و ناچار جو ترغیب سے یاروں کی کبھی
کبھی ہمت تھی مری قاعدۂ صرف میں صرف
کبھی منطق کو تفوق یہ مرے ناطقہ سے
کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں
کبھی تقسیم فرائض کبھی تفہیم اصول
کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہن رسا
کبھی تھا عقل پہ مذہب مرا مانند حکیم
کبھی کرتا قدم چرخ کا ثابت بجہات
کبھی انکار قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل
حشر اجساد میں تھا گاہ تردد مجھ کو
کبھی تھی عرصۂ تدبیرِ فلک کی مجھے سیر
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش
کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جوہر قائم
کبھی منقول پہ مائل کبھی سوئے معقول
کبھی میں حافظ قرآن بعلم تفسیر
کبھی کرتا تھا مجسطی پہ حواشی تحریر
کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج
کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح
گہ نباتات کی آگاہ میں کیفیت سے

عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت
تھی مری فکر کو ہر شکل حظاتِ عظمت
پر جبالی مجھے منظور نہ تھی عملیت
درس تدریس پہ آجاتی تھی مجھ کو رغبت
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت
تحت حکمت ہو یہ فن گرچہ ہے تحت حکمت
کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت
کبھی تعلیم عقائد بکتاب و سنت
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی مثلِ متکلم سب مجھے پاس ملت
اور کبھی کرتا تھا باطل بسماء انشقت
کبھی تکرار تناسخ پہ مجھے تھی حجت
کبھی تھی عالمِ برزخ میں مجھے اک حیرت
کبھی میں ناپتا تھا سطح زمیں کی وسعت
کبھی مُثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت
کبھی میں کرتا تھا معلول سے ثابت علت
کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت
کبھی میں قاریٔ قرآن بعلم قرأت
کبھی کرتا تھا اشارات و شفا کی صحت
کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیح لغت
کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوت
گہ جمادات کی معلوم مجھے خاصیت

کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں پیش روی
کبھی لے جاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت

کبھی میں نفیٔ حقائق میں تھا سوفسطائی
کبھی میں معتزلی باعث ردّ رویت

کبھی میں جبری و مجبور بعقل و تدبیر
کبھی میں قدری و مختار بقدر طاقت

گہ ملاحد کی تھی تردید کلام الحاد
گہ وجودی و شہودی سے بیان وحدت

جوں مہندس کبھی مالوف تشکل و مقدار
جوں محاسب کبھی مصروف بضرب و قسمت

کبھی حرفوں سے تھا مطلوب مثال جفار
کبھی کچھ نقطہ سے مقصود تھا رمال صفت

خانۂ کیسہ سے خارج کبھی شکل داخل
شکل خارج تھی کبھی داخل بیت غربت

کبھی کرتا تھا قرآن مہ و زہرہ پہ نظر
کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت

کبھی افسون و عزیمت کبھی تعویذ و طلسم
کبھی تجویز زکوٰۃ اور کبھی قصد دعوت

کبھی تھا علم قیافہ میں یہ ادراک مجھے
ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت

کبھی میں رہتا سرددی میں تھا ایسا مشغول
کہ نہ تھی ایک نفس ضبط نفس سے فرصت

سیمیا سے کبھی تصویر کش موہومات
کیمیا سے کبھی میں زرکش گنج دولت

کبھی میں شیخ شیوخ اور کبھی شیخ رئیس
کبھی علامہ کبھی صوفی صافی طینت

کبھی میں قرب فرائض سے تھا عالی درجہ
کبھی میں قرب نوافل سے تھا والا رتبت

ماہر موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا
کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت

کبھی میں شاعر غرّا و ادب دان بلیغ
نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت

کبھی کرتا تھا عروضی کا بھی میں قافیہ تنگ
طبع موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت

کبھی پیش نظر انجیل و زبور و توریت
کبھی مصحف میں نظر میری سر ہر آیت

کبھی زرتشتیوں میں ایسا کہ سارے معبد
ژند و پاژند میں کرتی تھی میری تبعیت

کبھی یہ آگہی شاستر و بید و پران
کروں ایک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

کبھی میں حل معمّا و لغز میں ذی ہوش
کبھی اخبار و تواریخ میں صاحب خبرت

آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
عاقبت پایا تو ہاں بلہ کو اہل جنت

فائدہ کیا جو ہر ایک علم کی جانی تعریف
فائدہ کیا جو ہر اک فن کی کھلی ماہیت

فائدہ کیا کہ جو دیکھی کتبِ ہر مذہب
فائدہ کیا جو ہوئی آگہیٔ ہر ملّت

عقل سے گرچہ کیا مادّہ ایسا پیدا
کہ بہر شکل ہو ایک تازہ محلِ صورت

یا بنائی کوئی صورت کہ جسے دیکھ کے ہو
ہیکلِ روم سے بتخانۂ چیں تک حیرت

بے مقدر نہ پڑے صورتِ بہبود نظر
دُور آئینۂ دل سے نہ ہو زنگِ کلفت

پڑھ لو اک مطلعِ برجستہ میں اس موقع پر
جس کو سن کر کہیں احسنت سب اہلِ فطنت

گر نہ دے صاحبِ جوہر کو مقدر عزت
جوہرِ فرد ہے بالفرض تو کیا بے قسمت

کیا ہوا علم معقولہ سے اگر کیف کی ہے
لیک بے یاوریٔ بخت نہیں کیفیت

قاضیٔ چرخ بھی جو تو ہے تو کیا گر تیرے
مثلِ دہقان فلک کھیتے ہیں طالعِ نکبت

دور گردوں نہ موافق ہو تو ہو اور خفیف
جرِّ اثقال ہیں تو جتنی اُٹھائے محنت

آگے برگشتگیٔ بخت کے چلنے کی نہیں
نظری و عملی کوئی بھی تیری حکمت

گو فصاحت میں تو سحباں ہے لے بلبلِ تقریر
حرفِ مطلب پہ زباں کو ہو تری سو لکنت

گو ریاضی میں ہے صناع اگر بخت ہیں بد
نقشِ باطل ہے تری شکل وہ جس میں صنعت

کیا ہوا جانا اگر مسئلہ بیر و مشار
پستیٔ بخت سے تجھ کو جو نہیں ہے رفعت

کام تقویم نہ آئے نہ تری اصطرلاب
طالعِ بد سے اگر نیک نہ آئے ساعت

علم سے ہو نہ کبھی چارۂ آزار نصیب
پورِ سینا ہے تو کیا سینہ میں خوں ہے حسرت

سو دوائیں ترے نسخہ میں ہوں پر بے تقدیر
نہ ہو بالخاصہ تاثیر نہ بالکیفیت

علمِ نیرنج سے گو بوئے تو نخلِ نارنج
بے مقدر نہ ہو حاصل ثمرِ خوش لذت

علم سے جو سبق آموزِ ملائک تھا وہ دیکھ
بخت بد سے ہوا مستوجبِ رجم و لعنت

ہوا مسجودِ ملائک یہ ظلومٌ و جہول
یعنی انسان قوی بخت و ضعیف الخلقت

گو تصوف سے ہو تو صوفیٔ سجادہ نشیں
بے مقدر نہ کرامت ہو نہ خرقِ عادت

علم سے لاکھ ہو شیخی یہ تری بے تقدیر
نہ کہے کوئی تجھے شیخ علیہ الرحمۃ

یہ مقالات مثال قصص مصنوعہ
ہوئی یکبار جو افسانۂ خواب غفلت

لگ گئی آنکھ مری دیکھتا کیا خواب میں ہوں
کہ مجسم نظر آئی ہے نوید بہجت

اللہ اللہ رے حسن اس کا کہ سر تا بقدم
تھا وہ خالق کا تماشائے ظہور قدرت

یاد کرتا قد رعنا کو ہے اُس کے زاہد
دم تکبیر جو کہتا ہے سدا قد قامت

چشم وحشی کو اگر اپنی وہ دکھلائے تو ہو
چشم آہو سے ہرن نشۂ جام وحشت

دل شامت زدہ کے درپئے تدبیر ہلاک
زلف وا اژدوں تھی وہ رخسارہ پہ اژدوں ہیبت

آتش حسن سے اک شعلۂ سرکش بینی
موجۂ دود لطیف اسکی بھوؤں کی حالت

فوج مژگاں وہ بلا ہو دے صف آرا تو کرے
دست بیداد سے یکدست دو عالم غارت

چاہ بابل وہ ذقن اور دھواں زلف کا عکس
دل گرفتار عذاب اس میں ہو ہاروت صفت

لعل شیریں کی حلاوت یہ جو دے جاں عاشق
تو دم نزع بھی عناب کا چاہے شربت

نہ دم شرم تبسم سے لب اُس کے خوگر
نہ تغافل سے اُن آنکھوں کو نگہ کی عادت

کھولدے معنی معدوم کمر کی جنبش
واکرے عقدۂ موہوم لبوں کی حرکت

شوخی و ناز کی تعریف میں اس کی مطلع
وہ پڑھوں میں کہ جسے حسن کے ہو دلکو فرحت

شوخی اس چہرہ میں یوں گل میں ہے جیسے حمرت
ناز یوں چشم میں نرگس کے ہے جیسے نکہت

لب پان خوردہ کی شوخی کی ہے آگے اک بات
گر لگا دے وہ مسیحا یہ بھی خوں کی تہمت

نازک اندام وہ اور سنگدل اُن سے بھی سوا
آیا جن سنگدلوں کے لئے ہے ثمر قسمت

سیلی سینہ پہ نہ تھی جعد پس پشت کا عکس
نظر آتا تھا صفائی سے الف کی صورت

چینی رنگ کا وہ اپنے دکھا کر عالم
ایک عالم کا ہو دل لیکے بغل میں چنپت

اللہ اللہ رے تری تمکنت اُف رے تمیز
واہ رے تیر اتجنت سے تری بل نلے نخوت

قہر انداز بلا ناز قیامت طنازہ
سحر چشمک ستم ایما و کرشمہ آفت

تھا بجا عالمِ مستی میں قدم کو لغزش
دمبدم نشۂ صہبا سے زباں کو لکنت

آکے اُس رشکِ مسیحا نے کہا بالیں پر
لاتنم قُم کہ یہ غافل نہیں وقتِ غفلت

شوخ بختی سے نہ اتنا نمک افشاں ہو کہ ہو
بادۂ میکدۂ عیش کی گم کیفیّت

کیا سبب ہوتا کدورت سے نہیں کیوں خالی
دل ترا شیشۂ ساعت کی طرح یکساعت

بزمِ ہستی میں تو ہنس بول رہیگا کب تک
صورتِ شمعِ سحر سوختہ روتی صورت

آتشِ دل سے ترے گوشۂ تنہائی میں
بنگئی شعلۂ جوّالہ کمندِ وحدت

وقت ضائع نہ کر اُٹھ بسترِ اندوہ سے تو
چل درِ میکدہ تک ہے حرکت بے برکت

فکرِ باطل سے نکر دل کو خنک تو لیٹے
ہے تجھے مثلِ سحر یک دو نفس کی مہلت

دیکھ تو کیا افقِ مشرقِ انوار سے ہے
جلوہ افروز رُخ بالوئے صبحِ عشرت

ادھم لیل سہر عرصہ ہے برگشتہ عناں
اشہبِ یوم بتک سیر ہے سوئے ساحت

جانبِ شرق ہے نوری فلق بال کشا
جانبِ غرب ہے پرواز غرابِ ظلمت

چرخِ مینائی پر اک سبز پری کا عالم
شفقِ صبح پر اک لال پری کی حالت

نکہتِ گل جو ہوا میں تو ہوا عطر فشاں
تازگی گل کو چمن میں تو چمن کو نزہت

کھلے ہی جاتے ہیں سب غنچہ زہے جوشِ نشاط
لوٹے ہی جاتے ہیں گلُ بل بے ہنسی کی شدّت

آج یہ جوش یہ ہے رحمتِ باری کہ کہیں
نہ رہی کلفتِ عصیاں سے جہاں میں ظلمت

طفلِ نومشق کی مشقی کی طرح سو سو بار
دھووے مستوں کے سیہ نامہ کو ابرِ رحمت

کہے یہ رند کہ او زہد فروش آگ نہ پھانک
مانگے گر بادۂ نو زہدِ کہن کی قیمت

قل ہوا زہد کا قلیا ہوئی زاہد کی تمام
سنتے ہی قلقلِ مینائے شرابِ عشرت

اسقدر سازِ طرب ساز کی آواز بلند
چھیڑیں گر تار کھرج کا تو ہو پیدا دھیوت

نغمہ برلب کہیں مطرب پسرِ زہرہ جبیں
جام در دست کہیں مغبچۂ مہ طلعت

لیکے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی
اُٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت

چشمِ سرمست مئے نازمیں کاجل پھیلائے
لبِ میگوں پہ مسی کی پڑی پھیکی رنگت

بے نمک آیا نظر حسنِ مہ و انجم و چرخ
ہو گیا زرد رُخِ شمع و چراغِ خلوت

چونکے مرغِ سحری عرش سے آوازِ خروس
ہو گئی خواب کو آوازۂ کوسِ رحلت

باغِ عالم میں ہیں مرغانِ اولی اجنحہ تک
مثلِ مرغانِ سحر نغمہ طرازِ عشرت

دی ہے مسجد میں موذن نے اذاں بہرِ نماز
باوضو ہو کے نمازی نے ہے باندھی نیت

ہوئی بتخانہ سے ناقوس کی پیدا آواز
چلے جمنا کو برہمن کوئی لے کر مورت

اُٹھے میخوار صبوحی کے لئے لے کے سبو
کہ عداوت ہے اگر کیجیے ترکِ عادت

اک طرف سے ہوئی گھڑیال کی آواز بلند
ایک جانب سے لگی آنے صدائے نوبت

سحرِ عید ہے کر عید کا سامانِ نشاط
روزِ شادی کی ہے آمد شبِ غم کی رخصت

آج وہ دن ہے کہ آغوش میں لیکر تجھکو
کہے طوبیٰ لک ہر شاہدِ طوبیٰ قامت

اب ہیں بیدار ترے بختِ مددگارِ نصیب
اب قوی ہیں ترے طالع تری یاورِ قسمت

فکرِ تہنیتِ عید کا اُس شاہ کے تو
دور میں جس کے ہے ہر صبح صباحِ دولت

وہ شہنشاہ بہادر شہ کسریٰ انصاف
خسروِ جم حشم و داورِ دارا حشمت

قوتِ ملت و دیں قامعِ کفر و الحاد
حامیِ شرعِ نبی ماحیِ شرک و بدعت

حکمِ شرعی سے کرے سلب وہ سب جذبہ بہ شوق
مردِ مجذوب سے گر ترک ہو سترِ عورت

کون اُس کا ہے نہیں وصافِ صفاتِ نیکو
کون اُس کا ہے نہیں سرگرمِ ثنا و مدحت

سنتے ہی میں نے بھی وہ مطلعِ روشن لکھا
مطلعِ صبح کو ہو سامنے جس کے خجلت

مصحفِ رُخ ترا اے سایۂ ربّ العزت
کھولدے معنیٔ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نعمت

تیرا دروازۂ دولت ہے مقامِ اُمّید
تیرا دیوانِ عدالت ہے محلِ عبرت

تیرا احسان بہارِ چمنِ صد رونق
تیری زینت چمن آرائے ہزار امنیت

تیرے عشرتکدہ میں بار کسے غیرِ نشاط
تیری خلوتکدہ میں دخل کسے جز طاعت

صفحۂ علم پہ برجیس سے تو ہم زانو
حجلۂ عیش میں ناہید سے تو ہم صحبت

ماہ نو ایک فلک پر ترے نو پردوں میں
نو فلک نوکروں ہیں تیرے قدیم الخدمت

کیسۂ گوہرِ انجم ترا صرفِ انعام
طاقۂ اطلسِ گردوں ترا وقفِ خلعت

نیّتِ نیک تری آئینۂ حسنِ عمل
عملِ خیر ترا جلوۂ حسنِ نیت

ذہن عالی ہے ترا طائرِ شاخِ سدرہ
طبعِ رنگیں تری گلچینِ ریاضِ جنّت

تیرا افضال جہاں کے لئے برہانِ کرم
تیرا اکرام زمانہ کو دلیلِ رحمت

علم ظاہر سے ہے یکساں تجھے دور و نزدیک
نورِ باطن سے برابر ہے حضور و غیبت

ذہن صافی ہے ترا پردہ درِ معنیٔ غیب
موشگافی ہے تری کوہ شگافِ دقت

عقل میں شمس ہے تو علم میں کانِ گوہر
فضل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہِ رحمت

تیری تدبیر پُر از دفترِ ہوش و فرہنگ
تیری شمشیر پُر از جوہرِ فتح و نصرت

دعوتِ صدق پہ لائے تری ایماں تصدیق
دستِ ہمت پہ کرے تیرے سخاوت بیعت

تجھسے راضی ہے خدا اور خدا کے محبوب
تیرا حامی ہے نبیؐ اور نبیؐ کی عترت

عزم کو ہے ترے ہر عزم میں عزم بالجزم
قصد کو تیرے ہے ہر قصد میں قصد سبقت

قوتِ روح ملائک چمن قدس میں ہو
ذاتِ قدسی کا تری عطر قبائے عفت

کیا اللہ نے جب تجھ سا ولیٔ نعمتِ خلق
کیونکہ واجب نہ خلائق پہ ہو شکرِ نعمت

نطقِ شیریں سے تری عام حلاوت ہو اگر
ثمرِ تلخ ہو حنظل کا سبوئے شربت

شوکتِ عقرب جرارہ کی مانند رہے
دلِ حاسد میں خلش گر ترا رشکِ شوکت

روشِ شیشہ ہر اک سنگ ہو ریزہ ریزہ
پڑے البرز پہ گر گرز کی تیرے ضربت

ہر کشف دار چھپاتا ہے فلک زیر سپر
کیا غضب ہے تری شمشیرِ غضب کی ہیبت

آئے طوفاں جو ترے قہر کا طغیانی پر
کشتیٔ نوح بھی اعدا کو ہو گردابِ صفت

وہ تری تیغ کی برش ہے کہ ہمسایہ جس کا
کردے ایکدم میں ہیولے سے مفارق صورت

تیرا بدخواہ رہے حرز سے یاں تک محروم
دے نہ تعویذ اُسے تا بہ نشانِ تربت

آسیا وار پھرے کیوں نہ فلک گردِ زمیں
تیرے توسن کی جو کاوے کی اُڑا جائے پھرت

کیا ترے فیل کے اوصاف لکھوں میں کہ وہ ہے
ابر رفتار جبل پیکر و گردوں رفعت

اُس کی خرطوم ہے گر طرۂ لیلیٰ کی مثال
تو ہیں دندان صفا ساعد سلمیٰ کی صفت

کیا عجب گر ہو تپ لرزہ ہیبت سے تری
نبض کی طرح رگ سنگ میں پیدا سرعت

آب باران کرم تیرا ہے وہ شربت خضر
برسے لالہ پہ تو افعیوں میں نہ ہو سمیّت

عدل کے لفظ کو دیتا نہیں نقطہ کوئی
عدل سے تیرے جو موقوف ہے رسم رشوت

عہد میں تیرے عجب کیا سر داغ دل شمع
شعلہ میں مرہم کافور کی ہو خاصیّت

پنجۂ گربہ سر بچۂ موش و کنجشک
ہے حمایت سے تری دایہ کا دست شفقت

دور انصاف میں گر تیرے ہو کشتہ سیماب
تو بلا شبہ پڑے دینی جہوس کو دیت

دیا اللہ نے وہ قلب مصفا تجھ کو
اے شہنشاہ صفا ذہن و سراپا صفوت

فرد تفصیل حوائج ہے رُخ حاجتمند
عرض حاجت کی نہیں سامنے تیرے حاجت

عید کو دیکھ ترے ساتھ خلائق کا ہجوم
کہے عارف کہ یہ کثرت میں ہے ظاہر وحدت

لکھے گر خامہ ترا وصف شمیم اخلاق
تو ہر اک نقطہ ہو اک نافۂ مشک تبّت

منتہی ہوں نہ کبھی تیرے صفات نیکو
گر بیاں کیجئے تا حشر صفت بعد صفت

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
کہ زباں کو ہے نہ یارا نہ قلم کو طاقت

عید ہر سال مبارک ہو تجھے عالم میں
با شکوہ و حشم و جاہ بعمر و صحت

خیر خواہوں کے ترے چہرہ پہ ہو رنگ نشاط
اور بدخواہوں کے رخسار پہ اشک حسرت

قطعہ در تہنیت جشن نوروز

خسرو دانش کے ترا مژدۂ جشن نوروز
آج ہے بلبل تصویر تلک زمزمہ سنج

خبر عیش تری دی ہے چمن کو جا کر
زر گل پیک صبا پائے نہ کیونکر پارنج

بادۂ جوش جوانی کی ہے گویا اک موج
تن پیران کہن سال پہ ہر چین شکنج

چند قطرہ سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر
آگے ہمت کے ترے گوہر شہوار کے گنج

حسنِ نیت سے ہے تو یوسف مصر بخشش — دستِ حاتم میں بجا ہے کہ جو دیں تیغ و ترنج
شش جہت پر جو ہے غالب ترا اسرِ پنجہ امن — فتنہ کو اُٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کہا شش و پنج
نہ بجھے آب سے آتش نہ خس آتش سے جلے — ایک سے ایک موافق کہ مرنجان و مرنج
تیرے منصوبہ کے تابع ہیں سب احکام نجوم — صفحہ تقویم کا گویا ہے بساط شطرنج
لایا ہے معنی رنگیں سے یہ لعل خوش رنگ — ذوقؔ جو مدح و ثنا میں ہے ترے گوہر سنج
خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ — رنگ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نارنج
بزم رنگیں میں تری رنگ طرب ہو ہر روز — اور تری خاطر اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

قصیدہ نمبر ۱۶

سنہ ۱۸۵۱ء میں بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کہ اس بڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُستاد نے مبارکباد کا قصیدہ شروع کیا تھا۔ تمہید کی تحریر میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین کر دینگے ؎

مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

اسی عرصہ میں ایک دن میں گیا تو جو شعر پرچوں پر تھے انھیں ترتیب دیا تھا۔ سُنائے انھیں میں قطعہ پڑھا۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہ عیش و نشاط — کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہے بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبریٰ — نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھئی وہ شعر؟ میں نے کہا اب کیا ضرورت رہی آنکھیں بند کرکے فرمایا۔ یہ ادھر ہی کا فیضان ہے!

اس قصیدہ پر خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر ایک ہاتھی مع حوضہ نقرئی عنایت فرمایا ؏

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو
ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کرے ہے والبِ غنچہ در ہزار سخن
کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں
قفس میں بیضہ کے بھی شوق نغمہ سنجی سے
اثر سے بادِ بہاری کے لہلہاتے ہیں
نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ و ثمر
ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
نہ خارِ دشت ہے زمیں میں خوابِ مخمل ہے
ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دودِ گلخن بھی
یہ آیا جوش میں بارانِ رحمتِ باری
ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغرِ عیش
ہر ایک قطرہ شبنم گہر کی طرح خوشاب
کرے ہے صبح شکر خندہ اس مزے کے ساتھ
سنوارتی ہے جو شام اپنی زلفِ مشکیں کو
نہالِ شمع سے ہر شب چُنے گل شبو
ہنسے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں
رہے ہے چرخ پہ ہر صبح جوں صبوحی کش
عجب نہیں ہے کہ آرائشِ زمانہ سے
چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر جو بن

عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر
کلیدِ قفلِ دلِ تنگ و خاطرِ دلگیر
چمن میں موجِ تبسم کے کھول کر زنجیر
جو وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر
عجب نہیں کہ ہو مرغِ چمن بنالہ صفیر
زمیں پہ ہمسرِ سنبل ہے موجِ نقشِ حصیر
تو سبز فیضِ ہوا سے ہو وہ برنگِ شعیر
جو لوٹ لے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر
ہر ایک تارِ رگِ سنگ بھی ہے تارِ حریر
برستا اُٹھتا ہے آتش سے مثلِ ابرِ مطیر
کہ سنگ سنگ میں سنگ بدہ کی ہے تاثیر
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر
ہر اک گہر گہرِ شب چراغِ برجِ تنویر
کہ جس طرح بہم آمیختہ ہوں شکر و شیر
سوادِ مشکِ ختن پر ہے لاکھ آہو گیر
بہارِ عیش میں گلچیں کی طرح سے گلگیر
حیا سے رنگِ گلِ آفتاب ہو تغییر
بایں درازیِ ریش آفتاب ساغر گیر
حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطۂ کشمیر

نہ کیونکہ دیکھکے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آئی ہے نظر اک قدرتِ خدائے قدیر

ظہورِ نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیم نکہتِ گل اطہر و لطیف و خبیر

شمیمِ عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ قرصِ عنبر اگر ہے زمیں تو گرد عبیر

حمل سے حوت تلک جابجا ہیں تصویریں
بنا ہے عالمِ بالا بھی عالمِ تصویر

جہاتِ ستہ سے بزمِ جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجومِ نشاط و سرور جمِ غفیر

زمانہ دشمنِ عشرت کا اس قدر قاتل
مہِ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ یہ بزمگاہ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمینِ میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز
کہ لائے مے سے ہو دیوارِ قہقہا تعمیر

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے
ضمیرِ خلق سے اے بادشاہ پاک ضمیر

عجب نہیں یہ ہوا سے کہ مثلِ نبضِ صحیح
کرے اگر حرکت موجِ چشمۂ تصویر

شہنشہا ترے یمنِ شفائے کامل سے
جو لا علاج مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر

کہ چوبِ گل کو اگر ماریں بیدِ مجنوں پر
تو صورتِ بشر ہوشمند خوش تقریر

اشارہ فہم ہوا ایسا کہ وہ بیان کرے
زبانِ برگ سے گونگوں کے خواب کی تعبیر

جو میل کحلِ بصارت ہو کلکِ خطِ غبار
تو چشمِ دائرۂ عین بھی ہو چشمِ بصیر

نہ موجِ مے کو ہو ہچکش نہ شیشہ لے ہچکی
گئی جہاں سے یہ بیماری فواق و زحیر

نہ برق کو تپ و لرزہ نہ ابر کو ہو زکام
نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخیٔ دارو
شراب تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر و شیر

قوی ہے قوتِ تاثیر سے دوائے طبیب
غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

ق

شکستِ دل کو ترے یمن تندرستی سے
کرے درست اگر مومیائی تدبیر

تو موئے کاسۂ چینی کو چارہ سازِ قضا
نکالے کاسۂ چینی سے مثلِ موئے خمیر

کھجلائے سر جو کبھی مفسدانِ سرکش کا　علاجِ خارش سر ہو بنا خنِ شمشیر
بنا ہے نقشِ شفا خانہ ہزار شفا　ہر ایک خانۂ تعویذ صاحبِ تکسیر
ہر ایک اسمِ عزیمت میں اسمِ اعظم ہے　ہر ایک نسخۂ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر
رہا نہ کوئی گرفتارِ رنجِ عالم میں　چھٹے جو تیرے تصدق میں مجرمانِ اسیر
شہا ہے دم سے ترے زندگانیٔ عالم　یہ تیرا دم ہے وہ اعجازِ عیسوی تاثیر
مثالِ خضر تو اے رہنمائے ملّت و دیں　جہاں میں پیر ہو پر ہو کراموں سے پیر
تو وہ ہے حامیٔ دنیا و دیں زمانہ میں　کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر
کیا شہانِ سلف نے مسخّر ایک جہاں　کئے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تسخیر
سحر سے شام تلک زر فشاں ہے پنجۂ مہر　نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنجِ خطیر
فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر　نشانِ سجدہ ہے زیبِ جبینِ ماہِ منیر
یہ روزِ بہ سے ترے ہے جوان جہانِ کہن　کہے نہ کوئی دوشنبہ کو بھی جہان میں پیر
حیات بخشِ جہاں تیرا مژدۂ صحت　جو بخشے خلق کو عمرِ طویل و عیش کثیر
ہزاروں سال سر ہر صدی نکال کے دانت　ہنسیں اجل پہ جوانوں کی طرح مردم پیر
جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت　صحیح جیسے کہ قرآن ہو معَ تفسیر
یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں جس سے روز بروز　ہلال بست و نہم کی طرح بدن کے حقیر
پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلع روشن　کہ جس کا مطلع خورشید بھی نہ ہووے نظیر

شہنشہا وہ تری روشنیٔ رائے منیر
عقول عشرہ کے انوار جس کے عشر عشیر

جو ہو نہ تابع امر نشاورھم فی الامر　تو عقلِ کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر
جو ہیں نکات و معانی بشر کے فہم سے دور　وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر
اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظہ میں تو یہ　نہ اپنا یاد ہے احسان نہ اور کی تقصیر
حیا ہے گر متعلق تری نگاہ کے ساتھ　تو ہے ضمیر کی جانب تری صفا کی ضمیر

ترا تو سیئہ بھی یوں ہے داخلِ حسنات — کہ جیسے صحبتِ اصحاب کہف میں قطمیر
کہے ہے سلبِ تغیر کو ذاتِ حادث سے — زمانہ عدل سے تیرے یہ اعتدال پذیر
مجال کیا کہ ترے عہد میں شرر کی طرح — اُٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشانِ شریر
ہوا میں آکے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ — تو چٹکیاں دل آتش میں لے ہے آتشگیر
ترے نسق سے جو بالکل رہی نہ خونریزی — لڑائیوں میں کہیں پھوٹتی نہیں نکسیر
جو پہنچے بتکدہ میں تیرا شورِ دینداری — بلند نالۂ ناقوس سے بھی ہو تکبیر
کیا یہ کفر کو اسلام نے ترے معدوم — کہ کوئی زلفِ بتاں پر نہ کرسکے تکفیر
جہاں میں چشم سیہ مست یار کا ہو یہ رنگ — جو میکشوں کو ترا احتساب دے تعذیر
پڑی گلے میں رسن خطِ سرمہ سے اُس کی — رہے مدام وہ گردش میں از پئے تشہیر
وہ برق قہرِ خدا تیری تیغ آتش دم — کہ جس کی آنچ ترے دشمنوں کو نارِ سعیر
جو ہے خدنگ کا تیرے نشانہ چشمِ حسود — تو ہے تفنگ کا تیرے دل عدو نخچیر
ترے نہیب سے ہوں شکلِ فلسِ ماہی اک — کریں نہ حلقۂ جوہر رفاقتِ شمشیر
جو تیر نکلے کماں سے تری وہ ہو جائے — طلب میں جان عدو کی رواں قضا کا سفیر
ترے ہے خامۂ طغرا نگار میں یہ زور — ق — جو کھینچے ایک روشِ خط منحنی وہ لکیر
تو اُس سے ایسی ہوں اشکال ہندسی پیدا — مٹا دے دیکھ کے اقلیدس اپنی سب تحریر
وہ روشنی ترے خط میں کہ ابنِ مقلہ اگر — ق — لگائے آنکھوں سے سرمہ کی جا تری تحریر
تو ہو یہ نورِ بصارت کہ پڑھ لے حرف بحرف — جو ہو وے لوحِ جبیں پر نوشتۂ تقدیر
رقم میں گر ترے اوصاف کے قصور کرے — زبان خامہ عطارد کی ناک میں دے تیر
ترا سمند ہے وہ تیز رو کہ وقتِ خرام — ق — نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اُس کا نظیر
کہ سیرگاہ ہے اُسکی تو راہِ یک روزہ — اور اس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہِ سیر
ترے جو فیل کی تعریف خسروا لکھوں — کروں حکایتِ شیرین و کوہکن تحریر
کہ فیل کوہ کجک تیشہ فیلباں فرہاد — وہ دو لو دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

چلے نہ اشرفی آفتاب عالم میں
خطِ شعاع سے اُسپر جو یہ نہ ہو تحریر

ابوظفر شہ والا گہر بہادر شہ
سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ شہریار والا جاہ
خدیو مہر کلہ خسرو سپہر سریر

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤیّد و اختر معین و بخت بصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحاب بخشش سے
تو بوٹی بوٹی سے ہر خاک کے بنے اکسیر

ق

بچشمِ مہر اگر تیرا اختر اقبال
کرے نگاہ سر آبجو و آب غدیر

تو فلس فلس سے ہو ماہیوں کی وقتِ شکار
نگین دستِ سلیماں بدستِ ماہی گیر

نہ ہے ثنا کے لئے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لئے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوق ثنا سنج مدح خواں تیرا
غلام پیر کہن سال اک فقیر حقیر

کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ
سُنا ہے جب سے کہ رحم خدا دُعائے فقیر

الٰہی آب پہ تا ہو زمیں زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامن مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامنگیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیّوم
بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر

تن قوی و مزاج صحیح و عمر طویل
سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

قصیدہ نمبر ۱۷

ہیں مری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر
ایک گہر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہل صفا
تہِ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر

رزق تو درخور خواہش ہے پہنچتا سب کو
مرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت
غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلاً گوہر

ہے دل صاف کو عزلت میں بھی گردوں سے غبار
گرد آلودہ یتیمی ہوا تنہا گوہر

کور باطن کو ہو کیا جوہر دانش کی شناخت
کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر

غیرت پیمانہ نہ کم مایہ سے ہو ضبط ہوس ۔ بہہ گیا ژالہ ہوا الگ کے نہ پگھلا گوہر
جوہر خوب کو درکار ہے آرائش خوب ۔ خوب تر آب کی خوبی سے ہے ٹھیرا گوہر
سرکشی کرتے ہیں بے مغز نہ پر مغز وقار ۔ جز حباب آب سے سر کھینچے نہ بالا گوہر
ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد ۔ ہو نہ ہم صحبت تار رگ خارا گوہر
دلخراش اور ہی طاقت ہے وہ دل ہے کچھ اور ۔ کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر
فیض کو عالم بالا کی ہے شرط استعداد ۔ قطرہ یکجا ہے طباشیر ہے یکجا گوہر
صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کی ہے شرط نظر ۔ کور کیا جانے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر
صاف باطن کی ہو جب قدر کہ ظاہر ہو درست ۔ مول بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر
ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی ۔ تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر
خلق خار جنوں سے ہے پڑتا کیا کیا ۔ ہر قدم پر قدم آبلہ فرسا گوہر
دل عاشق میں کرے کیوں کہ نہ آنسو سوراخ ۔ اسی الماس سے جاتا ہے یہ بیندھا گوہر
ذوق موقوف کر انداز غزل خوانی کو ۔ ڈھونڈ اس بحر میں اب تو کوئی اچھا گوہر
غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر ۔ آگے تقدیر سے خرمہرہ ملے یا گوہر
اثر مدح سے اس خسرو دریا دل کے ۔ کہ سخن قابل گوش دل دانا گوہر
وہ بہادر شہ غازی کہ برنگ نیساں ۔ روز برسائے ہے ابر کرم اس کا گوہر
جشن سے اسکے ہے اک فیض کا دریا جاری ۔ بہتے پھرتے ہیں برنگ کف دریا گوہر
زیور آرا ہوں اگر آج چمن میں گل و سرو ۔ بیضۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر
پہنچے گر گوش صدف تک یہ نوید عشرت ۔ اتنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر
کہتا ہے قطرۂ نیساں بھی کہ اس دور میں کاش ۔ ہوتا میں دانۂ انگور نہ ہوتا گوہر
جدول آب میں کثرت سے حبابوں کے بھرے ۔ مانگ میں مثل بت خویشتن آرا گوہر
ٹوٹا ہے کشمکش عیش سے جو صبح کا ہار ۔ بکھرے شبنم سے ہیں گلزار میں کیا کیا گوہر
گل بشگفتہ میں یہ قطرۂ باران سے بہار ۔ بھر دئے درج کے یاقوت میں گویا گوہر

موج گوہر میں بھی ہے طرز تبسّم پیدا
کوئی دم میں روش غنچہ ہنسے گا گوہر

رُخ گلرنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ
کیا تماشا ہے کہ بن جائے ہے مونگا گوہر

قطرۂ آب لطافت سا ہے ٹپکا پڑتا
گوشِ خوبان سمن بر میں مصفا گوہر

مدح حاضر میں کروں میں کوئی مطلع تحریر
آج ہے خامہ میرا منہ سے اگلتا گوہر

مطلع

آج وہ دن ہے کہ اے خسرو والا گوہر
کوہ دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر

بحر و بر میں ہے شہا تیری مہیائے نثار
سیم سے زر تلک اور لعل سے لے تا گوہر

ہو ترے فیض قدم سے جو زمیں گوہر خیز
ہو نصیب صدف نقش کف پا گوہر

مشتری کہتے ہیں جس کو وہ اُٹھا لایا چرخ
ٹوٹ کر جو ترے سمرن سے گرا تھا گوہر

صبح اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا
جو ترا طرّۂ دستار کا چمکا گوہر

ترا آویزۂ سرپیچ کا اے قبلۂ خلق
صاف قندیل در مسجد اقصا گوہر

حلب خلق میں ہے سینہ ترا آئینہ
عدن علم میں ہے قلب مصفا گوہر

پرورش دیوے چمن کو جو ترا ابر کرم
موتیا میں عوض غنچہ ہو پیدا گوہر

ماہ گہنے کے لئے ہے نہ کہ گہنے کے لئے
تیرے کینٹھے کا کہوں کیا اسے زیبا گوہر

دُرفشانی سے تری اتنے گہر ہیں ارزاں
لکھتے ہیں نسخۂ مفلس میں اطبّا گوہر

ق

عکس سے تیر اقبال کے دریا میں ترے
اے محیط کرم و جود کے یکتا گوہر

آب گوہر ہو تو آب یہ اعجاز نما
کف دریا کو بنا دے ید بیضا گوہر

کوہ گا زہرہ کرے آب تری ہیبتِ عدل
گر یہ سن پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر

طبع نازک پہ تری بار گہر ہو جو گراں
پوست بیضۂ ماہی سے ہو ہلکا گوہر

آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب
ابر مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

آج محفل میں تری وہ گہر افشانی ہے
لگن شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر

دست فراش میں جاروب ہے ریش فرعون
فرش پر تیلیوں میں اُلجھے جو صدہا گوہر

تیرے دورانِ حفاظت میں کہاں رنج وگزند — حق میں بیمار کے تبخالہ ہے لب کا گوہر
افعی زلف کے کاٹے کو ہے جوں مہرۂ مار — گوشِ خوباں میں تہ زلف سمن سا گوہر
سینہ صافی کا تری ایک ہے نقشہ دریا — دل روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر
نقرۂ خنگ ترا ایسا برنگ شفاف — روبرو جس کی صفائی کے ہو میلا گوہر
غرق دریائے جواہر میں ہے وہ کوہِ گراں — گل ہیں مہندی کے جھڑاں لعل سپینا گوہر
پیل تیرا ہے بلندی میں فلک سے افزوں — جھول میں جس کے ہیں انجم سے زیادہ گوہر
جسکے خرطوم میں جو آب ہو وہ قطرہ فشاں — دیوے جو ابر بہاراں ابھی برسا گوہر
ہے ترے قطرۂ پیکاں سے دم بارش تیر — جگر چاک عدو میں صدف آسا گوہر
تیرا نیزہ ہے وہ طائر کہ عوض دانہ کے — مہرۂ پشت سے دشمن کے ہے چنتا گوہر
شعلۂ برق غضب سے ترے شاہانہ آب — مثل مریخ ہر اک سرخ ستارہ گوہر
جوہرداروں میں ہے دربار کے گر نامِ عقیق — آبداروں میں ہے سرکار کے ادنیٰ گوہر
گرجے گردوں کی طرح سے وہ بہ آوازِ مہیب — جوہری جسکو کہ بتلائے ہے گرجا گوہر
ہو تری کلکِ کرم جبکہ شہا گوہر بار — جیم محتاج کے دامن میں ہو نقطہ گوہر
نقطۂ قاف قلم سے جو ہو تیرے ہمسر — قاف تک قاف سے ہو بیضۂ عنقا گوہر
سینہ صافی سے تری ہووے صفا ایسی عام — دل کافر میں بھی ہو خال سویدا گوہر
ہو جو روشنگر عالم ترا انور دانش — موئے چینی میں پرویا کرے اعمیٰ گوہر
خسروا میں جو کہوں سب ترے اوصاف نکو — تو سدا منہ سے مرے پھول جھڑیں یا گوہر
ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن — تاکہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر
تار ہے پنجۂ خورشید پہ ہر روز طلا — تاگرہ میں رکھے شب عقد ثریا گوہر
دانۂ انجم گردوں سے پروتے جب تک — رشتۂ کاہکشاں میں شب یلدا گوہر
جب تلک جوش بہاراں سے ہوائے دمِ صبح — ٹانکے شبنم سے سر دامن صحرا گوہر
ہر برس جشن ترا تجھ کو مبارک ہووے — برسیں نیساںِ کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنجِ گہر روز نصیب
ہو نہ جز اشک سپر دامنِ اعدا گوہر

قصیدہ نمبر (۱۸)

ہے وہ جاں داروئے مے نافعِ اعضاء و حواس
کہ دلِ مردہ ہو زندہ تنِ بےحس حساس

قطرۂ مے سے ترقیِ حواسِ خمسہ
یوں ہو جس طرح کہ اک نقطہ سے ہوں پانچ پچاس

ہووے اس روغنِ کبریت سے مثلِ زرِ سرخ
رنگِ رخسار جو کلفت سے ہے ہم رنگِ نحاس

خشک مغزوں کو جو ہو بوئے گلاب اس کی بو
تر دماغ اتنا ہو دم لینے نہ دے فرطِ عطاس

قلبِ ماہیت اگر اس سے نہ بالکل ہو تو کیوں
قلبِ انساں میں تہوّر سے مبدل ہو ہراس

اس کی دولت سے عجب کیا دلِ مفلس ہو غنی
کہ یہ ہے شربتِ دینار علاجِ افلاس

دیوے ساقی جسے اک جام وہ دعوےٰ سے کہے
آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس

اللہ اللہ رے تری مستی و بالا دستی
نشہ کہے مست کہ کر لولیِ گردوں سے مساس

سلسبیل آکے اگر خلد سے ہو آبِ سبیل
کہے مے نوش کہ بجھتی ہے کوئی اُس سے پیاس

زندگانی سے ہے مقصود شراب و ساقی
اور باقی تو ہے سب وہم و خیال و وسواس

زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو
پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاسِ انفاس

بیٹھ گوشہ میں نہ تو چھوڑ کے اس جلسہ کو
دیکھ رندانِ خرابات نشیں کا اجلاس

مے نہیں برقعِ مینا میں مگر جلوہ فروز
کوئی خورشید لقا ہے شفقی رنگ لباس

اے خنک دل کبھی تو اس سے ہو سرگرمِ نشاط
غم کو جا دل میں نہ دے جی کو نہ رکھ اپنے اداس

دل جو گھر غم کا ہو کیا اس میں ہو سرمایۂ عیش
وہ مثل ہے کہ کہاں گھونسلہ میں چیل کے ماس

دلِ پُر وسوسہ کی ہوتی ہے مے سے واشد
کُھلتا ہے ہاتھ سے ساقی کے یہ قفلِ وسواس

میں یہ کہتا ہی تھا جو دل نے مرے مجھ سے کہا
توبہ کر توبہ نہ کر اتنی زیادہ بکواس

ایسے مردار بد افعال کا تو نام نہ لے
حامیِ شرع ہے وہ بادشہ پاک انفاس

شاہِ دیندار بہادر شہ غازی جس نے
خانۂ توبہ و تقویٰ کو کیا محکم اساس

دور میں اس کے ہو گر محتسب مے کوئی
کرے ہر قطرہ کلیجے میں خراش الماس

مے اگر آب بقا بھی ہو تو ہو وہ زہر اب
جسکے پینے سے ہو جینے ہی سے میخوار کو یاس

دھووے اس عہد میں گر زخم کو مے سے جرّاح
تو رہے حشر تلک سوزش و درد و آماس

کہتے اس آب شرر انگیز کو ہیں آج بشر
کہ یہ روغن ہے سر آتش شرّ خنّاس

تا نہ باقی رہے مے اور نہ مے میں مستی
توڑ تا سنگِ نمک سے ہے وہ شیشہ کا گلاس

احتساب اسکا جو دے سنگ پہ شیشہ کو پٹک
تو صدا ہو نہ بلند اُس سے بجز حمد و سپاس

مدح حاضر میں پڑھوں اُسکے کوئی مطلع میں
کہ سخن فہم و سخنور کا ہے وہ قدر شناس

نطق تیرا ہے وہ تیرا شہد کہ ہر درد کو راس
شان ہیں جسکے شہا فیہ شفاء للناس

ہندوی زلف کے ہے پاس سدا مصحف رخ
عہد میں تیرے ہے کافر کو بھی اسلام کا پاس

مومیائی ہو حمایت ترے حق میں اُس کے
سخت گیری سے فلک توڑے کسی کی گر آس

بوٹی اکسیر کی اور پارس اگر ہاتھ آئے
ل بے ہمت ترے نزدیک یہ پتھر ہے وہ گھاس

چمن دہر میں نرگس بھی تری بخشش سے
رکھتی ایک کاسۂ زر ہے اور اک سیمیں طاس

کیا عجب فیض سے گر ابر کرم کے تیرے
بید مجنوں میں ہو پیدا ثمر سیب و گلاس

تیری شمشیر کے آگے نہیں رکھتی ہرگز
مغربی تیغ مہ نو کی شہا رتبۂ داس

فیض تعلیم سے تیرے ہو جو منکر انساں
احمق الناس اُسے جانئے بلکہ نسناس

لوح تقدیر کے لکھے کو پڑھے حرف بحرف
تربیت سے ترے امی بھی ہو یہ حرف شناس

یوں ترا حاسد پر عیب ہے عالم میں حقیر
اسپ بد فال کوئی جیسے میان نخّاس

دیکھے آہو کو جو ضیغم تو وہیں عدل ترا
ڈھانک دے آنکھوں کو اسکی روش گاو خراس

نہ ہے خورشید کے طالع کہ شعاع خورشید
دم تزئیں تیرے گھوڑے پہ لگے جائے قطاس

ایسا چالاک کہ اس طرح سے اُڑ جاتا ہے
جس طرح عاشق دل باختہ کے ہوش و حواس

پہنچے اُس رخش فلک سیر زمیں پیما کو
نہ منجّم کا خیال اور نہ مہندس کا قیاس

تیرا ہاتھی ہے فلک کاہکشاں ہے خرطوم
کان دونو مہ و خور دُم ہے ذنب سر ہے راس

ذنب و راس وہ جن سے ہوں سیہ بخت عدو
ماہ و خور وہ کہ ہوا خواہ ہوں روشن انفاس

رنگ ہاتھی کا سیہ اور وہ دانت اُس کے سفید
کہتا ہے دیکھ کے یہ ظلمت و نور اپنا قیاس

طرفہ صنعت سے لپیٹا ہے شب یلدا نے
صفحۂ صبح منور کو مثالِ قرطاس

ق

ختم کرتا ہے سخن ذوق دعا پر اس طرح
تا ہوں دریا میں گہر کان میں پیدا الماس

تو شہ بحر و بر اے شاہ سکندر فر ہو
دے خدا عمرِ خضرؑ تجھ کو حیاتِ الیاسؑ

عید ہر سال ہو فرخ تجھے با عیش و نشاط
تو ہمیشہ رہے خوش اور ترا بدخواہ اداس

قصیدہ نمبر (۱۹)

ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارشق
تاب رخسار فلق سرخی رخسارِ شفق

وہ جبیں ماہ مبیں اُس پہ خطِ چین جبیں
تھی وہ انگشت نبیؐ جس نے کیا ماہ کو شق

کرے دو ٹکڑے جگر کھینچ کے ابرو تلوار
باندھ کر کھینچ لے دل زلف مسلسل کی دہق

تیر انداز جو مژگاں تو ادا دشنہ گداز
چشمِ ابلق تو نگہ ترک سوارِ ابلق

غمزہ و ناز کرشمہ وہ بلا غارت گر
کہ نہ چھوڑیں تن عشاق میں جاں ایک رمق

سرو قامت سمن اندام گلستاں رخسار
ہونٹ گلبرگ دہن غنچہ و بینی زنبق

سرو قامت سے اگر اس کے ہو طوبیٰ سرکش
راست ہاں راست ہے یہ کُلُّ طَوِیْلٍ اَحْمَقُ

شکر آمیختہ با دامِ مقشر دنداں
سیب فردوس زنخداں لب خنداں فستق

کھلنا اُس کے دہن تنگ کا ایسا مشکل
جیسے دشوار ہو مفہوم کلامِ مغلق

مصحف روئے کتابی کو جو دیکھو اُس کے
تو کہیں صورتِ اخلاص نہ پاؤ مطلق

لوحِ رنگیں سے نہ زیبا ہو بیاض گردن
تا کہ ہو سرخی شنجرف نہ خونِ ناحق

دست و بازو و بر و دوش عجب صبح بہار
پنجہ و پنجۂ خورشید و حنا رنگ شفق

سینہ تا ناف صفا آب گہر کا دریا
ناف ایک عکس ذقن اسمیں بجائے زورق

نازک ایسی کمر اس کی کہ سمجھنا مشکل
جس طرح شعر خیالی میں ہوں معنیٔ ادق

ہے گراں اس پہ نزاکت سے نہ باندھے ہرگز
گر ہو تارِ نظر دیدۂ عنقا منطق

اُس کا زانو وہ مصفا کہ اگر دیکھے اُسے
آئینہ آبِ خجالت میں رہے مستغرق

کیا کہوں ساق بلوریں کی صفائی اُسکی
شمع گر دیکھے اُسے شرم سے آجائے عرق

قد جو گلبن تو وہ پاؤں کے حنائی ناخن
نیچے گلبن کے پڑے بکھرے ہوئے گل کے ورق

آکے بالیں پہ وہ طنّاز سراپا انداز
مجھ سے یہ کہنے لگا کیوں ہے تو غمگیں ناحق

مژدۂ عید سے ہے گلشنِ عالم میں بہار
نغمۂ عیش سے ہے بزمِ جہاں میں رونق

دوش پر سرو لبِ جو کی ہے اک سبز قبا
بر میں لالہ کے بھی گلشن میں ہے گلگوں یلمق

جوشِ سبزہ سے ہے وہ فرش سرِ صحنِ چمن
کوئی مخمل اُسے کہتا ہے کوئی استبرق

بائعِ عالم میں ہے یہ جوشِ بہارِ عشرت
ٹپکے ہے مخل سے مستی میں ہمیشہ راوق

تو بھی کر تہنیتِ عید کا اُس کے ساماں
کہ ہے وہ خسروِ دیں حامیٔ دینِ برحق

وہ بہادر شہِ غازی کہ دمِ معرکہ ہوں
اُسکے تیروں کی ہدف اسکے حسودوں کی حدق

مدح اُس کی ہے مناسب تجھے بلکہ انسب
یعنی توصیف کے لائق ہے وہ بلکہ الیق

سن کے یہ میں نے کہا مدح میں اسکے مطلع
جسپہ احسنت کہیں مجھ کو لبید و عمعق

تو ہے وہ نائبِ ختمِ رسل اے سایۂ حق
کہ ترے سایہ میں ہے گلشنِ دیں کو رونق

ابرِ رحمت کا ہے سایہ ترا اے سایۂ حق
کیونکہ سایہ میں ترے ہو نہ جہاں کو رونق

کس کا مقدور کہ سرتاب ترے حکم سے ہو
جو ترا امر ہے الحق جو کہے تو صدق

ذکرِ حق سے کوئی خالی نہیں تیرا ہے وہ دور
کرتا میخانہ میں ہے شیشۂ مے بھی حق حق

گر کرے نشوونما نامیۂ فیض ترا
گل جو ہو شمع سے پیدا تو گلاب و زنبق

[illegible] ہیبت کا تری کوئی زباں پر آیا
ہوگئی دقت کنایت جو زباں خامہ کی شق

نطق شیریں سے ترے ہووے حلاوت گر عام — کام میں خلق کے بورا ہو بجائے بورق
ناتوانوں کو جو دے زور حمایت تیری — مارے لات اڑ کے سر پیل دماں بچہ بق
کہتے ہیں برق جہاں جسکو وہ ہے اک ادنیٰ — توپخانہ میں تیرے توپ پہ زریں بیرق
کوتہی جس پہ کرے کاہکشاں کی بھی کمند — وہ تری ہمت عالی کا ہے عالی جوسق
قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحاب ہمت — بوٹی اکسیر کی پیدا ہو بجائے سرمق
کرتا ادنیٰ کو جو اعلیٰ نہ ترا منصوبہ — پاتا نشطرنج میں فرزیں کا نہ رتبہ بیذق
کرتا اک جست میں ہے ماہی گردوں کا شکار — طائر تیر ہوائی ترا مثل لقلق
ق اے شہ دادگر اے خسرو انصاف پرست — اللہ اللہ رے عدالت کا تری نظم و نسق
اتنا عالم میں حذر خوں سے ہے خونخواروں کو — خون فاسد کو بھی ہرگز نہ کرے نوش علق
پرتو افگن ہو اگر روشنی طبع تری — ابرق آئینہ ہو اور سنگ سیہ ہو ابرق
مشتری بھی ترے نشطرنج کا اک مہرہ ہے — آفتاب ایک ترے گنجفہ کا گر ہے ورق
ق ابر ہے گرچہ مثال نمد نمدیدہ — گر تری برق غضب جھاڑ دے اُس پر چقمق
تو شتابہ سے بھی جل اُٹھے زیادہ وہ شتاب — آگ لگ جانے میں دیر اسکے نہ ہووے مطلق
تیرے توسن میں وہ جلدی کہ اگر چھیڑ دے تو — یوں وہ اڑ جائے کہ جیسے سر آتش زیبق
ق شمس کو پہنچے تری رائے سے یوں شرق میں نور — تو ہو مغرب میں گرا لے پر تو نور مطلق
جس طرح روشنی قلب سے اہل اشراق — عرصہ دور سے شاگرد کو دیتے ہیں سبق
ق ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر اس طرح — تا کہ ہوں ارض و سما دونوں طبق زیر طبق
ہووے ہر سال مبارک تجھے عید رمضاں — اور دشمن کو رہے تیرے سدا رنج و قلق

قصیدہ نمبر (۲۰)

ایک دن فرمایا کہ یہ ہمارے بادشاہ کے پہلے سال جلوس کا قصیدہ ہے۔ شاہ نصیر مرحوم بھی دکن سے آئے ہوئے تھے۔ دل نے کہا کہ قصیدہ لکھئے۔ اور ایسا لکھئے کہ اُستاد

بھی کہیں کہ ہاں شاگرد نے کچھ لکھا۔ یہ طرح خدا نے دی اور خود سرانجام کیا۔ اللہ اللہ ان دنوں کا جوشِ طبع بھی یادرہیگا۔ عجیب عالم تھا ٭

ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگِ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

یہ جوش نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن
گلشن میں گویا چھا گیا نور سحر رنگِ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن زیب چمن شان چمن
ہر سیمبر گلگوں قبا نور سحر رنگِ شفق

افشاں جبیں پر سر بسر مہتاب و انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نور سحر رنگِ شفق

لب پر تبسم ہے کہ ہے جوشِ بہار و موج گل
دندانِ با نخرہ وہ ہیں یا نور سحر رنگِ شفق

ہر مجمع پیر و جواں ایک طرفہ مشرق ہے کہ واں
روشن دل و رنگیں ادا نور سحر رنگِ شفق

جام بلوریں میں ہے یوں عکس شراب لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نور سحر رنگِ شفق

حسن گل مہتاب نے جوش گل سیراب نے
کیا باغ میں چمکا دیا نور سحر رنگِ شفق

دیکھے چمن میں برگ گل آلودۂ شبنم جو کل
خجلت سے پانی ہو گیا نور سحر رنگِ شفق

ہے شوق کو بالیدگی ہے ربط کو چسپیدگی
کس رنگ ہوں ملکر جدا نور سحر رنگِ شفق

ساقی مئے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پر
آب و ہوا جائے فضا نور سحر رنگِ شفق

جشن بہادر شاہ ہے روز علو جاہ ہے
ہے اسلئے بہجت فزا نور سحر رنگِ شفق

وہ خسرو روشن گہر جس کو خجل ہوں دیکھ کر
ماہ و ثریا و سہا نور سحر رنگِ شفق

اک صاف مطلع میں لکھوں اور وہ ثنائے رنگ دوں
ہوں دیکھ کر غرق حیا نور سحر رنگِ شفق

روکش ہو تیرے رخ سے کیا نور سحر رنگِ شفق
ذرہ ہے تیرے فیض کا نور سحر رنگِ شفق

اے آفتاب عز و شاں تیری جبیں سے ہے عیاں
نور یقیں رنگ حیا نور سحر رنگِ شفق

روشن بیانی سے تری رنگیں کلامی سے تری
شرمندہ ہوتا ہے سدا نور سحر رنگِ شفق

وہ سیمگوں ایواں ترا وہ سائباں رنگیں کھچا
لیں دام اب جس سے صفا نور سحر رنگِ شفق

فانوس شیشہ لعلگوں روشن تری محفل میں ہوں
گویا کہ شیشہ میں بھرا نور سحر رنگِ شفق

انصاف نے ترے نہ سیماب آتش کو کیا
یوں جمع جیسے دیکھا نورِ سحر رنگِ شفق

تیری امان و حفظ سے ہو جائے حق میں شمع کے
نارِ خلیل آبِ بقا نورِ سحر رنگِ شفق

خورشید تجھ سے فیض کو پہنچے تو مشرق میں ہو
جز دُرّ و لعل بے بہا نورِ سحر رنگِ شفق

جس پر کہ تو ہووے غضب ہو اُسکے حق میں کیا عجب
سیلِ فنا برقِ بلا نورِ سحر رنگِ شفق

شمشیر کی تیری چمک خونِ عدو سے یک بیک
دکھلائے ہے روز وغا نورِ سحر رنگِ شفق

پیکان تیر الماسگوں منہ سرخ سوفار وں تجھے یوں
گویا لگا کر پر اڑا نورِ سحر رنگِ شفق

جلوہ ہے تیری مہر کا شعلہ ہے تیرے قہر کا
ہے جسکو عالم جانتا نورِ سحر رنگِ شفق

اسپ حنا بستہ ترا وہ نقرہ خنگ بادپا
غیرت سے جس کے اُڑ گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ق اب ذوق کی ہے یہ دعا جب تک رہے شاہنشہا
خورشید و مہ ارض و سما نورِ سحر رنگِ شفق

جب تک لباس دہر کو صابون اور شنجرف ہو
زینت دہ صبح و مسا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر جشن فرخ ہو تجھے اس طرح آب تاب سے
ہوں تیرے محتاج ضیا نورِ سحر رنگِ شفق

شاہا زمانہ میں ہوتا باآبرو اور سرخ رو
ہو جلوہ گر مشرق سے تا نورِ سحر رنگِ شفق

دشمن کا تیرے منہ ہو فق اور خون بھی دل ہو کے شق
دیکھے نہ وہ اس کے سوا نورِ سحر رنگِ شفق

قصیدہ نمبر (۲۱)

طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ
دیکھ کر بھاگے جسے رنج ہزاروں فرسنگ

بل بے بالیدگیٔ عیش کہ برگِ گل پر
قطرۂ شبنم کا ہے مینائے شراب گلرنگ

واہ کیا گلشنِ آفاق میں ہے جوشِ بہار
چہچہے کرنے لگی بلبل تصویرِ فرنگ

کلکِ نقاشیٔ قدرت سے گلستاں میں ہے آج
تختۂ لالہ و گل صفحۂ نقش ارژنگ

خسروا آج کیا تو نے وہ جشنِ نوروز
دیکھ کر جس کے تجمّل کو ہو جمشید بھی دنگ

ہے ترے بزم طرب میں پئے رسم نوروز
صورتِ بیضۂ زرّین فلک مینا رنگ

مشک افشاں ہو جہاں میں جو تری نکہت خلق
نافۂ آہوئے ختن سے نہ ہو کم داغ پلنگ

بلکہ ہو جوشِ بہاران کرم سے تیرے
کیا عجب شاخ میں آہو کے گُلِ رنگا رنگ

تیرے انصاف سے ہے بزمِ جہاں میں شاہا
شمع گلگیر سے اور شمع سے محفوظ پتنگ

ہو اگر شعلہ فشاں تیری ذرا آتشِ قہر
تو سمندر رہے پانی میں بجائے خرچنگ

ق
زیرِ راں تیری ہے وہ توسن چالاک کہ تو
چھیڑ دے ایک ذرا اسکو جو وقت صفِ جنگ

یوں کرے جست کہ جیسے سر میدان نبرد
منہ سے اُڑ جائے حریفوں کے ترے خوف سی رنگ

رکھتی ہے رعشہ تپ لرزہ ہیبت سے ترے
نبضِ محموم کی مانند جبل میں رگِ سنگ

مرغ دل کو ترے دشمن کے قفس ہے سینہ
اور جگہ چوب قفس کے ہے ترا تیر خدنگ

ہووے حاسد کو نہ آزار حسد سے صحت
تاکہ دارو نہ پیلے میں بھرے تیری تفنگ

مفسد و حاسد و غماز و عدوئے سرکش
زیرِ شمشیر غضب تیرے ہوں چاروں چو رنگ

آنہیں سکتے بیاں میں ترے اوصاف تمام
ہوتا ہے قافیہ سنجوں کا یہاں قافیہ تنگ

ق
کرتا اس رنگ سے ہے ختم سخن دیکے دعا
ذوق جو ہے ترا مداح محبّ یکرنگ

گلشنِ دہر میں ہر سال مبارک تجھکو
جشنِ نوروز بہر رنگ بتاج و اورنگ

اور ترے حاسد بدبیں کو دکھائیں لاکھوں
خسروا روز نئے رنگ فلک کے نیرنگ

قصیدہ نمبر (۲۲)

حبذا ساقیٔ فرخ رخ و خورشید جمال
مرحبا مطرب ہاروت فن و زہرہ خصال

بارک اللہ کہ دُر افشاں ہے تو اے ابر بہار
خیر مقدم کہ خراماں ہے تو اے بادِ شمال

للہ الحمد بالب ہے مۓ عیش سے جام
شکر للہ زر گل سے ہے چمن مالا مال

جوشِ روئیدگیٔ سبزہ سے ہو جائیگا سبز
گل زمین چمن حسن میں تا دانۂ خال

اللہ اللہ رے سرسبزیٔ گلزار جہاں
کیا عجب ہو روشِ خضر اگر رنگِ ہلال

ثمرِ تیشہ فرہاد سے پیدا ہوئے گل
بل بے جوشِ گلِ خودرو سرِ وامان خیال

جوشِ فوّارہ ہے واں کثرتِ تارِ بارش
سرِ مجنوں کے تھے آلودہ جہاں گرد سے بال

کیا عجب رحمتِ باری سے کہ وقتِ باراں
ابرِ مردہ سے بھی ہو قطرہ فشاں آبِ زلال

معجزِ باد سے مانندِ عصائے موسیٰ
شجرِ خشک بھی ہو جائے تر و تازہ نہال

ذوقِ مستی سے ہے طاؤس چمن میں رقاص
شوق آہنگ سے ہے سرو پہ قمری قوال

شورِ بلبل بھی یہ رکھتا ہے نمک آج کہ گل
بن گیا کثرتِ شبنم سے نمکداں کی مثال

دیتی ہے طاقتِ پرواز یہ کیفیتِ مے
اس ہوا میں ہے بطِ مے کہ اڑوں بے پر و بال

ہے یہ وہ دور کہ ہر صوفی صافی مشرب
رقصِ مستاں میں رہے وجد کناں شاملِ حال

بیدموں کو جو نئے چارہ گر عیسیٰ دم
شمعِ مردہ کی رگِ تار سے کھولیں قیفال

پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز
جنبشِ دستِ مژہ دے ہے اس انداز سے تال

ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خطِ غبار
صفحۂ مہر پہ کیا دخل جو ہو گردِ ملال

روزِ جشن آج ہے اُس کا کہ جسے کہتی ہے خلق
نائبِ ختمِ رسل ظلِّ خدائے متعال

وہ بہادر شہ غازی کہ اگر تیغ اس کی
اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال

وہ نکو خوے نکو روے و خجستہ منظر
وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال

وہ مسیحا دم و یوسف رخ و داؤد الحاں
وہ سلیماں وش و موسیٰ کف و صالح اعمال

چمنِ خلق و نسیمِ کرم و ابرِ سخا
چشمۂ فضل و ہنر کانِ عطا بحرِ نوال

آسماں جاہ و عطارد قلم و مہرِ علم
مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جلال

خسرو جم حشم و داور و کسریٰ انصاف
شاہ دارا دل و سلطان سکندر اقبال

مدح حاضر میں پڑھوں اسکے وہ مطلع جس سے
ہمسری کی نہ رکھے مطلعِ خورشید مجال

ہو تری یک نظرِ فیض سے ناقص کو کمال
مہر سے گر مہ کامل ہو دو ہفتہ میں ہلال

نیّرِ جاہ ترا وہ ہے جسے تا دورِ فلک
نہ کسوف و نہ غروب و نہ ہبوط و نہ زوال

آگے بخشش کے ترے خرمنِ در یکدانہ
آگے ہمت کے ترے کوہِ طلا یک مثقال

ہووے جوں چادرِ مہتاب گلیمِ شبِ تار — رُخِ پرنور جو تو پونچھ کے جھاڑے رومال
جام سے قطرہ جو ٹپکا تو معلق ہی رہا — دستگیری نے لیا تیری جو گرتوں کو سنبھال
گر ترے قہر کی گرمی تپِ محرق بن جائے — لبِ دریا پہ حبابوں کی جگہ ہوں تبخال
قوتِ ماسکہ ممسک کے قوئ سے گم ہو — فیض جاری ہے ترے بخل کو یاں تک ہو زوال
حکمت آموز ترا علم جہاں ہو تو وہاں — نہ ارسطو کو ہو طاقت نہ فلاطوں کو مجال
ہو تری عقل سے عاجز دمِ بحثِ معقول — اک مقولہ میں فقط فعل کی عقلِ فعّال
ق دم ہے کیا بادِ صبا میں کہ دمِ سیرِ جہاں — تیرے گلگونِ سبک سیر کے جاوے دنبال
یونہی دو چار قدم خاک اڑا کر رہ جائے — اور نہ پہنچ جائے کہیں سے وہ کہیں مثلِ خیال
ہے وہ ہیکل میں اگر دیو تو صورت میں پری — ہے اوڑان اُس میں ملک کے تو بشر کیسے خیال
جلد اتنا کہ جہاں عرصۂ جولاں اُس کا — عہدِ مستقبل و ماضی کا وہاں ہے یک حال
زیب تن اسکے جو مہندی کا ہے گلِ تصویر — پھرتا کاوے میں ہے وہ صورتِ فانوسِ خیال
اُس فلک سیر کو جولاں جو کرے تو تو یہ ڈر — مزرعِ سبزِ فلک ہو نہ مبادا پامال
ق تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ — سر پہ اندیشہ نے لی ہاتھ سے دستار سنبھال
کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پر پھینکے — نیشکر راہ میں مانگیں اگر اُس سے اطفال
جیسے ماتھے پہ بزرگوں کے ہو سجدہ کا نشاں — اسکی مستک پہ شہا جلوہ نمایاں ہے ڈھال
ہے جو اُس فیل کی خرطوم سرافیل کا صور — آئے اعدا پہ قیامت سرِ میدانِ قتال
اُسکے دانت اُن کے لئے ہیں روشن تیرِ شہاب — ہے جن اعدا کو سرِ اوج شیاطیں کی مثال
ق آبداری ہے تری تیغ کہ ہے برق کی موج — کیا تماشا ہے کہ ہے آب سے آتش سیال
تیری شمشیر کو ہے خونِ عدو روز مباح — یہ غلط تیسرے دن ہوتا ہے مردار حلال
طائرِ روح عدو کے لئے صیادِ اجل — سبزۂ تیغ میں جوہر سے لگا رکھتا ہے جال
طاقتِ دم زدن اس دور میں ہے کس کو رہی — دیکھ کر تیرا نسق اے شہِ فرخندہ خصال
پر ترا ذکر جو آتا ہے زباں پر تو نفس — لب پر آجائے ہے سینہ سے پئے استقبال

ہو قوی دست اگر زور حمایت سے ترے
شیر سے پنجہ کرے پنجۂ مژگان غزال

تقویت دیوے اگر پاس حفاظت تیرا
شعلۂ شمع کو صرصر سے نہ ہو اضمحلال

ہے ترے عہد میں فتنہ سے زمانہ خالی
فیلسوفی ہے حکیموں کی خلا کہنا محال

ق
آتش و آب میں یہ ربط ترے عدل سے ہے
دیوے ہیزم کو جلا کر کوئی پانی میں جو ڈال

کاکل موج دخاں کے لئے اُس کے دریا
ہے تہ آب سے شانہ پر ماہی کا نکال

خبر جملۂ عشرت ہے ترا جشن سعید
مبتدا جس کا شہا غرّۂ ماہِ شوّال

ہوتی ہے حیرت توصیف سے تیری شاہا
روش غنچۂ تصویر زباں منہ میں لال

ق
بس دعا ہی پہ فقط ختم سخن کرتا ہے
یہ جو ہے ذوق ثناخواں ترا اور مدح سگال

جشن ہر سال ترا ہووے مبارک تجھ کو
رہے جب تک کہ زمانہ میں حساب مہ و سال

قصیدہ نمبر (۲۳)

لاتا نیرنگ سے ہے رنگ نئے چرخِ محیل
واہ بگڑا ہی کچھ اس خُم میں عجب رنگ ہے نیل

ڈر زمانہ سے وہ عیار ہے یہ ہوش رُبا
لاکھ بیہوشیوں سے جسکی بھری ہے زنبیل

ہے توکل کا احاطہ وہ عزیمت کا حصار
کہ بجز حفظ خدا جسکی نہ خندق نہ فصیل

گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفاتِ اصلی
زنگ دبتا ہے چھپا جوہر شمشیر اصیل

پیش دشمن نہ گذر حق سے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتش نمرود گلستان خلیل

ہوتے سیرت سے ہیں مردان دلاور ممتاز
ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

نہیں بے قید علائق کسی عالم میں بزرگ
رسم تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل

ہے تہ خاک بھی قارون کو سفر حشر تلک
نہیں تا تحتِ ثریٰ منزل آرام بخیل

عید یکروز جہاں میں رمضاں ہے یکماہ
بعد ہے کثرت تکلیف کی یاں عیش قلیل

کشت سبز فلک دوں سے نہ رکھ چشم ثمر
خوشۂ فیض سے بے بہرہ ہے یہ مزرعۂ نیل

قابل انسان کی صحبت کے ہے انسان تلک
بنگیا پیش نبیؐ صورت دحیہ جبرئیل

جتنا خورشید تپے اتنی ہی بارش ہو سوا
ہووے کیونکر تپش عشق نہ رحمت کی دلیل

عشق کھنچوائے ہے اک زار جفاکش سے بزور
بار صد کوہ الم بے عمل جر ثقیل

لگے نہ ہر چرخ کو گر نالہ عاشق کی ہوا
دم میں اجزائے دخانی کی طرح ہوں تحلیل

شمع کشتہ کے لئے ہے دم عیسیٰ آتش
سوزش عشق سے زندہ ہوں محبت کے قتیل

معتبر ہے جو کرے نالہ دل درد اظہار
نالہ ہے دل کی زباں دل ہے موکل یہ وکیل

دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری
جس کا اجمال قضا اور قدر ہے تفصیل

جی میں ہے اور پڑھوں میں کوئی مطلع ایسا
گو سر مخزن معنی سے ہو جس کو تاویل

کنج حیرت میں کروں علم خموشی تحصیل
یہ عجب مدرسہ ہے جسمیں ہے کچھ قال نہ قیل

درس توحید سے لوں ایک شفا کا نسخہ
بحث میں علت و معلول کے ہے عقل علیل

جلوہ افروزئی یک نور دوئی ہے اسکو
شمع فانوس سمجھ خواہ چراغ قندیل

ق

فکر بیہودہ میں کس واسطے ہے تو پابند
کچھ نکال اپنے لئے ذوق نکلنے کی سبیل

خواب غفلت سے ہو بیدار کہ آئی پیری
نہیں مہتاب یہ ہے روشنی صبح رحیل

عرصۂ عمر ہے وہ تار کھنچا اور ٹوٹا
کچھ اگر وقت معین کی طرف ہے ہو نہ تعجیل

وہی منزل ہے جہاں ٹھیرے حیات گذراں
کہ پے راہ فنا کوئی نہ فرسخ ہے نہ میل

مشق اندوہ سے اک روز نہیں تو بیکار
تیرے ہفتہ میں نہیں کوئی بھی روز تعطیل

غم عصیاں ہے تو ہے رحمت غفار وسیع
فکر روزی ہی تو ہے رزق کا رزاق کفیل

ہے تمنائے زر و مال تو سب جائے گا چھوڑ
چھوڑ جانے کو تو کافی ہے فقط ذکر جمیل

پھر بہار چمن عمر میں دلگیر ہے کیوں
سیر کر سیر کہ ہے فرصت گلگشت قلیل

مژدۂ عید سے ہے دیکھ تو کیا رنگ چمن
گل کی رنگیں ہے قبا غنچہ کی رنگیں مندیل

ہوئے آراستہ ہیں آج بدل کر پوشاک
فصل سے باغ تک باغ سے لے تا بہ نخیل

نظر آتا ہے برنگ لب ساغر جو ہلال
ٹپکا پڑتا ہے لب مست سے شوق تقبیل

گاہ مے خُم میں ہے گہ شیشہ میں کیا کیا ہے سیر
روح کرتی ہے کسی مست کی قالب تبدیل

تہنیت خواں ہو تو آج اس شہ دریا دل کا
جسکے نزدیک ہے اک قطرہ سے کم قلزم و نیل

وہ بہادر شہ والا نسب و پاک گہر
خسرو چرخ سریر و شہ خورشید اکلیل

ماہِ نو چشم زدن میں مہ کامل ہو جائے
نظرِ مہر میں ہے اسکے وہ نور تکمیل

نور معنی ہے بہر شکل نتیجہ اس کا
اللہ اللہ رے زہے شکل شہنشاہِ شکیل

مدح حاضر میں پڑھوں مطلع روشن ایسا
مطلع شمس کو بھی جسکے ہو واجب تخجیل

بعد شاہان سلف کے تجھے یوں ہے تفضیل
جیسے قرآن پس توریت و زبور و انجیل

تو ہے اس طرح سے عزت دہِ اولادِ تمر
جیسے موسیٰ شرف افزائے بنی اسرائیل

نور افزائے بصارت ہو اگر تیرا جمال
آئیں آنکھوں سے نظر معنے اللہ جمیل

روئے نیکو یہ ہے مائل تیری خوئے نیکو
کہوں کیونکر نہ کہ الحُسنُ الی الحسنِ یمیل

ہے جو انسان کے قالب میں ترا نور ظہور
برجِ خاکی میں ہے خورشید فلک کی تحویل

دانش آموز ہو گر تربیت عام تری
بید مجنوں کو بنا دے ابھی انسانِ عقیل

جوہر تیغ اجل ایک ترے حکم کی نقل
تیر حکمیٔ قضا حکم کی تیری تعمیل

عہد میں تیرے جو ہو راہ تعدی مسدود
کھلے فعل متعدی سے نہ باب تفعیل

تشنۂ ذوق حلاوت ہوں نہ کیونکر سیراب
تیری شیریں سخنی ہے انہیں شربت کی سبیل

نکتہ چینوں کے لئے نکتۂ برجستہ ترا
قابضِ طبع رواں ہے روشِ دانۂ ہیل

جب ہوں مرغان ہوا تیرے نشان بندوق
نسر طائر کو بھی تو سمجھے ایک اڑتی ہوئی چیل

مہرۂ نشست عدو میں ترا تیر صف دوز
رشتۂ مہرۂ تسبیح کی مانند دخیل

طائر روح عدو کے لئے بہر پرواز
تیر کی تیری صدا جیسے کبوتر کو زفیل

ق
وہ قیامت ہے تری فوج کہ شورِ محشر
دم نہ مارے کبھی سن پائے جو گھوڑوں کی صہیل

نالۂ کوس کی ہیبت سے رکھے پھونک کے پاؤں
کوچۂ صور سے گزرے جو دم اسرافیل

ق
دوں ترے گھوڑے کو کیونکر میں پری سے نسبت | نہ یہ صورت نہ یہ رفتار نہ یہ ڈول نہ ڈیل
گرم جولاں وہ کہاں ہو کہ رکھے ہے وسعت | نہ تو میدان تصور نہ فضائے تخییل
عرصۂ معرکہ میں گر بے تجھے اے شاہسوار | اس بہک سیر سے منظور ہو کار تعجیل
جائے یوں جیسے ہوا اُسم بھی نہ پانی سے ہو تر | نہ ہو پروا اُسے ہے راہ میں تالاب کہ جھیل

ق
کوہ البرز کو سائے میں دبالے اپنے | ہے وہ اے شاہ فلک رتبہ تری رفعت فیل
حملہ آور ہو وہ جس دم تو پے جان عدو | اُس کی خرطوم ہو دست کشش عزرائیل
تو جو محراب عماری میں ہوا جلوہ نما | اسکے دانتوں پہ یہ خرطوم سے سوجھے تمثیل
خانۂ قوس میں خورشید جہانتاب آیا | دن ہیں کوتاہ ہوئے اور ہوئی رات طویل
نہیں یہ جوش گل و لالہ نکل آیا ہے | دادخواہی کے لئے خاک سے خون ہابیل
عدل نے تیرے کیا روئے زمیں کو گلزار | آج یک عدل میں کوئی نہ رہا تیرا عدیل
واسطے دیدۂ بدبیں کے ہے یہ عین صلاح | ہو تری نوک سناں سرمہ کور کے جو میل
تیر برسائے عدو پر جو کماندار قضا | کم نہ فوارہ سے ہو تیروں کی اس کی قندیل
رہزن نطفۂ بدخواہ ہو اول سے قضا | اُس کی پشت پدری سے نہ کبھی تا احلیل
محکمہ میں ترے انصاف کے ہوں ہاتھ قلم | دے اگر بھول کے بھی کوئی سر حرف کو چھیل
ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ | ہو گراں خاطر نازک پہ مبادا تطویل
عید ہر سال ہو فرخ تجھے با جاہ و جلال | ہوں قوی پایہ ترے دوست بصد قدر جلیل
جو ضلالت سے ہوں گمراہ وہ اے ظل خدا | ذل اقدام سے ہوں خاک مذلت پہ ذلیل

قصیدہ نمبر ۱۴۲

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں | کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں
ہے بادۂ نشاط طرب سے لبالب آج | اک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں
دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہان میں | گر ہو تمام چشم تماشا گر آسماں

اترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے — سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں
افراطِ انبساط سے ہے کیا عجب اگر — مثلِ حباب جامہ سے ہو باہر آسماں
شادی کی اُس کی دھوم ہو آج آسماں تک — تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں
فرزندِ شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار — تسلیم کو ہے جس کی جھکاتا سر آسماں
ہے اُس کی بارگاہ میں مانند چوبدار — حاضر عصائے کاہکشاں لیکر آسماں
اس بیاہ کی نوید سے ہے اس قدر سرور — ہے پیر پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں
پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن — مقدور کیا کہ ٹھیر سکے دم بھر آسماں
فردِ حساب صرف سے اس بیاہ کے ہو کم — گولا کہ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں
توروں کی پخت مطبخ عالی میں اس قدر — ہے جس کا ایک تودۂ خاکستر آسماں
اس روشنی کی چند دکھادے پنچیاں — نازاں ہے آفتاب کے پنجہ پر آسماں
ابر بہار وو چراغاں سے تہ بہ تہ — ہوں سات آسماں کی جگہ ستّر آسماں
چشمِ قمر میں اور بھی ہو روشنی دوچند — کاجل لگائے اس کے دھوئیں سے گر آسماں
کر ڈالے پارہ پارہ فلیتوں کے واسطے — مہتاب کو سمجھ کے کہن چادر آسماں
یہ کہنہ و سیاہ وہ خوش رنگ و نو بہ نو — فائق ہو کیا سبوچہ ساحق پر آسماں
پھلیوں میں ہیں وہ نقل پڑے انکا عکس اگر — لے کہکشاں کی مانگ میں موتی بھر آسماں
آرائش ایسی اور وہ گلہائے رنگ رنگ — ادنیٰ سا جنیں غنچۂ نیلوفر آسماں
بنوائے اُسمیں پھول طلائی و نقرئی — لے لے کے ماہ و مہر سے سیم و زر آسماں
نقارخانہ کی ہے چراغاں سے وہ شکوہ — گویا ہے اک زمیں پہ پُر از اختر آسماں
ق کرتا ہے رقص تخت پہ نقارہ خانہ کی — شہنائی کی صدا کو جو سن سن کر آسماں
آوازۂ دمامۂ نوبت سے گونج اٹھا — وہ جو سب آسمانوں کے ہے اوپر آسماں
دولھا دلہن کی ہے یہ علامت سہاگ کی — آیا ہے ایک سہاگ پڑا بنکر آسماں
جائے عجب نہیں ہے کہ عطرِ سہاگ کے — شیشہ کے شیشہ بھرکے لنڈھا دے گر آسماں

یارب ہمیشہ دولھا دولھن میں رہے سہاگ
جبتک کہ ہووے نیچے زمیں اوپر آسماں

مہندی کے وصف لکھنے کے قابل نہیں کہ ہے
نیلا سا ایک کاغذ بے مسطر آسماں

جو بُرج اڑے ہے اڑکے یہ ہوتا ہے وہ بلند
رکھ لے ہے سر پہ مثل گلِ احمر آسماں

کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار
شبنم کی جائے صبح تلک گوہر آسماں

پہنچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو
انجم سے لاکھ جمع کرے لشکر آسماں

عیش و طرب کو مژدہ کہ کرتا جہاں میں ہے
زہرہ سے اب قرآن مہِ انور آسماں

ہنگامِ بزمِ عقد ستاروں کیواسطے
کیا کیا سجے ہیں اوج و شرف کے گھر آسماں

بدبیں کے ہے نظر کے جلانے کے واسطے
انجم سپند آگ شفق مجمر آسماں

جسوقت سہرہ باندھ کے دولھا ہوا سوار
کیا کیا بلائیں لیتا تھا جھک جھک کر آسماں

کرتا تھا اِن یکاد کو دم پڑھ کے دمبدم
دولھا کے صبحدم رخِ روشن پر آسماں

ایسا نہیں جہاں میں کوئی نخلِ آرزو
لایا ہو آج جس میں نہ برگ و بر آسماں

کرتا ہے شاخِ خشک تمنا کو نخلِ سبز
در پردہ مثلِ پردہ بازی گر آسماں

شادی کا اس کے نورِ بصر کے ہے اہتمام
کرتا ہے جس کا روز طواف در آسماں

وہ شاہ نامور کہ بہادر شہ اس کا نام
ہو حکم سے نہ اُس کے کبھی باہر آسماں

وہ آفتابی اس کی تجمل جس سے آفتاب
وہ چتر اس کا جس سے نہ ہو ہمسر آسماں

مطلع پڑھوں حضور میں وہ میں جسے کہے
مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

تجھ سا زمیں پہ دیکھے جو فرخ فر آسماں
قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھر کر آسماں

طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع
کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں

نہ آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر
جس طرح کوہسار سے بالاتر آسماں

خطبہ کے واسطے ترے نامِ بلند کے
گر مشتری خطیب ہو تو منبر آسماں

وہ بحرِ بیکراں ہے تری ہمتِ وسیع
ہے بلبلا سا ایک کنارے پر آسماں

دریائے قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا
بہہ جائے مثلِ کشتیٔ بے لنگر آسماں

قد پر ترے وہ راست قبائے علوِّ جاہ
زیبندہ جس کے واسطے بالا بر آسماں

تیری گہر فشانیٔ دستِ کرم سے ہے
گویا کہ ایک دامنِ پُر گوہر آسماں

چمکائے تیغ تیز کو اقبال گر ترا
ہو مصقلہ ہلال تو صیقل گر آسماں

یوں دل میں تیرے جلوۂ ذاتِ محیطِ حق
آجائے جیسے آئینہ کے اندر آسماں

سُرعت میں تیرا رخشِ فلک سیر کیا شہاب
رفعت میں کھٹے پیل جبل پیکر آسماں

شاہا عجب نہیں ترے شبدیز کے لئے
بنوائے ماہِ نو سے رکابِ زر آسماں

پہنچا نہ اُس کے کاوے کے انداز کو کبھی
کھاتا رہا زمیں پہ سدا چکّر آسماں

انجم ہیں کیا شرر ترے نعلِ سمند کے
ہے بلکہ تیر اگردِ رہِ لشکر آسماں

ق

مانا اگر بلندیٔ شان و شکوہ میں
ہاتھی سے تیرے ہو بھی گیا ہمسر آسماں

پر اُس کے نقشِ پا کے مقابل بنا سکے
چار آفتاب ایک جگہ کیونکر آسماں

یہ ذوقؔ کی دعا ہے کہ جبتک زمانہ میں
منسوب ہر ستارے سے ہووے ہر آسماں

بزمِ نشاط و عیش رہے تیرے گھر میں روز
لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسماں

مارے جگر میں حاسد بدخواہ کے ترے
تار خطوطِ مہر سے سو نشتر آسماں

اشعار در تاریخ دیوان نواب الٰہی بخش خاں معروف

سبزہ رنگاں کہ بباغِ حُسنند
تازہ چوں شاخ گل و لالہ و ورد

از کمر تا دہنِ شاں موہوم
چوں خطِ جوہری و جوہر فرد

چشم دارند بقتلِ عُشاق
چوں حریفے کہ کند قصد نبرد

بجمالِ رُخ آنہا معروف
مُدّتے شد کہ دلش خوش میکرد

رفت صیتِ سخنش از دہلی
تا صفاہان و عراق و ما ورد

[illegible]

واندراں حال سخنہا می گفت
ہمہ چوں نالۂ موزوں پُر درد

صد و یک مطلع رنگیں آخر
گفت با نالۂ گرم و دم سرد

شد چو تسبیح زمرّد نامش
رونق و آب گہر رفت بہ گرد

مُرد فیروزہ و خوں شد دل لعل
کہربا چوں یرقانی شدہ زرد

ہمیں آن گنج گہر نیست چو خاک
گنج خسرو کہ بود باد آورد

ذوق چوں خواست دو تاریخش را
اندریں دفتر معنی بدو فرد

اوّل از دانۂ خوش رنگ شمار
کرد و آں عقدۂ مطالب وا کرد

باز با خامۂ رنگیں بنوشت
طرفہ تسبیح زمرد آورد

قطعہ تاریخ تعمیر چاہ معمرۂ محمد شاہ سہارنپوری

سیّد با صفا محمد شاہ
کرد تعمیر طرفہ مسجد و چاہ

ذوق تاریخ سال ہر دو بہم
زد رقم ساخت کعبہ و زمزم

خسروا نیّر اقبال کی تیرے خورشید
کھائے ہے وقت شرف عز و شرف کی سوگند

تاب کیا انجم سعادت سے ترے ہو ہمسر
منزل اوج پہ چمکے مہ تاباں ہر چند

دم تحویل یہ کہتے ہیں عناصر چاروں
چار چند آپ کا ہو مرتبہ بلکہ صد چند

پرورش امن کے سایہ میں کیا کرتا ہے
شیر نر بچۂ آہو کو بجائے فرزند

قصر دولت سے ترے مرغ نظر ریختہ پر
بام حشمت پہ ترے کاہکشاں نصف کمند

قصیدہ مسدس دعائیہ

سر بر آرائے گردوں جب تک سلطان خاور ہو
قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو

عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میر عمارت ترک گردوں میر لشکر ہو

سرِ ہفت آسماں جبتک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہِ ہفت کشور ہو

رہے نامِ سلیماں تا نگین حکمرانی سے
رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے
رہے نامِ فریدوں تا درفشِ کاویانی سے
سکندر تا ہو نامی سکۂ کشورستانی سے

ترا اے خسروِ والا حشم عالم مسخر ہو
سرِ سریرِ سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخارِ ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
زمیں میں تا ہو کان اور کان میں ہو جوہرِ کانی
رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی
پے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی

تری شمشیرِ جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضہ میں بحر پر گہر ہو کان پُر زر ہو

رکھیں تا عود کو آتش میں اور آتش کو مجمر میں
رہے نافہ میں مشک اذفر اور بو مشک اذفر میں
گلِ تر تا ہو گلداں میں ترے ہو تا گلِ تر میں
صدف میں تا ہو گوہر اور ہو تا آب گوہر میں

ترے ابرِ کرم سے باغِ عالم تازہ و تر ہو
شمیمِ خُلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو

طریقِ رہبری میں خضرؑ ہو جبتک ہدایت فن
رہے ادریسؑ تا قطعِ تعلق سے جناں مسکن
سہارا ہووے تا بحرِ غریقِ الیاسؑ کا دامن
مسیحا کا ہو بالاخانہ تا خورشید سے روشن

چراغِ عمر سے تیری جہاں سارا منور ہو
فروغِ اسلام کو ہو رونقِ دینِ پیمبر ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو
ثریا نورتن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو
کرے آراستہ تا شام اپنے موئے گیسو کو
کرے وسمہ سے تا قوسِ قزح سبز اپنے ابرو کو

لبِ پانخوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سرِ بدخواہ فندق تیری انگشتِ سناں پر ہو

گلستاں میں ہو تا گل اور گل سے شاخ ہو زیبا
نہال تاک میں انگور ہو انگور میں صہبا
نیستاں میں ہو تا نے اور نے سے نغمہ ہو پیدا
نشہ صہبا میں ہو اور ہو نشہ جبتک نشاط افزا

شراب عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشن جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

رہے تا کام دینداروں کو احکام شریعت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محراب عبادت سے
خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبہ کی زیارت سے
نماز اہل سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیب منبر ہو
ترا حامی ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ ہو

قلم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا آئیں
زباں پر تا سخن ہو اور سخن میں معنی رنگیں
قلمزن تا ہو مشک افشان و کاغذ خط سے مشک آگیں
سخن تا داد چاہے اور تا اہل سخن تحسیں

ترا مداح دائم خسروا ذوق سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعا گو ہو ثنا گر ہو

اشعار متفرقات قصائد و قطعات و مخمسات وغیرہ

قطعہ در مدح میرزا شاہرخ بہادر

میرزا شاہرخ بہادر نے
خون نخچیر سے ہوا سارا
نہ بچا اُس شکار افگن سے
مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ
ہے جگر گوشۂ بہادر شاہ
سمجھے شیر آپ کو ھزار غنیم
شیر گردوں بھی اس کے لشکر میں

قصد صید افگنی کیا جدم
دامن دشت لالہ زار ارم
صید کوئی سوائے صید حرم
ہوئے مسکن پذیر دشت عدم
ہو بہادر نہ کیوں وہ نیک شیم
اُس کے پر سامنے ہے مثل غنم
پائے ہرگز نہ قدر شیر علم

رہے مانندِ شیرِ قالیں کے — اوجِ ہمت ہے اسکے زیرِ قدم
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُس نے — ہمسرِ اژدہائے آتش دم
کئے شیرِ ژیاں شکار کئی — اُس غضنفر شکار نے پیہم
ہے بجا گر دلاورانِ جہاں — کھائیں اس کی دلاوری کی قسم
جبکہ اس جرأت و شجاعت کو — چاہا اس طرح دل نے کیجے رقم
تا رہے یادگار عالم میں — وصفِ عالیٔ صاحبِ عالم

لکھی اے ذوق میں نے یہ توصیف
مع تاریخ ثانیٔ رستم ۱۲۶۲ھ

لکھتے ہیں کس کی تہنیت عید مدح خواں — آراستہ ہوا جو قلمدان آسماں

عہد میں تیرے نکالے دانت گر سینِ ستم — کام لے زنبور کا خامہ سے دستِ معدلت
گر پڑے پاؤں پہ تیرے مہر آ کر سایہ وار — آفتابی سے جو تو کہدے کہ اُس کو روک مت

فصلِ گل آج ہے وہ سلطنت آرائے طرب — کہ ملا باغ میں بلبل کو ہزاری منصب

ہے اگر لیلیٔ سیاہی تو ورق عذرا عذار — خط ترا شیریں ہے شاہا اور قلم شاخِ نبات
ہو گیا خورشید مالا مال وہ ہیں نور سے — دی جو تم نے دولتِ انوارِ دانش کی زکوات
ہاتھ میں بندوق لے جس وقت تو بہرِ شکار — نسرِ گردوں کو ہو مشکل ہاتھ سے تیرے نجات

بدنہیں پر ترا توسن وہ پری ساں پرّاں — سیر گہ جس کے ہے اک قاف سے لیکر تا قاف
ہو قوی دست ترے زور سے اسلام اگر — کھینچے شمشیر سرِ کفر پہ پھر مرکز کاف
پاتا گرداب سے ہے گردۂ نانِ آبی — تیری بخشش سے جو دریا کا معیّن ہے کفاف

دستِ ہمت نے ترے کھوئی روپے کی یہ قدر	چٹکیوں میں ہیں اُڑاتے اُسے کیا کیا صرّاف
دیتا ہے تیری فوج میں نقارہ جب فلک	آتا ہے صاف چوب کی صورت نظر ہلال
تا نسر طائر ایک پرندہ نہ بچ سکے	منظور تجھ کو جب کہ شکار پرند ہو

مطلع قصیدۂ مدح حضرت بادشاہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ

قصیدہ مرقومۃ الذیل آغاز شباب کا تھا۔ والد مرحوم نے ایام جوانی میں ایک بیاض بنائی تھی۔ استاد مرحوم کی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں ایک قصیدہ اکبر شاہ رضوان اللہ علیہ کی مدح میں تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ بندۂ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے۔ نہ وہ رہے۔ نہ بیاض رہی۔ یہ چند اشعار یادگار رہے۔ ؏ اللہ ؏۔ تو باقی و یادگار باقی ؛

آج کچھ ایسی ہوائے عیش کی تاثیر ہے	ہر ورق کاغذ کا رنگ گلشن کشمیر ہے
گر نہالِ دشت کو شوق حنا بندی نہیں	ہاتھ کیوں مہندی سے رنگتا برگ بید انجیر ہے
مدح حاضر میں سنا دے مطلع روشن کہ ذوقؔ	منتظر مشرق میں بیٹھا مہر پر تنویر ہے
نام کو اللہ اکبر کیا تری تاثیر ہے	ہر اذاں میں شامل اور داخل ہر تکبیر ہے

بادشاہی قصہ خوانوں میں میر امیر علی نام ایک خوش بیان شخص تھے۔ انہوں نے استاد مرحوم سے کہا کہ گھوڑے کی تعریف میں چند شعر کہہ دیجئے کہ داستان میں جب ایسا موقع آتا ہے۔ تو اشعار حسب دلخواہ نہیں پاتا۔ جی ڈھونڈتا رہ جاتا ہے۔ استاد مرحوم نے حسب عادت وعدہ کر لیا مگر پورا کرنے کی فرصت کہاں۔ جب کئی تقاضے گذر گئے۔ اور اُنہوں نے پھر کہا تو ایک دن فرمایا کہ جب ہم بادشاہ کے لئے قصیدہ کہیں تو یاد دلانا۔ اُس میں طبیعت پر ذرا زور ڈال کر کہیں گے۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔ ہمارے قصیدہ کا ایک جز قوی ہو جائیگا چنانچہ ایسا ہی ہوا ؛

قصیدہ مذکور معدوم ہوگیا۔ غدر کے بعد عالم تباہی میں ایکدن میر موصوف حافظ ویران کو مل گئے۔ حافظ کو اللہ مغفرت کرے اُن سے اشعار مفصلہ ذیل حاصل کئے۔ اور مجھے دیئے۔ تین شعر متفرق اور بھی ہیں وہ بھی لکھتا ہوں ؎

کروں رقم جو اگر تہنیت کا میں آہنگ — تو ہووے خامہ سے پیدا صدائے بربط و چنگ
ہے تیرا زورِ حمایت کہ پاؤں کو اپنے — کرے ہے شیر کی چربی سے مالش آہوئے لنگ
شہا ترے رُخِ روشن کو کس سے دوں تشبیہ — کہ مہر و مہ کو گہن لازم آئینہ کو زنگ

گھوڑے کی تعریف میں

کروں میں کیا ترے گلگوں کا وصف چالاکی — اُڑا ہی جاتا ہے وہ تو برنگ طائر رنگ
نہ پہنچے گرد کو اس کے وہ پیک فکر رسا — کہ ہووے عرصۂ چرخ جسکی ایک شلنگ
چلے ہے یوں کج و اکج ادا و ناز کے ساتھ — کہ جیسے مست مئے ناز کوئی دلبر شنگ
وہ چلنے میں ہے تذرو اور اُڑنے میں شاہیں — اُچکنے میں ہے وہ آہو لپکنے میں ہے پلنگ
نہیں پری وہ۔ پری سے بھی ہے سوا پرّاں — نہیں وہ آدمی لیکن سب آدمی کے ڈھنگ
رواں ہو گر وہ سبک سیر آب دریا پر — تو سُم بھی تر نہ ہو اُس کا چہ جائے زانو و تنگ
جو چھیڑے اسکو تو میداں میں۔ اور کہیں اُسکے — بزیرِ نعل سُم آکر شرر فشاں ہو سنگ
شرارِ سنگ نظر سے نہاں نہونے پائے — ڈپٹ کے اور وہ پھر آئے سینکڑوں فرسنگ
اگر ہو مجھ کو شہا اُس کے خانۂ زیں میں — تمام عرصۂ گیتی کی سیر کا آہنگ
تو اس ارادہ کے آنے میں دل تلک ہو دیر — اور اسکے جاکے پھر آنے میں کچھ نہ ہووے درنگ

ہیں وہ نعلین خسروا ترے سر اورنگ گل — جن پہ کھاتا ہے چمن میں تختۂ اورنگ گل

کرے ہے مہر علیؑ دل کو صاف پُر انوار — طلوعِ شمس پہ موقوف ہے وجود نہار
علیؑ سے کیونکہ نہ ہو زیر لشکر کفار — علیؑ ہے شکل علیؑ اور علیؑ ہے حرف چار

مخمّس در مدح

خسروا چڑھ کے سر گنبد دوار ہلال
حاضر خدمت عالی ہے بہر کار ہلال
خود لب عجز سے کرتا ہے یہ اقرار ہلال
گرز بردار ہے خورشید کماندار ہلال
آسماں تیکے سپر چلتا ہے تلوار ہلال

دست ہمت ترا خورشید سے ہے بالاتر
آئیں تیرے در دولت پہ گدایانہ اگر
تری بخشش سے ہی نیساں عرق شرم میں تر
اپنے کاسہ میں بھرے چرخ وہیں لعل و گہر
اور کشتی میں بھرے درہم و دینار ہلال

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ
تیری دولت سے ہوں خورسند ترے دولتخواہ
عید ہر سال ہو فرخ تجھے با حشمت و جاہ
اور جو حاسد ہیں تیرے واسطے اُن کی ہر ماہ
چرخ پر تیز کرے خنجر خونخوار ہلال

قصیدۂ ناتمام در منقبت

لکھوں جو میں کوئی مضمون ظلم چرخ بریں
یہ حال ہے مرا ضعف دماغ سے کہ مجھے
زمانہ عربدہ پرداز و بخت بد ناساز
تو کربلا کی زمیں ہو مری غزل کی زمیں
صدائے صور قیامت ہے ہر مگس کی طنیں
ستارہ بر سر پر کاش و چرخ بر سر کیں
عجب نہیں ہے کہ راہب خط چلیپا سے
بناوے تیرے طویلہ کے واسطے خرزیں

رباعیات مدح

شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز
ہووے شرف اندوز ترے طالع سے
فرخ ہو سدا جہان میں جشن نوروز
ہر سال حمل میں مہر عالم افروز

خورشید سے یکروز جہاں میں نوروز
اور تجھ سے جہاں روز مسرت اندوز
ہے تجھ کو زمانہ میں شرف دوازدہ ماہ
اور ہے مہر جہانتاب کو یک ماہ یکروز

کہتا ہے یہ فیروزئے رنگ نوروز
تو ہو صف اعدا پہ مظفر فیروز
ہو دشمن سرکش کے لئے سہم الموت
اے شاہ عدو کش ترا تیر دل دوز

دعا ہے ذوق کی ہو خلعت ولیعہدی
مبارک آپ کو با آفتابی و کرسی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ
بحق سورۂ والشمس و آیۃ الکرسی

اشعار قصیدہ

آگے تیری طبع موزوں کے ہے اک فعل عبث
یہ جو کرتے ہیں عروضی فاعلاتن فاعلات
فیض سے تیرے نہ کیونکر اک جہاں سرسبز ہو
ذات ہے تیری تنہا چشمۂ آب حیات

اشعار قصیدۂ ہفتہ زبان

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن
جوش روئیدگی سبزہ پہ یاد آئی ہے
اَنبَتَہَا اللّٰہُ نَبَاتاً حَسَنًا
جس طرح شعلہ کا عالم ہو بہ فانوس خیال
خوف سے یوں ترے لرزاں ہے عدو زیر کفن

شاہا یہ عمر و دولت و اقبال و عزّ و جاہ
فرخ یہ تجھ کو سالگرہ ہو ہزار سال
بلکہ خدا کرے تری عمر اس قدر دراز
ہوں جس میں بے شمار گرہ بے شمار سال

کوہ اور آندھی میں ہیں گر آتش و آب و خاک و باد
چل نہ سکیں گے آج پر آتش و آب و خاک و باد
تاکہ یہ گبر اور ہنود طاق پرستا پوجن بارہ
چھوڑ دیں شرک پوجنا آتش و آب و خاک و باد

نثر موزون

حمد سے آغاز تھا شکر پر انجام ہے کہ فرض نے اپنا حق ادا کیا۔ اور عمروں کی آرزو آج پوری ہوئی۔ قلم کا مسافر زمین سے آسمان اور مکان سے لامکان تک بارہا چڑھتا اور اُترتا رہا۔ ۱۰ مہینے کے بعد قلمدان میں آکر دم لیا ہے اس میں اتنی طاقت کہاں تھی۔ پاک نیت کا زور تھا۔ اور صدق عقیدت نے پر پرواز لگائے کہ یہ رتبے پائے۔ استاد کے کلام شاگرد کے لئے حقیقی اور تحقیقی بھائی ہوتے ہیں۔ اب ان سے رخصت کا وقت ہے۔ ہاں برادران عزیز ایک حساب سے دو پشت۔ اور دلی سے نکل کر ۴۳ برس ہم تم ساتھ رہے۔ پریشانی اور سرگردانی حد سے گذری۔ مگر رفاقتوں میں فرق نہیں آیا۔ پیارے بھائیو اللہ نے تمہیں ہیئت مجموعی دی ہے آج تک میرے پاس امن و عافیت کے دامن میں سوئے۔ اب اکیلے نکلتے ہو۔ اور آزادی کے زور سے اٹھتے ہو۔ رواج کے پروں سے اڑو۔ عالم کی وسعت میں پھیلو۔ شہرت کے شہروں میں پھرو۔ وقت کی درازی میں عمر پاؤ۔ لو اللہ تمہارا نگہبان ہے۔ تم بھی مجھے خدا حافظ کہو۔ پیارے بھائیو دیکھنا۔ دیکھنا دنیا ایک مقام ہے بچ کر چلنا۔ دشمنوں کا شمار نہیں۔ اور دوست اللہ ہی اللہ ہے۔ یا اللہ بدنگاہوں سے بچائیو۔ اور بدی کے قلموں کو توڑ لو۔

بے بس آزاد۔ بیکس آزاد اس وقت ایک عالم میں بیٹھا ہے۔ کس کا دل ہو کہ اس کیفیت کو پائے۔ نیک استاد۔ پیارے اُستاد کے لکھے۔ پھٹے پرانے کاغذ پرزے سامنے پھیلے ہیں یہ لڑکپن سے لیکر جوانی اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں انہیں سامنے سے اٹھانا کیسے بھائیوں کو الوداع کہنا ہے۔ یہ درست ہے کہ گراں سنگ قرض تھا۔ اور گراں بہا فرض تھا۔ جس سے آج میں ہلکا ہوا۔ لیکن عمروں کا ساتھ ہے اور ۱۰ مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ موانست رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے۔ ہائے! دلگیر محنت تھی لیکن دلپذیر محنت تھی۔ سخت کام تھا۔ مگر مزے کا کام تھا۔ اور ثواب پر انجام تھا۔ کہ استاد کا کلام تھا۔ اب یہ کام کہاں آہ استاد کہاں استاد۔ خیر آزاد! بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں۔ کہ بہار نظر اور سماعت وغیرہ وغیرہ۔ ایک ایک کر کے انسان سے رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ تب وہ کیا کرتا ہے۔ صبر کرتا ہے۔ بس صبر کرو کہ یہ نعمت بھی رخصت ہوئی۔ اور نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ بندگی کا عالم بے چارگی کا ماتم ہے۔

خاتمہ تحریر اس دعا پر ہے کہ الٰہی تو جانتا ہے۔ آزاد نے جو کچھ کیا نیک نیت اور پاک عقیدت سے کیا ہے۔ اور تیرے حکم سے کیا ہے۔ اس خدمت کو قبول کر۔ کلام کو عمر دے۔ نام کو روشن کر اور آزاد کے حال پر رحم کر کہ تو ارحم الراحمین ہے۔

تمت بالخیر